نشاطِ فلسفہ
وِل ڈیورانٹ

قدرت نے مادہ اور ذہن کے درمیان خلیج کو عبور کیا۔
ذہن کے ارتقا میں اگلی منزل پودوں کے ان تاثرات میں نظر آئی ہے جو وہ مقام تعلق، حرارت، نمی اور روشنی سے حاصل کرتے ہیں۔ لیرکز سمجھتا ہے کہ ذہن کی بڑی طاقت اور خصوصیت، سیکھنے اور تجربہ کی مدد سے مختلف طریقوں سے عمل کرنے کی صلاحیت ایک ادنیٰ ذی حیات کی ممیز صفات ہیں۔ بوس ہی نے "برطانوی مجلس ترقی سائنس" کو یہ ثابت کر کے متاثر کیا کہ انسان اور پودوں کے دوران خون کے نظام بہت متشابہ ہیں' اور یہ کہ بہتا ہو رس، محرکات، مسکنات اور زہروں سے تاثر حاصل کرتا ہے۔ ایڈورڈ مینگل نے پودوں کے خلیوں میں مادۂ حیات کے مہین دھاگے دریافت کئے۔ جنہیں اکثر ماہرین نباتات حیوانوں کے عصبی دھاگوں کے مشابہ سمجھتے ہیں۔ کچھ پودے روشنی سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ وہ گلستانی گھڑیاں بن گئے ہیں۔ کیڑے کھانے والے پودوں کی پانچ سو اقسام ہیں جن میں سے کچھ کے پاس جیسا کہ ہمیں ڈارون نے بتایا ہے بہت حساس گومڑے ہیں' جو بہت معمولی دباؤ کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ ان مقاصد سے جو ذی حیات کے لئے مفید ہیں' سازگار اعمال کی یہ ابتدائی کوشش ہمیں ذہن کے آغاز کا پتہ دیتی ہے۔

حرکت کے ساتھ حساسیت بھی بڑھتی گئی۔ پودوں میں بے جان مادے کو غذا بنانے کی صلاحیت تو ہے مگر وہ حرکت نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی جڑوں کو زمین میں زور سے دبا سکتے ہیں یا اپنے بوٹوں کو آسمان کی طرف اچھال سکتے ہیں' لیکن انہوں نے اس سادہ زندگی کے لئے بہت سے بامقصد اعمال کی صلاحیتیں قربان کر دیں۔ وہ پودے جنہوں نے حرکت کی حیوان بن گئے اور انہوں نے اس عظیم الشان اور درد ناک نظام عصبی کی طرح ڈالی جو آج معرکہ خیزی اور ضبط کا آلہ بن گیا ہے۔ ادنیٰ حیوانوں میں کوئی نظام عصبی نہیں ہوتا۔ ان میں حساسیت عمومی ہوتی ہے اور بدن کے ہر رگ و ریشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ان ادنیٰ اقلیموں میں بھی تخصیص کار شروع ہوتی ہے۔ بعض ابتدائی حیوانات میں خارجی خلیے ایک خاص حساسیت رکھتے ہیں۔ لیکن اندرونی یا تجنیسی خلیے خارجی ماحول سے بے نیاز رہتے ہیں۔ ایک اور منزل اوپر آیئے اور حساسیت کی تخصیص کار بڑھ جاتی ہے۔ جیلی مچھلی میں کچھ عصبی خلیے بیرونی حصے میں پھیلے ہوتے ہیں۔ وہ چند عملی خلیوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہاں تخصیص کار نے عصبی خلیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہاں ہمیں نظام عصبی کی پہلی شہادت میسر آتی ہے جو کہ ذہن کا آلہ ہے۔

کسی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ جسم اور ذہن اگر وہ اتنے ہی مختلف ہیں تو

Scanned with CamScanner

جنسی آرزوؤں پر کڑی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس کا چہرہ اس کی گفتار کی طرح اس کے جذبات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس نے تقدیر پسند فلسفی اور محتاط تاجر کی طرح یہ نہیں سیکھا ہوتا کہ نفع و نقصان، لذت و الم میں چہرے کو کیسے بے کیف بنایا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں دوسروں کے خیالات اور احساسات کا اندازہ لگانے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ عورت کو دھوکا دینا زیادہ مشکل ہے۔

جیسا کہ گالٹن نے ہمیں بتایا تھا کہ بزم پسندی، کم ہمتی اور نقل کی صلاحیت کے ساتھ بدلتی ہے۔ عورت بالعموم پہلا اقدام مرد پر چھوڑتی ہے۔ اور اسی میں مرد کے غلبہ کا راز مضمر ہے۔ اور اگر آرزو کی تازہ شراب اسے سرمست نہ کر دے تو وہ برسوں تک اسے انتظار کی تلخ گھڑیاں گننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور وہ خود دولت جمع کرنے اور دوسری عورتوں کے ساتھ تجربہ کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ عورت کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کی جسمانی کمزوری اور اقتصادی احتیاج اس کے ذہن کو بوجھ کی طرح دبائے رکھتی ہے۔ اس کی جرات کے نشتر کو کند بنا دیتی ہے اور اسے بغاوت اور اولوالعزمی کے جذبات سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ رسم و رواج سے چمٹی رہتی ہے اور پارسائی کے ساتھ ماضی کی لکیر پیٹتی رہتی ہے۔ لباس، اطوار اور افکار کے تازہ فیشنوں کو اپناتی تو ہے لیکن سہم کر۔ وہ ہر نئے طرز فکر کو بغیر سوچے سمجھے مرد سے پہلے قبول کر لیتی ہے۔ ماہر تجزیہ نفس اس کی خوف زدہ روح کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔ ماہر روحانیات اسے روحوں کی تصویریں دکھا کر تسکین دیتا ہے اور اس کے لچکیلے واہمے سے کھیل کر دولت کماتا ہے۔

عورت مرد کی طرح اعتدال سے بہت زیادہ تجاوز نہیں کرتی۔ عورتوں میں سے بہت کم بے وقوف اور بہت کم فطین ہوتی ہیں۔ ایک مرد دوسرے مرد سے اتنا مماثل نہیں ہوتا جتنی کہ ایک عورت دوسری عورت سے۔ ایک بدلتے ہوئے ماحول مختلف اور متنوع پیشوں کے تقاضوں نے مردوں کی ہزاروں قسمیں بنا دی ہیں۔ لیکن گھر کے روائتی کام کاج، شوہر کے ساتھ شرکت حیات اور بچوں کی تربیت۔ یہ امور تقریباً تمام عورتوں کی زندگی سے متعلق ہیں اور انہیں ایک ہی سانچے میں ڈھالتے ہیں، ظاہر اگرچہ مختلف ہوتے ہیں، لیکن باطن ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ مرد نہایت سہولت سے اپنی توجہ ایک عورت سے ہٹا کر دوسری طرف منعطف کر دیتا ہے اسے محض ایک نیا نام سیکھنا ہے، کوئی نیا ہنر نہیں سیکھنا۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی پرانے خطوط بھی کام آ سکتے ہیں لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ ایک عورت جو محبت میں ناکام رہی ہو، اپنی ناکامی کو کبھی برداشت نہ کر سکے۔ اس نے اپنی

Scanned with CamScanner

اور جب تک وہ ڈھلوان کے قریب نہ پہنچتی اسے اپنے آپ کو دھکیلنا پڑتا۔ مختلف حبشی قبائل میں کچھ عورتیں یہی خصوصیت رکھتی ہیں۔ اور برٹن کہتا ہے کہ سومال قبیلے کے مردوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیتے ہیں اور جس کے کولہے سب سے زیادہ بھاری ہوں اسے اپنی بیوی بنا لیتے ہیں ایک حبشی کے لئے دبلے پتلے کولہوں سے زیادہ قابل نفرت چیز کوئی نہیں۔

حتیٰ کہ یورپ کے لوگوں میں بھی حسن کا معیار، مقام اور زمانے کے ساتھ رہا ہے۔ کبھی مضبوط اور فربہ ہونے کی رسم تھی۔ ریوبنز کی وسیع و عریض عورتوں، رمبراں کی فربہ لڑکیوں کو دیکھو حتیٰ کہ ریفیل کی عورتیں بھی جسمانی لحاظ سے فربہ ہیں۔ لیکن رینالڈز، گینزبرو اور رومنی کی حسینائیں جثہ میں بہت کم ہیں۔ اور وسلر کی عورتیں نازک اور لاغر ہیں ہمارے اپنے زمانہ میں نسائی حسن کا معیار فربہی سے نزاکت میں بدل گیا ہے۔ جسموں کے فیشن بھی لباسوں کے فیشن کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمالیاتی احساس میں ایک داخلی نسلی اور شخصی عنصر موجود ہے۔ فقط ایک عنصر معروضی ہے اور وہ یہ کہ تقریباً تمام دنیا کے صحت مند مرد ان عورتوں کو ترجیح دیتے ہیں جن کی ہیئت صحت مند ماتا کی ضامن ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر فطری وظیفہ کا کمال صحت مند ذوق کی تسکین کرتا ہے۔ پہلے عورت میں، بعد میں کسی اور چیز میں کوئی کام جو اچھے طریقہ پر نبھایا گیا ہو، کوئی زندگی جو اچھی طرح بسر کی گئی ہو، کوئی کنبہ جس کی اچھی طرح پرورش کی گئی ہو، کوئی اوزار جو اپنا کام بخوبی سرانجام دیتا ہو، ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ حسین ہے۔ اگر ہم بالکل صحیح الذہن ہوں تو ہمیں ایک تنومند عورت جو اپنے تندرست بچے کی پرورش کر رہی ہو دنیا کے تمام حسن کی معراج معلوم ہو۔ اس معاملہ میں زمانہ وسطیٰ اور زمانہ احیائے علوم اپنی "مریموں اور بچوں" کے ساتھ مذاق حسن میں ہم سے کہیں زیادہ بہتر اور صحیح تر تھے۔ ایک انحطاط پذیر فن کے ذریعہ گمراہ ہو کر ہم کمزور اور پتلی دبلی عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں جو بچے پیدا کرنا کم جانتی ہیں لیکن بھڑکی طرح کاٹنے میں مہارت رکھتی ہیں۔

اگر ہماری جبلتیں غازہ و گلگونہ سے فریب نہ کھائیں یا مال و دولت سے گمراہ نہ ہو جائیں تو ہمارا احساس حسن حیاتیاتی طور پر صحیح ہو گا اور محبت بہترین وراثت اور اولاد کی ضامن ہو گی۔ حسن پھر فطرت کے مقاصد کے مطابق صحت کا پھول اور مغنی بنے گا۔ اور کامل طور پر تندرست بچوں کا ضامن ہو گا۔ وہ ایک بار پھر نسل کو کمزور نہیں مستحکم بنائے

۶۔ اخلاقیات اور جمالیات ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گے اور ہم افلاطون کی طرح اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ "نیکی کا اصول حسن کے آئین میں تحلیل ہو جاتا ہے۔"

افلاطون اس معاملہ میں جھجکتا رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کس طرف جھکے درشت اتھینی حکمت کے سامنے یہ افرو ڈائٹ کی متبسم جاذبیت کے آگے۔ غالباً وہ جھجکنے میں عقل سے کام لے رہا تھا اور حسن جیسا کہ ہمارے ہاں موجود ہے ایک کامل ریاست کی بنیاد مشکل ہی سے بن سکتا ہے۔ لیکن اس حکمت سے کیا فائدہ جو ہمیں حسن سے محبت کرنا اور حسن فطرت سے بہتر حسن تخلیق کرنا نہ سکھائے۔ حکمت ایک وسیلہ ہے۔ جسم اور روح کا حسن ایک مقصد ہے۔ فن سائنس کے بغیر افلاس ہے۔ لیکن سائنس فن کے بغیر بربریت ہے حتیٰ کہ کبریائی فلسفہ بھی ایک وسیلہ ہے۔ لیکن جب ہم اس کی پرواز کو ایک بھرپور زندگی کی مربوط قدروں پر پھیلا دیں تو وہ مقصد بن جاتا ہے۔ کوئی فلسفہ جو حسن و جمال سے متاثر نہ ہو انسان کے قابل نہیں ہے۔

مصر کا کچھ نہیں رہا۔ سوائے ان پرشکوہ و جلال عمارتوں کے جو اس نے صحرا میں استوار کیں۔ یونان کا کچھ باقی نہیں سوائے اس کی حکمت و فن کے۔ زندہ حسن بہترین ہے۔ لیکن عمر اور وقت کے ساتھ وہ مرجھا جاتا ہے۔ صرف فن کار ہی ہنگامی حسن کو گرفت میں لا سکتا ہے اور اسے ایک غیر فانی ہیئت عطا کر سکتا ہے۔ ذرا گوئٹے کو سنئے :۔

تمام چیزیں فانی ہیں۔ پر اجلال فن ہی بقا سے آشنا ہو سکتا ہے۔

مرمر میں ڈھلا ہو سینہ ریاست کے فنا ہونے پر بھی زندہ رہتا ہے۔

اور پر ہیبت تمغہ، جسے کوئی مزدور زمین کی تہوں میں سے نکالتا ہے، شہنشاہ کی یاد کو محفوظ رکھتا ہے۔

دیوتا مر جائیں گے۔ لیکن ملکہ سخن لازوال ہے وہ موت سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔

حصہ ششم: فلسفہ تاریخ

باب چہاردہم

تاریخ کا مفہوم' ایک مکالمہ

مکالمہ کے افراد

اناطول فرانس
فرانسوامیری ایروائٹ ڈی والٹیئر
ژاک بینین بوسے
ہنری طامس بکل
طامس کارلائل
فریڈرک رٹزل
ویلم جیمز
گیبرئیل ٹارڈ
چارلس لوئی ڈی سیکنڈٹ بیرن ڈی مونٹسکو

فریڈرک نیطشے
جارج ولیم فریڈرک ہیگل
لسٹر وارڈ
کارل مارکس
جوزف ارتھر کونٹ ڈی گوبینو
میڈیسن گرانٹ
فلپ
ایرئیل
راوی

منظر: سرزمین ذہن میں ایک گلستان

Scanned with CamScanner

۱۔ پوماناک میں افتتاحیہ

ہم پوماناک کی ایک وادی میں سیر کر رہے تھے اور کروچے کے اس خیال پر جوش و خروش سے بحث کر رہے تھے کہ تاریخ صرف فلسفیوں کو لکھنی چاہیئے اور فلسفہ صرف مؤرخوں کو۔ گو ہمارے حواس ایک نمایاں احساس تشکر کے ساتھ زمین کی تازگی، گھنے درختوں کے ٹھنڈے سائے، جھیل کے درخشاں پانی، اور غروب آفتاب کی سنہری فضا سے لذت اندوز ہو رہے تھے، لیکن ہمارے خیالات ان کتابوں میں گم تھے جو گرما کی اس سہ پہر کو ہمارے زیر مطالعہ تھیں۔

ایریئل نے کہا۔ "مجھے بڑی مسرت ہے کہ اب ہم تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ میں تمہاری منطق، فلسفہ علم، اور مابعدالطبیعات سے تنگ آ چکا تھا۔ ان علوم نے مجھے کچھ نئے حقائق سکھانے کی بجائے مجھ سے میرے پہلے حقائق بھی چھین لیے۔"

اس پر فلپ نے کہا۔ "بہت سے حقائق کا علم بھی کوئی اچھی بات نہیں۔"

میں نے کہا۔ "شاید آپ کا خیال صحیح ہے۔ لیکن یہ بے کیف مضامین اگر ہمارے ذہن کی فلسفیانہ تربیت کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ بھی کر سکیں تو ان کی اہمیت مسلم ہے مرا مطلب ہے کہ یہ علوم ہمیں ایک وسیع "کل کو سمجھنے اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ایک کلی زاویہ نظر سے سمجھنے اور برتنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

ایریئل نے ایک عفو آمیز تبسم کے ساتھ کہا۔ "تمہیں کلی زاویہ نظر کی اصطلاح سے عشق ہو گیا ہے شاید؟ ہے نا؟"

"ہاں۔ میں تناظر کا پرستار اور ربط کا رسیا ہوں۔ میں اشیاء کو ان کی کلی یا مکمل صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

فلپ نے جوش سے کہا۔ "خوب اور یہی بات ہے جس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔ کسی دینیاتی تصور کو ثابت کرنا، یا کسی جماعت کے لائحہ عمل کی تعریف کرنا، یا کسی جذبہ حب الوطنی کی خود فریبی کی تبلیغ کرنا ان کا مقصد ہے۔ اپنے ملک ان میں اپنی جماعت یا اپنے شیوہ کو کل کے نقطہ نظر سے دیکھنے کی جرات نہیں۔ تمام تاریخ مرقومہ کا اسی فیصدی حصہ مصر کی تصویری تحریر کی مانند ہے اور اس کا مقصد اسقفوں اور بادشاہوں کے کارناموں کی مدح و ستائش کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

ایریئل نے پوچھا "ہمارا محبوب مؤرخ گبن بھی تو بادشاہوں کا بہت زیادہ ذکر کرتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ لیکن وہ مائیکل اینجیلو کی طرح وسیع خاکے بناتا ہے۔ اور باخ کی طرح موسیقی کی تخلیق کرتا ہے۔ میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ ذرا غور کرو کہ وڈرو ولسن نے تاریخ کی تعریف یوں کی تھی کہ یہ ماضی کی سیاست ہے۔ بس یہی ہماری بنیادی غلطی تھی۔ سیاست میں بھلا کونسی بات ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہو۔"

ایرئیل نے کہا۔ "چینی حکومت زیادہ دیانت دار تھی۔ دو ہزار چھ برس سے کچھ عرصہ قبل تک وہ مؤرخوں کو بادشاہوں کے محاسن اور فتوحات تحریر کرنے اور ان کے مصائب اور شکستوں کو بہتر رنگ میں ڈھالنے پر مامور کرتی رہی۔"

فلپ نے کہا۔ "وطن پرست محکمہ ہائے تعلیم کے لئے اس طرح کی تاریخیں بہترین تاریخیں ہوں گی۔ لیکن جدید یورپ کے مقابلہ میں قدیم چین کے حالات کچھ ایسے برے نہیں تھے۔ زمانہ وسطیٰ اور عہد احیائے علوم میں لوگوں نے دنیا کی تاریخیں لکھیں لیکن انیسویں صدی نے وطنیت کے تصور کی دریافت کی۔ اور تقریباً تمام مؤرخوں کے زاویہ نظر کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ ٹرائش کے اور فان سبل، مشلے اور مارٹن، میکالے اور گرین۔ بینکروفٹ اور فسک پہلے وطن پرست تھے اور بعد میں مؤرخ۔ وہ اپنے ملک کو خدا کی سرزمین سمجھتے تھے اور باقی ساری دنیا کو وحشیوں اور بدمعاشوں کی آماجگاہ۔ ان مصنفوں اور ان سیاست دانوں میں زیادہ فرق نہیں۔ جو دوسرے ممالک کے لوگوں کو حقارت آمیز ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ان مورخوں کی حیثیت سیاست دانوں کے اخباری نمائندوں یا بری اور بحری فوجوں کے رنگروٹ فراہم کرنے والے افسروں کی سی ہے۔"

ایرئیل نے پوچھا۔ "یہ بات کس نے کہی تھی کہ بین الاقوامی امن کی شاہراہ تنبغ تاریخ ہے نہ کہ معاہدے اور تجارت۔"

میں نے جواب دیا لیکن بیسویں صدی اس لحاظ سے انیسویں صدی سے زیادہ بہتر نہیں۔ مجھے آج کل کے مورخوں کا انداز پسند نہیں وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سب بڑے آدمی درحقیقت معمولی ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے متعلق اہم ترین باتیں یہ ہیں کہ وہ گالیاں بکتے، جھوٹ بولتے، شراب پیتے اور وسیع پیانہ پر محبت کرتے تھے۔ میں دل کی اس بات کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کہ وہ نپولین اور سیزر کو اپنی سطح پر لے آیا ہے۔ میں تو اپنے مسلک پر قائم ہوں اور وہ ہے عظیم شخصیتوں کی پرستش۔"

فلپ نے کہا۔ "مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ یہ سوانح بگاڑ جو عظیم شخصیتوں کی زندگی

کے تاریک پہلوؤں کو بے نقاب کرتے یا کسی ادبی شاہکار کی تہ میں جنسی الجھنوں کی کھوج کرتے ہیں، دراصل اسی طرح جانب داری سے کام لیتے ہیں، جس طرح ایک عام سوانح نگار کو ان میں سوائے پاکیزگی اور معصومیت کے اور کچھ نظر نہیں آتا، لیکن حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں دونوں طرح کے سوانح نگاروں کی ضرورت ہے، ان سے کہیں زیادہ بدمذاق ہیں وہ مستند مؤرخ جو اپنی ساری زندگیاں غیر اہم باتوں کو اہم ثابت کرنے میں بسر کر دیتے ہیں اور فلسفہ ان کے مقالوں کی طرح جو محض حکمت کی سند حاصل کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ بلند بانگ لیکن بے سود مضامین تحریر کرتے ہیں۔ انہیں ذرا کتب خانون میں گھومتے دیکھیے، وہ اپنے آپ کو غیر ضروری تفاصیل میں گم کر دیتے ہیں اور چیونٹیوں کے استقلال کے ساتھ حقائق کو محض حقائق کی خاطر، جمع کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ دستاویزوں اور اعداد و شمار میں مستغرق ہو کر انتہائی تن دہی اور عرق ریزی سے غیر اہم باتوں کی حقیقت ثابت کرتے ہیں۔ وہ جزو کو دیکھتے ہیں اور کل کو نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ ماضی کی اس کے سوا کوئی اہمیت نہیں کہ وہ زندہ لوگوں کے کردار اور مقاصد کو متاثر کر سکتا ہے اور تاریخ کی اس کے سوا کوئی اہمیت نہیں کہ وہ حال کی راہوں کو درخشاں اور مستقبل کو روشن بناتی ہے۔ یہ لوگ تاریخ کے اہل مدرسہ ہیں اور ان کی مثال فلسفہ علم کے ان ماہرین کی سی ہے۔ جن سے تمہیں سخت نفرت ہے' یہ ان ماہرین حیاتیات کی مانند ہیں، جو ایک کیڑے کو مار کے الکحل میں ڈال دیتے ہیں۔ وقتاً" فوقتاً" اس کے جسم کی چیر پھاڑ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم زندگی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یا وہ ان ماہرین نفسیات سے مشابہ ہیں۔ جو نفسیات کے معمل میں اعداد و شمار اور حساب کتاب کے ذریعہ انسانی کردار کے متعلق وہ باتیں ثابت کرتے ہیں۔ جو صدیوں سے ہر شخص کو معلوم ہیں۔"

اریئیل اس کا جوش و خروش دیکھ کر مسکرائی اور زور سے بولی۔ "مؤرخین' مردہ باد!"

میں نے کہا۔ "انہیں تھوڑے سے فلسفہ کی ضرورت ہے۔ جو انہیں کل' کا تصور بخش سکے۔"

اریئیل نے کہا:۔ "ہاں۔ میں تاریخ کو مربوط ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں' میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ قوانین کی تابع ہے یا نہیں یا اس میں ہمارے لئے کچھ سبق ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ ماضی، ہماری مستقبل کی جدوجہد میں مدد کر سکتا ہے کہ نہیں اور کیا ترقی محض ایک حسین فریب ہے؟ میں نپولین کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھول سکتی اور یہ اس کے آخری اقوال میں سے ایک تھا) "خدا کرے کہ میرا بیٹا تاریخ کا مطالعہ کرے کیونکہ تاریخ ہی صحیح فلسفہ

ہے" مجھے یقین ہے کہ اگر تاریخ ٹھیک طرح لکھی جائے تو ہم اس کی مدد سے انسان کی صحیح فطرت کے متعلق، نفسیات اور فلسفہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ میں انسانوں کی حقیقت سے اسی طرح واقف ہونا چاہتی ہوں۔ جیسے بڑے بڑے ارباب سیاست تھے۔ بغیر کسی فریب اور بغیر کسی مذمت کے۔"

میں نے کہا۔ "سبحان اللہ! کتنا حسین فقرہ ہے!"

فلپ نے کہا! "فلسفہ تاریخ" کی وہ عظمت اور عزت باقی نہیں رہی جو اسے پہلے حاصل تھی۔ اب اسے کس قدر تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جس طرح ہماری سیاست میں بسیط اور دور رس منصوبوں کا فقدان ہے، اسی طرح تاریخ میں گبن اور والٹیر کی سی فلسفیانہ گرفت بھی مفقود ہے۔ ربط کا اب رواج نہیں رہا"

میں نے اعتراض کیا، کہ ایک لحاظ سے اس رویہ سے ایک معقول احتیاط کا اظہار ہوتا ہے، فلسفیانہ تاریخ ہر نظام فکر کی طرح اسی مرض میں مبتلا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنا دے ہر خیال میں غلو سے کام لینا اور ہر واقعہ کو کلیہ کی شکل دے دینا اس کا اسلوب بن گیا ہے۔ وہ تمام ماضی کو کسی ایک تصور میں سمونے کی کوشش کرتی ہے۔"

لیکن فلپ انی بات پر قائم رہا۔ وہ کہنے لگا۔ لیکن فلسفہ کے بغیر، تاریخ محض واقعات کی فہرست بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ ماضی کے ساتھ محض شغف کی بناء پر تعلق قائم کرتی ہے۔ رہا فلسفہ تو وہ بھی تاریخ سے ربط پیدا کیے بغیر محض ایک ہوائی نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ انسان کی تخلیقی قوتوں سے اسے کوئی تعلق نہیں رہتا، فلپ نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا۔ "تاریخ وہ بنیاد ہے، جس پر فلسفہ کی تعمیر استوار ہوتی ہے اور اس بنیاد پر فلسفہ تمام علم کو یکجا کرتا ہے، تاکہ انسانی زندگی بہتر اور روشن تر بن سکے۔"

"مرحبا! فلپ مرحبا!" ایریئل نے کہا

ستارہ شام طلوع ہو گیا اور چاند نے ایک تابناک خنجر کی طرح آسمان میں شگاف کر دیا۔ ہم ایک چھوٹی پہاڑی پر چڑھے اور کچھ عرصہ کے لئے مبہوت کھڑے رہے ہم نے کبھی چاند کو اتنا سفید اور آسمان کو اتنا نیلا نہیں دیکھا تھا" ہمیں اپنے بہت قریب دبی دبی آوازوں کا احساس ہوا، جھٹپٹے میں غور سے دیکھنے پر ہمیں ایک حسین اور وسیع گلستان نظر آیا۔ اس میں ایک ندی گنگناتی ہوئی بہہ رہی تھی، گھاس پر اور ایک مرمریں چشمہ کے گرد دیہاتی کرسیوں پر چند عظیم انسان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پچھلے زمانوں کے لباس میں ملبوس تھے لیکن ان میں سے چند چہرے اس قدر آشنا اور مانوس معلوم ہوتے تھے، جیسے ہم انہیں ہمیشہ سے

جانتے ہوں۔

اریئل نے سرگوشی کے انداز میں کہا! "وہ یقیناً ہمارا محبوب والٹیئر ہے"

فلپ نے خوش ہو کر کہا! "یقیناً!"

میں نے کہا! "اور وہ اس کا پوتا' اناطوال فرانس ہے' اس کا قد میرے اندازہ سے کچھ چھوٹا ہے' لیکن کیا چہرہ پایا ہے اس نے! زمانہ کی آدھی حکمت اور ساری رحمت اس کی آنکھوں میں بسی ہوئی ہے۔"

ہم نے ہر شخص کے چہرہ کو غور سے دیکھا۔ اور ان میں سے بہت سوں کو پہچان لیا۔ انہیں میں ایک لحیم شحیم پادری بھی تھا۔ وہ پادیوں کے مخصوص لبادے میں ملبوس' گود میں ہاتھ رکھے' تفکر میں مستغرق بیٹھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ بوسے ہے۔ جو لوئی چہاردہم کا درباری مواعظ تھا' والٹیئر کے قریب' ایک فرانسیسی رئیس بیٹھا تھا۔ جس نے زمانہ وسطیٰ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ مونیٹن ہے پھر ایک اور چالیس برس کا' اعصاب زدہ' ناتواں شخص نظر آیا جو اپنے خیالات میں مستغرق بیٹھا تھا۔ اس کی صورت مورخ تہذیب بکل کی ان تصویروں سے مشابہ تھی جو اکثر میری نظر سے گزری تھیں۔

فلپ نے متعجب ہو کر کہا: "اور وہ ہے میرا اساتذ' لسٹروارڈ!" ایک بدصورت اور حد درجہ سنجیدہ جرمن کو دیکھ کر مجھے ہیگل کا شبہ ہوا اس کے قریب ہی خوفناک مونچھوں اور زم آنکھوں والا نیطشے بیٹھا تھا' ایک گوشہ میں' طامس کارلائل بیٹھا نظر آیا' اداس اور تنہا۔ کوہسار کی طرح عظیم' جس کی بھویں چٹانوں کی مانند تھیں اور آنکھیں اس جنگجو سپاہی کی طرح' جو بالاخر گرفتار اور بے بس ہو گیا ہو۔ چشمہ کے قریب ایک لمبا اور حسین شخص کھڑا تھا۔ میں پہچان گیا کہ یہ ولیم جیمز ہے جو ایک امریکہ کی طرح پرہیجان اور ایک فرانسیسی کی طرح زندہ دل ہے۔ اس کے مقابل' کوتہ قد' سیاہ اور متین' کارل مارکس تھا' اور پرزور بحث کے دوران میں ان کی داڑھیاں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئی تھیں۔ جرمنی کا ایک قدآور عالم' امریکہ کا ایک وکیل نما شخص' ایک فرانسیسی مجسٹریٹ اور ایک فرانسیسی امیر بھی جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا وہاں موجود تھے۔ اناطول فرانس ایک پادری کے لہجہ میں اور موسیو برجرٹ کی زندہ دلی کے ساتھ کچھ کہہ رہا تھا۔ تاریکی ہر طرف پھیل گئی تھی اور ہم' سب کی نظروں سے بچ کر گھاس پر ایسی جگہ بیٹھ گئے' جہاں سے ہم سب کی باتیں سن سکتے تھے۔

Scanned with CamScanner

۲۔ تاریخ کی مذہبی تاویل

اناطول فرانس، پیارے آرویٹ،
قوموں کے اخلاق اور کردار اور شارلیمین سے لے کر لوئی سیزدہم تک کی تاریخ کے اہم واقعات پر تمہارا مقالہ تمہاری عظیم ترین تصنیف ہے، یہ عنوان تمہارے اس عظیم کارنامہ کے شایان شان ہے۔ تم نے تاریخ نگاری میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔"

والٹیئر۔ نہیں اس معاملے میں اولیت کا شرف مجھے حاصل نہیں، مجھ سے .شب بوسے نے "عالم گیر تاریخ" لکھ کر میرے لئے زمین اس سے پہلے ہموار کر دی تھی تاریخ فقط واقعات کی فہرست ہوتی تھی، کیا ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ .شب بوسے ہمیں لوئی چہاردہم کا درباری تصور کر کے ہمیں یہ شرف بخشیں گے کہ تاریخ کے موضوع پر ایک مختصر سا وعظ فرمائیں۔

بوسے۔ حضرات، آپ میں سے اکثر متشکک ہیں، اور مجھے یہ اندیشہ ہے، کہ آپ ایک ایسے بوڑھے پر ہنسیں گے جو خدا پر ایمان رکھتا ہو اور تاریخ کو مشیت ایزدی کا مظہر جانتا ہو۔ میں شہزادہ کو تاریخ کا مطلب سمجھانا چاہتا تھا، اس لئے میں نے اس کے لئے، ایک کتاب لکھی۔ جو سب قوموں اور زمانوں کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہو، جو دنیا کے نقشہ کی۔ براعظموں، سمندروں اور ملکوں کے معاملہ میں ہے۔ میں نے ہر جزو کا مفہوم اس رشتے کو پیش نظر رکھ کر سمجھانے کی کوشش تھی جو اسے کل سے وابستہ کرتا ہے۔

اناطول فرانس۔ "یہ ایک نہایت بلند مقصد تھا، اگر پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا تو اس کی حیثیت ایک مکمل فلسفہ کی ہوتی۔۔"

بوسے۔ "میرے نزدیک تاریخ مشیت ایزدی کی تمثیل ہے۔ جس میں ہر واقعہ ایک سبق ہے جسے خدا بندے کے لئے ظہور میں لاتا ہے۔ میں لوئی پانزدہم کو تنبیہہ کرتا رہتا تھا کہ، خدا، کی طرف سے انقلابوں کا ظہور بادشاہوں کو انکسار کی تعلیم دینے کے لئے ہوتا ہے۔"

اناطول فرانس۔ "محترم اسقف گستاخی معاف! لیکن آپ کی بات سن کر مجھے برناڈین سنٹ پیرے کی وہ بات یاد آتی ہے جو اس نے خربوزہ کے متعلق کہی تھی کہ ظاہر طور پر اس لئے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے کہ وہ کنبہ کے لوگوں میں کھائے جانے کے لئے بنایا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا شاگرد شہزادہ نہایت ناکارہ اور بدمعاش ثابت ہوا' اس کی بہت سی داستانیں تھیں وہ غریبوں سے بہت ظالمانہ سلوک کرتا تھا' تاہم اس نے خاصی لمبی عمر پائی۔ اس کے برخلاف اس کا جانشین' لوئی' شش دہم ایک منکسرالمزاج نیک اور پرہیز گار حکمران تھا' اس نے اپنے ملک کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور تشدد اور افلاس کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ۱۷۹۲ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔"

بوسے۔ مشیت ایزدی ہمارے فہم و ادراک سے ماورا ہے لیکن ہمیں خدا پر ایمان رکھنا چاہئے۔"

اناطول فرانس۔ "میرے نزدیک آپ کی کتاب میں سب سے زیادہ قابل تعریف حصہ وہ ہے۔ جہاں آپ نے بہت سے لاینحل مسائل کی بڑی خود اعتمادی سے وضاحت کی ہے' مثلاً' حوا کی تولید اور خدا کے برگزیدہ لوگوں کے مصائب' مجھے افسوس ہے کہ دنیا علم اور یقین سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے اور وہ امور جو کبھی بالکل واضح تھے آج انہیں سمجھنا دشوار ہو گیا ہے' ہمیں پہلا سا علم پھر کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔"

بکل۔ "میں اسقف کی تاریخ دانی کا قائل ہوں' ان کی کتاب میں ہابیل کے قتل' طوفان نوح اور ابراہیم کی پیغمبری کی تاریخیں دی ہوئی ہیں۔ مجھے اپنے کتب خانہ میں ان تاریخوں کی تصدیق نہیں مل سکی۔"

بوسے' "یہ بات تو بہت سیدھی ہے میرے بیٹے! میں مقدس کتابوں کو الہامی کتابیں سمجھتا ہوں' ایمان کے بغیر علم ناممکن ہے۔"

کارلائل۔ "جناب! آپ نے جو کچھ فرمایا یہ ممکن ہے' عین ممکن ہے۔"

اناطول فرانس۔ "پھر بھی' حضور انور' آپ نے ہم پر ایک بڑا احسان کیا ہے' آپ نے تاریخ کو مشیت ایزدی میں تحلیل کیا' لیکن آپ نے اپنے ناخلف شاگرد کو یہ بھی تعلیم دی کہ مشیت ایزدی اکثر و بیشتر' ثانوی اور قدرتی اسباب و عمل کے ذریعہ کام کرتی ہے۔ اور آپ نے یہ بھی کہا کہ مؤرخ کو وہ ثانوی اسباب تلاش کرنے چاہئیں' جو تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال کا باعث بنتے ہیں' آپ نے فلسفیانہ تاریخ کے مسئلہ کی وضاحت کر کے بڑا کام کر دکھایا' آپ ہی کے سمجھائے ہوئے راستہ پر چل کر والٹیر' آپ کا دشمن بنا۔"

والٹیر۔ "آپ پھر میری تعریف میں مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ ہم ویکو کی خدمات کو فراموش کر رہے ہیں' مجھے افسوس ہے کہ میں جوانی میں اطالیہ نہ جا سکا۔ کہ اس عالم سے تبادلہ خیال کر سکتا' موسیو بکل ہمیں شاید اس سلسلے میں کچھ بتا سکیں۔"

Scanned with CamScanner

بکل۔ "اس کی جگہ زمانے اور نظریوں دونوں کے لحاظ سے ۔شب بوسے اور آپ کے درمیان ہے۔ وہ مشیت ایزدی پر ایمان رکھتا تھا' لیکن تبلیغ کے مقدس محکمہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد اس نے اپنی نئی سائنس کی تعمیر سراسر ارضی بنیادوں پر استوار کی۔ اس نے سوال کیا کہ دوسرے مضامین کی طرح تاریخ کی سائنس کیوں نہیں ہے؟" اس نے کہا۔ کہ جس طرح نیوٹن کے قوانین' قدرت کے عجائب کی توضیح کرتے ہیں اسی طرح قوموں کے بظاہر بے سبب عروج و زوال میں بھی شاید کچھ قوانین مضمر ہوں۔

اناطول فرانس۔ "بے چارہ نیوٹن ! میں اسے آئن سٹائن سے متعارف کراؤں گا۔ لیکن آپ اپنا سلسلہ کلام جاری رکھئے۔"

بکل۔ "ویکو کے نزدیک تاریخ' چند قوانین کی تابع ہے' ہر تہذیب' تین منزلوں میں سے گزرتی ہے۔"

ہیگل۔ "تین منزلوں میں سے بہت ہوشیار تھا وہ کہ اس نے میرے فلسفہ کے متعلق پیش بینی سے کام لیا۔"

بکل۔ "پہلی منزل وحشت کی تھی۔ جس میں فکر کا گزر نہیں تھا۔ فقط جذبات تھے دوسری منزل بربریت کی تھی' جس میں تخیلی علم نے ہومر اور ڈانٹے اور اولوالعزم لوگوں کے عہد تخلیق کیے' تیسری منزل تہذیب کی ہے جس میں خرد' سائنس' قانون اور ریاست کو جنم دیتی ہے' ویکو کا یہ خیال تھا کہ رومی سلطنت نے عظیم ترین تہذیب تخلیق کی تھی' جس طرح بربریوں نے اپنی ان گنت تعداد اور وحشیانہ قوت سے اس تہذیب کی ناتواں حساسیت اور محدود تعداد کو ختم کر دیا' اسی طرح' مستقبل میں وحشی اقوام ہر تہذیب کو فنا کر دیں گی' سیاست میں بھی اسے یہی ترتیب نظر آئی' بربریت سرداروں کو وجود میں لاتی ہے جو بعد میں رئیس طبقہ کی صورت میں منظم ہو جاتے ہیں' رئیسانہ ستم اور علیحدگی انقلاب پیدا کرتی ہے اور پھر جمہوریت جنم لیتی ہے۔ اور جمہوریت کے انتشار کی بدولت بربریت واپس آ جاتی ہے۔"

اناطول فرانس۔ "سب فلسفی اداس رہتے ہیں' میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ فکر انسان کی سب سے بڑی بد نصیبی ہے' قدیم زمانہ کے لوگوں نے مستقبل کو دیکھنے والی نظر کو ہمیشہ ایک خطرناک صلاحیت سمجھا ہے' آپ نے بھی۔ موسیلو والٹیئر ! اپنی عظیم تاریخ کے آخر میں کوئی خوش آئند نتائج اخذ نہیں کیے۔"

والٹیئر۔ "میں ایک وحشی عہد کا ذکر کر رہا تھا' میں ان انقلابات میں سے گزر رہا تھا'

جو شار لیمین کے زمانہ سے رونما ہو رہے تھے' ان سب کا انجام کیا ہوا؟ تباہی اور ہزاروں زندگیوں کا خاتمہ۔ ہر عظیم واقعہ ایک عظیم تباہی تھا۔ ممکن ہے' کہ یہ غلطی میرے ماخذ کی پیدا کی ہوئی ہو' جس میں امن اور سکون کے زمانوں کا کوئی ذکر نہیں۔ انہوں نے صرف تباہیوں اور بربادیوں کی داستانیں بیان کی ہیں' اس لئے میرے نزدیک بھی تاریخ جرائم اور مصائب کا ایک مرقع ہے۔ بے بنیاد اوہام' غیر معقول خصائل اور وحشیانہ قوت کی جلوہ گری۔ یہ ہیں وہ طاقتیں جو تاریخ کے پس پردہ کام کرتی ہیں' مجھے بہت کم تاریخ میں یہ بات نظر آئی ہے کہ واقعات کی تشکیل میں عقل انسانی نے کوئی حصہ لیا ہو اس کے برعکس' حقیر ترین اور ذلیل ترین اسباب نے عظیم اور الم ناک نتائج پیدا کئے ہیں' میں نے تو یہی اندازہ لگایا' کہ مشیت حوادث کا دوسرا نام ہے۔"

بکل۔ "آپ کا شاگرد ٹرگو اس قدر یاس آفرینی سے کام نہیں لیتا تھا' آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۷۵۰ء میں اس نے سوربون میں لیکچر دیئے تھے جن میں اس نے تہذیب کی تاریخ بیان کی تھی' اور اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ انسانی ذہن ضرور ترقی کرے گا۔"

والٹیئر۔ آپ نے میرے شاگرد کی تعریف کی' مجھے اس سے مسرت ہوئی' جب بادشاہ نے اسے وزارت خزانہ کے عہدے سے معزول کیا' تو مجھے بڑا دکھ ہوا' مجھے اس وقت سخت مایوسی ہوئی تھی۔ ترقی کا تصور میرے زمانہ میں بھی مقبول تھا۔ یہ تصور میرے دوست' موسیو کونڈورسے کو بہت عزیز تھا۔ عین اس وقت' جبکہ فرانسیسی تہذیب تباہ کی جا رہی تھی' لیکن ٹرگو ٹھیک کہتا تھا۔ تاریخ اسی وقت قابل برداشت ہوتی ہے' جب وہ تہذیبوں کے عروج و زوال کو بیان کرے۔ تاریخ صرف فلسفیوں کو لکھنی چاہئے۔ وہ اپنے مواد میں اہم اور غیر اہم کی تمیز کر سکتے ہیں۔ وہ غیر ضروری تفاصیل سے گریز کر سکتے ہیں اور وہ چیزوں کو ایک وسیع اور بسیط زاویہ سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ذہنی جلا کی ترقی' مادی' خوش حالی' اور اخلاقی بلندی ---- کسی قوم کی تاریخ میں ان چیزوں کی حیثیت محض چند پہلوؤں کی نہیں' بلکہ حقیقت میں یہی چیزیں قوم کی تاریخ ہیں' باقی سب چیزیں فروعات ہیں' ان کی اہمیت اس بات سے متعین ہوتی ہے' کہ وہ اقتصادی' ذہنی اور اخلاقی ترقی پر کیا روشنی ڈال سکتی ہیں' اس لئے میں نے اپنی کتاب ESSAI SUR LES MA URS اس مقصد سے لکھی کہ انسانی ذہن کی تاریخ بیان کروں۔ میں ان مراحل کو متعین کرنا چاہتا تھا' جن سے گزر کر انسان بربریت سے تہذیب کی منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔"

اناطول فرانس۔ حضور' آپ نے عینی تاریخ کے تصور کو خوب بیان کیا ہے' میں اس

Scanned with CamScanner

نسل کی تخلیقی قوتوں پر حیرت زدہ ہوں۔ جس نے آپ کی تصانیف، موسیو مونٹسکو کی "روح قانون" اور موسیو گبن کی ضخیم تاریخ تخلیق کی، آپ سب نے مل کر تاریخ کو مذہبیات کی زنجیروں سے آزاد کیا، اور اسے فلسفہ اور سائنس کے سپرد کیا، جب میں مابعدالطبیعاتی بندوں کی موجودہ نسل کے متعلق غور کرتا ہوں کہ وہ حکمت کی چار منزلیں طے کر آئی ہے اور جب میں سقراط کے عہد، ہوریس کے عہد، ریبیلز کے عہد، اور آپ کے عہد کا (جسے آپ کے نام سے ہی یاد کرنا چاہئے) کا تصور کرتا ہوں، تو تاریخ کی جنگیں اور اس کے جرائم، اس کے مصائب اور اس کی ناانصافیاں اس قدر مہیب معلوم نہیں ہوتیں۔ انسانی تاریخ کا جواز اس کی عظیم شخصیتوں کا وجود ہے،

۳۔ تاریخ کی جغرافیائی تعبیر

بکل۔ "مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے موسیو مونٹسکو کا ذکر کیا۔ کیونکہ اب تک ہم نے تاریخ کے متعلق جتنی گفتگو کی وہ اس کے اسلوب کے متعلق تھی ہم نے ان اسباب کا ذکر نہیں کیا، جو قوموں کی عظمت اور ذلت کا باعث بنتے ہیں۔ تاریخ کے مرکز کو آسمان سے زمین، بادشاہوں سے انسانیت اور جنگوں سے تہذیب تک، منتقل کرنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ کے فیصلہ کن اسباب کیا ہیں؟ کیا، جیسا کہ ابھی آپ نے اشارہ کیا تھا، عظیم شخصیتوں کی عظمت ہی اس کا فیصلہ کن سبب ہے؟ یا اس کے علاوہ کچھ اور مثلاً علم کی طاقت، سائنس دانوں کی اختراعیں اور ایجادیں، اچھی نسلوں کا لہو، اقتصادی پیداوار اور تقسیم کا نظام، آب و ہوا اور زمین اور جغرافیائی حالات کی خصوصیات؟ موسیو مونٹسکو کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قوموں کی عظمت اور ذلت کے مخصوص اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔"

مونٹسکو۔ "آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ میرا ذکر کر رہے ہیں، مسٹر بکل، اپنے ہم وطنوں سے زیادہ آپ کے ہم وطنوں نے مجھے یاد رکھا ہے، حتیٰ کہ موسیلو والٹیئر بھی جو یوں بے حد وسیع النظر اور فیاض ہیں، میری کتابوں کو خاطر میں نہ لائے۔"

والٹیئر:۔ "میں آج تک آپ کی دو مشہور تصانیف کی عظمت اور ذکاوت کی وجہ سے آپ کو معاف نہیں کر سکا۔"

(ان دو کتابوں کے نام ہیں: LETHES PERSANESERS اور LESPRIT DESLOIS

مونٹسکو۔ "میں جانتا ہوں عظیم شخصیتیں، ایک دوسرے کے ساتھ معمولی آدمیوں کا سا سلوک روا رکھتی ہیں میرے ہم عصروں نے میری پہلی دو کتابوں، یعنی "ایرانی مکاتیب" اور "رومہ کے عروج و زوال" کے اسباب کے متعلق یہ کہا کہ یہ اصل میں "مونٹسکو کا عروج اور زوال" کی داستانیں ہیں، انہیں فلسفہ سے زیادہ بذلہ سنجی مرغوب تھی، میں نے فونٹینیل، ہیلوٹیس اور دوسرے علم دوست احباب کو لابریڈ۔ (جہاں میں رہتا تھا) بلایا کہ میری کتاب "روح قانون" کے چند ابواب سنیں جن پر میں نے بیس برس محنت کی تھی، کتاب سننے کے بعد سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ میں یہ کتاب شائع نہ کروں، قصہ مختصر، میں انگلستان میں بہت مقبول رہا ہوں۔"

بکل۔ "میں "روح قانون" کو اٹھارویں صدی کے فرانسیسی ادب کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں، آپ پہلے شخص تھے، جنھوں نے یہ بتایا، کہ تاریخ میں شخصیتوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں اور یہ کہ منفرد واقعات (حتیٰ کہ عظیم جنگیں بھی) کسی قوم کے عروج و زوال کا سبب نہیں بن سکتے، آپ نے ہمیں یہ سکھایا کہ عظیم شخصیتیں اور عظیم واقعات وسیع اور مستقل قوتوں کے علائم اور نتائج ہیں۔

ان میں سے بعض قوتیں غیر شخصی ہوتی ہیں، مثلاً ملک کی ہیئت یا ہوا کی حرارت۔

مونٹسکو۔ "بقراط نے چار سو قبل مسیح میں ایک کتاب۔ "ہوا، پانی اور جگہ" لکھی تھی، جس میں اس نے بتایا تھا کہ جغرافیائی ماحول کا لوگوں کی جسمانی ساخت اور ریاستوں کے آئینی نظام پر کیا اثر ہو سکتا ہے، ارسطو نے یونانیوں کی کامرانی، حتیٰ کہ ان کی ذہنی برتری کو یونان کی "متوسط" آب و ہوا سے منسوب کیا تھا۔ اگرچہ ہم ایتھنز کے درجہ حرارت کو متوسط ہرگز نہیں کہہ سکتے۔"

اناطول فرانس۔ "اس میدان میں آپ کا ایک اور پیشرو بوڈین تھا، جس نے سولہویں صدی میں جغرافیائی حالات اور انسانی اخلاق و اطوار، اس کی ہمت اور ذہانت کے باہمی ربط اور تعلق کی وضاحت کی تھی۔ اس کے نزدیک عرض البلاد کا فرق باکرہ عورتوں میں فرق پیدا کر دیتا ہے،

مونٹسکو۔ یہ سمجھنا غلط ہے، کہ میں نے تاریخ کو جغرافیہ میں تحلیل کر دیا تھا، مختلف قوموں کے لئے "مختلف اسباب فیصلہ کن ثابت ہوئے ہیں، بعض کے لئے قوانین بعض کے لئے، مذہب، بعض کے لئے رسوم اور اخلاق، اور بعض کے لئے طبعی حالات اور آب و ہوا۔ ان میں سے آخری سبب یعنی طبعی حالات اور آب و ہوا فقط وحشیوں کے لئے فیصلہ

کن ثابت ہوتے ہیں۔ چینیوں پر رسوم حاوی تھیں۔ جاپانیوں پر قوانین، سپارٹا پر اخلاق، اور حکومت کے اصول اور اطوار کی قدیم سادگی کئی نسلوں تک رومنوں کا کردار متعین کرتی رہی۔"

بکل۔ "لیکن میرے نزدیک آپ کی کتاب کا سب سے دل چسپ حصہ وہ تھا، جہاں آپ نے آب و ہوا اور تاریخ کے تعلق سے بحث کی ہے۔"

مونٹسکو۔ "میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے بھی اس مضمون سے دلچسپی تھی۔ میرا خیال ہے۔ کہ کردار اور مزاج کے اختلاف جو تقدیر اقوام پر خاص حد تک اثر انداز ہوتے ہیں، آب و ہوا سے بھی متاثر ہوتے ہیں، سرد علاقوں میں لوگ اکثر و بیشتر توانا ہوتے ہیں لیکن گرم علاقوں میں تن آسان۔ یہ ایک معمولی سی بات ہے، لیکن اس کے نتائج کتنے اہم ہیں، ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ سکون اور عدم وجود تمام چیزوں کی اساس ہیں، اور تمام چیزوں کا عینی منتہا، اس لئے وہ بے عملی کو تمام کوائف سے بہتر اور تمام امیدوں کا مرکز و منبع سمجھتے ہیں، بے عملی ہان کے لئے بلند ترین خوبی اور جنت کی زندگی کا نچوڑ ہے، اس کے برعکس، گرمی، دوزخ کا ایک بنیادی عنصر ہے، اس قدیم خیال کی وجہ سے بے عملی اعلیٰ مرتبہ کی علامت بن گئی ہے اور جو لوگ کام نہیں کرتے اپنے آپ کو کام کرنے والوں کے آقا سمجھتے ہیں۔ بہت سی جگہوں پر رواج ہے کہ لوگ اپنے ناخون نہیں کاٹتے، تاکہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ کام نہیں کرتے۔

اناطوال فرانس۔ فرانس میں اونچی ایڑی کے جوتوں کے رواج کا بھی یہی مطلب تھا، لیکن خودپسندی کی استقامت نے اب اس رواج کو عالمگیر بنا دیا ہے۔

مونٹسکو۔ یہ کیا بات ہے کہ قبائل سے شکست کھانا جنوب کے باشندوں کا مقسوم بن گیا ہے؟ شاید اس لئے کہ شمال کی آب و ہوا میں انسان توانا ہوتا ہے اور جنوب کی آب و ہوا اسے کمزور اور ناتواں بناتی ہے۔ جنوب نے ہمیشہ دنیا کو غلام دیے ہیں اور شمال نے آقا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایشیا گیارہ مرتبہ شمال کے وحشیوں سے شکست کھا چکا ہے۔

والٹیئر۔ جناب آپ کو شاید علم ہو کہ انگریزی کا لفظ سلیو (جس کے معنی ہیں غلام) لفظ سلاو سے نکلا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب ہمارے کلیسا نے عیسائیوں کو غلام بنانے کی ممانعت کر دی تھی، سلوو لوگ اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، اس لئے انہیں آسانی سے بیچا جا سکتا تھا۔ اس طرح یہ لفظ، جس کا مفہوم کبھی شان و شکوہ تھا، غلامی کی علامت بن گیا۔ یہ شمالی غلام آپ کے کلیہ میں استثنیٰ کا حکم رکھتے ہیں، لیکن یہ کوئی

Scanned with CamScanner

اہم اشتقی نہیں۔

موٹسکو۔ اس اصلاح کا شکریہ! میرا خیال ہے مسٹر بکل! کہ آپ نے بھی آب و ہوا اور تاریخ کے تعلق کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔

بکل۔ نہیں جناب! میں اس موضوع پر کچھ زیادہ کام نہیں کر سکا۔ جب میں پیدا ہوا تو تقریباً نیم مردہ تھا میں بچپن بھر بیحد کمزور رہا اور اس لئے دوسروں لڑکوں کے ساتھ کھیل نہیں سکا اپنی چالیس برس کی عمر میں شاید ایک دن بھی میں درد اور بیماریوں سے نجات نہیں حاصل کر سکا، میری آنکھیں خراب تھیں، اس لئے میری ماں نے زمانہ کے مذاق سے بے نیاز ہو کر مجھے پڑھانے کی بجائے بننا سکھا دیا، یہاں تک کہ آٹھ برس کی عمر تک میں نے حروف ابجد بھی نہیں سیکھے تھے۔

کارلائل۔ بس رہنے دیجے۔ ہر شخص جانتا ہے، کہ چالیس برس کی عمر میں آپ انگلستان کے فاضل ترین انسان تھے، مجھے پکسلے نے بتایا تھا کہ آپ اپنا سر علم کے بوجھ سے سیدھا نہیں کر سکتے تھے، آپ فرانسیسی، جرمن، ڈینش، اطالوی، ہسپانوی، پرتگالی، ولندیزی، والون، فلیموی، سویڈی، آئیس لینڈی فریزک، موری، روسی عبرانی، لاطینی اور یونانی زبانیں جانتے تھے، آپ انگریزی لکھ سکتے تھے۔ میں نے ایک موقع پر ڈارون کو یہ کہتے سنا ہے کہ آپ کا جیسا عمدہ اسلوب نگارش انہوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے اسلوب نگارش کے متعلق زیادہ نہیں معلوم لیکن مجھے آپ کے تشریحی حاشئے بہت پسند آئے۔

بکل۔ میری یہ آرزو تھی کہ میں انگلستان کی تہذیب کی مکمل تاریخ لکھوں، لیکن بیس برس کی محنت کے بعد میں فقط "تمہید" لکھ سکا، جو چار جلدوں میں پوری ہوئی۔ پھر میری ماں کا انتقال ہو گیا اور میں اس سے آگے نہ لکھ سکا۔ اگر میری صحت اچھی ہوئی تو ممکن ہے کہ میں کوئی قابل ذکر کام کر سکتا۔

موٹسکو۔ کیا آپ از راہ کرم ہمیں اپنے مطالعہ کے نتائج بتائیں گے؟

بکل۔ آپ جانتے ہوں گے کہ بلجیم کے ماہر اقتصادیات کیٹویلیٹ نے شادی جیسے ارادی افعال اور پتہ لکھے بغیر ڈاک میں خط ڈال دینے کے بظاہر معمولی واقعات کو اعداد و شمار کی ایک باقاعدہ اور مرتب شکل دی تھی۔ ان بظاہر معمولی واقعات اور ان سے ملتی جلتی معمولی باتوں کی بنیاد پر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب ہم انسان کے کردار پر اس کی تفصیلات کے ساتھ غور کرتے ہیں تو وہ آزاد معلوم ہوتا ہے لیکن جب اس پر اجتماعی نقطہ

نظر سے غور کیا جائے تو اس کی اصلیت واضح ہو جاتی ہے اور ہمیں جو اندازہ ہوتا ہے۔ وہ
واضح طور پر ان قوتوں سے متاثر ہوتا ہے جو انفرادی عزم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہیں،
انسانی امور میں انفرادی خصوصیات کی کوئی اہمیت نہیں اور مؤرخ کو ان سے کوئی واسطہ
نہیں رکھنا چاہئے، ترقی عظیم شخصیتوں کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ علم کو جمع کرنے اور
پھیلانے کی وجہ سے ہوتی ہے، مجھے اخلاق اور انسانی محرکات اور احساسات میں کوئی ترقی
ہوتی نظر نہیں آتی، فقط سائنس ترقی کرتی ہے اور دنیا کو آہستہ آہستہ بدلتی رہتی ہے۔

موٹسکو۔ جو نتیجہ آپ نے اخذ کیا ہے وہ نہایت معقول ہے، میں نے ایک مرتبہ
نوٹیل کو بھی اسی قسم کی کوئی بات کہتے سنا تھا۔

بکل۔ جناب! آپ کی طرح مجھے بھی تاریخ پر جغرافیہ کے اثرات کے موضوع سے
دل چسپی ہے، آب و ہوا، زمین، غذا اور قدرت کے عام عناصر نے ہر نسل کی تاریخ کو
متاثر کیا ہے۔ ہندوستان کے عظیم الشان قدرتی مناظر نے ہندوؤں کے ذہن اور ان کی
ہمتوں کو پسپا اور مجبور کر کے اور انہیں اوہام اور پرستش کی طرف مائل کیا۔ یورپ کے
سادہ مناظر نے انسان کی جرات میں کمی نہیں آنے دی اور اس کے مزاج میں فطرت کی
پرستش کی بجائے فطرت پر قابو حاصل کرنے کا میلان پیدا کیا۔

اناطول فرانس۔ مسٹر بکل! یہ بات سب جانتے ہیں کہ آپ نے کبھی بحر اوقیانوس عبور
نہیں کیا۔ ان وحشیوں میں، جو اب شمالی امریکہ میں ملتے ہیں، قدرتی سائنس نے بے نظیر
ترقی کی ہے اس کے باوجود کہ وہ مبالغہ کی حد تک مذہبی اور پرہیز گار ہیں۔ مسٹر بکل، آپ
امریکیوں کو دیکھتے تو ان سے آپ کو یقیناً دلچسپی پیدا ہوتی۔

بکل۔ اول تو مجھے فرصت ہی نہیں دوسرے مسٹر ڈکنز نے ہمیں ان کے متعلق جو کچھ
معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ وہ بھی کچھ ایسی ہمت افزا نہیں تھیں، لیکن میں نے امریکہ کی
تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا ہے، میں نے مغربی کرہ میں جغرافیائی حالات کا عجیب امتزاج
دیکھا۔ میکسکو کے شمال میں مغربی ساحل پر بغیر نمی کے گرمی ہے، اور مشرقی ساحل پر گرمی
کے بغیر نمی ہے اس لئے کولمبس سے پہلے امریکی تہذیب میکسکو اور وسطی امریکہ تک محدود
تھی، کیونکہ فقط اسی خطہ میں نمی اور گرمی کا وہ امتزاج موجود تھا، جو پودوں، حیوانوں اور
انسانوں کی زندگی کے لئے سازگار ہے۔ اس کے بعد یورپ والوں کی آمد اور ایجادات اور
اختراعات کی فراوانی نے انسانوں کو قدرتی حالات کا زیادہ محتاج نہیں رکھا۔

موٹیسکو، تو آپ جغرافیائی تعبیر کو قوتوں کی تاریخ کے ابتدائی زمانہ تک محدود کرتے

ں؟

بکل۔ جوں جوں انسان کا ماحول پر تسلط بڑھتا جاتا ہے واقعات کی تشکیل میں معروضی ور مادی مظاہر کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے۔

ولیم جیمز۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی، کیونکہ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ ہم سب کو رض البلد اور طول البلد میں ہی تحلیل نہ کر دیں، لیکن آپ کو شاید یہ جان کر خوشی ہو کہ سٹر ریٹزل نے جو بڑی خاموشی اور انکسار سے یہ بحث سن رہے تھے، جغرافیائی تعبیر کو اریخ کے اعلیٰ کوائف پر بھی اثر انداز دکھایا ہے۔

بکل۔ میں اس سلسلہ میں تازہ ترین خیالات اور تصورات کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

ریٹزل۔ جناب! امریکہ کا یہ عظیم فلسفی میری اہمیت بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لے رہا ہے۔ میرے زمانہ کے علم جغرافیہ میں جو بیش بہا تحقیقات ہوئی ہیں میری تحقیق ان کا ایک حقیر حصہ تھی، رٹر، کویل پیشل، اور ریکلس اس میدان کے شہسوار تھے۔ اور ڈاکٹر جیمز آپ کے ملک میں بھی پروفیسر ہنٹنگڈن نے نہایت مفید تحقیقات کی تھیں۔

بکل۔ آپ ہمیں اپنے خیالات سے مستفید فرمائیے!

ریٹزل۔ میں سیوموٹسکو اور آپ کے تصورات میں کسی قدر ترمیم کی اجازت چاہتا وں۔ گرم ممالک میں زندگی گرمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ زلزلوں، وباؤں، درندوں اور کیڑوں مکوڑوں کی وجہ سے دشوار بنتی ہے۔ نیم گرم ممالک میں گرمی کی کمی ایک رحمت ہے، وہ زندگی کے بیرونی مشاغل بزم پسندی، شدید جنسیت اور اس کے ساتھ ساتھ فن اور تمدن سے قریبی لگاؤ کا سبب بنتی ہے۔ سرد شمال میں غالب طبقہ میں صنعت اور کاروبار کی طرف جو پرجوش میلان اور ملکیت، تسلط اور کارکردگی کی جو ہوس ہوتی ہے اس کی بدولت فن کی بجائے سائنس اور فرصت کی بجائے دولت کی ترقی کا موقع ملتا ہے۔ گھریلو زندگی سے بزم آرائی کے مشاغل کی کمی پوری ہوتی ہے۔ اور مسلسل اور پیہم مقابلہ سخت قسم کی انفرادیت کی تخلیق کرتا ہے۔

مارکس۔ میں آپ کو بعد میں یہ بتاؤں گا کہ یہ سب نتائج جو آپ آب و ہوا سے منسوب کر رہے ہیں، دراصل اقتصادی اسباب سے پیدا ہوئے ہیں۔

بکل۔ لیکن .... پروفیسر صاحب آپ اپنا سلسلہ کلام جاری رکھیے،

ریٹزل۔ آب و ہوا سے قد اور چہرہ کی ساخت بھی متعین ہو سکتی ہے۔ بہت سے

Scanned with CamScanner

مبصرین یہ کہتے ہیں، کہ امریکی لوگوں کی رنگت پیتل کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔ سرخ ہندیوں کی طرح، اور پروفیسر بواس کا یہ خیال ہے کہ امریکہ کی آب و ہوا سے لمبے قد والے مہاجروں کی اولاد کے قد چھوٹے اور چھوٹے قد والے مہاجروں کی اولاد کے قد لمبے ہوتے جا رہے ہیں۔ اور مختلف نسلوں کے سروں کی ساخت ایک سی ہوتی جا رہی ہے اور پروفیسر ہنٹنگڈن نے، پرنس کرو پٹکن کی پیروی میں .....

اناطول فرانس۔ پرنس کروپٹکن، فردپرست صوفی، میری اس سے اچھی شناسائی تھی۔

ریٹرل۔ پروفیسر ہنٹنگڈن نے یہ ثابت کیا ہے کہ بارش کی مقدار کسی قوم کی تقدیر متعین کر سکتی ہے، خشک جھیلوں کی تھیں ہزاروں ہجرتوں کی داستانیں سناتی ہیں، اور وقتاً فوقتاً" جب ایشیا میں بارش نہیں ہوئی تو تہذیبیں تباہ ہو گئیں۔

ولیم جیمز۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہو گی اگر کل یہ ثابت ہو جائے کہ ہجرتیں فتوحات اور بڑی بڑی سلطنتیں، سورج کے داغوں کے نشیب و فراز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

ریٹرل۔ ہر چیز ممکن ہے۔ ذرا دریاؤں کے اثرات پر غور کیجیے۔ نیل اور گنگا، ہوانگ ہو اور ینگ سی، دجلہ اور فرات، ٹائیبر اور پو، ڈینوب اور ایلبا، سین اور ٹیمز، ہڈسن اور سینٹ لارنس، اوہیو اور مسیسپی۔ ان کے زرخیز ساحلوں پر تقریباً تمام تہذیبوں کی بنیاد رکھی گئی، اور ڈینوب، حضرات اگر یہ کبود ڈینوب بول سکتا، تو کتنی مختلف قوموں کی داستانیں سناتا، جو ویران ایشیا کو خیرباد کہہ کے کم آباد یورپ میں چلی آئی تھیں، اگر روس کے دریا جنوب کی بجائے شمال کی طرف بہتے تو کبھی وہ قسطنطنیہ کی ہوس کرتا، جس کے لئے اس نے کئی جنگیں لڑیں ہیں۔ چونکہ روس کے دریا بحیرہ اسود اور بحیرہ کیسپین میں جا گرتے تھے اس لئے ڈینپر نے اسے بازنطینی اور دولگا نے اسے ایشیائی بنا دیا، جب تک پطرس نے سینٹ پیٹرزبرگ نہیں تعمیر کیا، اور نیوا۔ جب تک جاری نہیں ہوا۔ اس وقت تک روس نے مغرب کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی اور یورپ کا ایک حصہ نہیں بنا۔

بکل۔ یہ بات بہت دلچسپ ہے، آپ کہتے جائیے، پروفیسر!

ریٹرل۔ تاریخ میں ساحلوں کی اہمیت پر غور کیجئے۔ بحیرۂ روم نے کئی تہذیبوں کو اپنے پانیوں سے منسلک کر رکھا تھا۔ پھر اوقیانوس نے یورپ کو امریکہ سے ملا دیا اور تجارت کی شاہراہیں بدل گئیں۔

ہیگل۔ میں نے اپنے فلسفہ تاریخ میں، جس کا ذکر ابھی تک کسی نے نہیں کیا یہ کہا تھا کہ قدیم زمانہ کی تاریخ، بحیرۂ روم کے بغیر تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔ جس طرح روما اور

ایتھنز کا تصور' ان چبوتروں کے بغیر ناممکن ہے' جو سارے شہر کا مرکز تھے۔

ریٹزل۔ مجھے آپ کی کتاب کا یہ حصہ اچھی طرح یاد ہے' ایک اچھے ساحل' اور آس پاس کے ہزاروں جزیروں نے یونان پر ایران اور مشرق کی راہیں کھول دیں اور اسے بحیرۂ روم میں تجارت کا مرکز بنا دیا' ساحل اور رقبہ کی کم زور نسبت نے ایشیا میں دولت کی ترقی کو روکا۔ یہی حال آج کل افریقہ کا ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ بھی' جہاں ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک خاصا فاصلہ ہے ایک پسماندہ ملک رہ جاتا ہے۔ اگر ریل گاڑیوں نے اس کے ہر علاقہ کو ساحل سے نہ ملا دیا ہوتا۔

اناطول فرانس۔ جنگ عظیم کے دوران میں' روس نے بالٹک کی ایک بندرگاہ کے لئے' جرمنی نے رائین کے دہانہ کے لئے' فرانس نے ہمارے رائین کے لئے' آسٹریا نے ٹری است اور فیوم کے لئے' انگلستان نے ساری دنیا کے لئے اور امریکہ نے جمہوریت کے لئے جنگیں لڑیں۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ آپ جغرافیہ کے اثر کو مبالغہ آمیز اہمیت دے رہے ہیں۔ آپ نے ماضی کے چند پہلوؤں کو جغرافیہ کے نقطہ نظر سے تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن چند اور پہلو بھی ہیں' اور میرا خیال ہے کہ قوموں کی زندگی اور تقدیر اس اصول سے ماورا ہے' دنیا کے ہر خطہ میں عظیم قوموں نے جنم لیا ہے اور مختلف آب و ہواؤں میں ان کا عروج و زوال ایک ہی طرح رونما ہوا ہے۔

ریٹزل۔ میری بات کا مطلب غلط نہ سمجھئے' میں تاریخ کے ہر پہلو کو جغرافیہ میں تحلیل کرنا نہیں چاہتا' مجھے فقط چند پہلوؤں کی توجیہہ مقصود ہے۔

ولیم جیمز۔ آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔

امریکہ کے ایک بزرگ استاد نے کہا تھا "تاریخ میں' جغرافیائی حالات کے اثرات کی اہمیت کو کم کرنے کی تحریک جاری ہے۔"

بکل۔ آپ بجا فرماتے ہیں' جغرافیائی حالات محض لابدی پابندیاں ہیں۔ فیصلہ کن قوتیں نہیں ہیں' وہ ایسے حدود قائم کرتے ہیں' جن کے اندر دوسری قوتیں کسی قوم کو عروج و زوال کی طرف لے جاتی ہیں' خلیج کے بہاؤ کے بدلنے سے انگلستان تباہ ہو سکتا ہے لیکن خلیج کے بہاؤ نے انگلستان کو عظمت نہیں بخشی۔ تمام اعلیٰ تہذیبوں میں فیصلہ کن اسباب اقتصادی یا ذہنی نوعیت رکھتے ہیں۔

والٹیئر۔ یہ خیال نہایت معقول ہے' میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ انگریز سمجھ دار ہوتے ہیں' یہ خیال ایسا ہے۔ جس میں موسیو موٹسکو مجھ سے متفق ہیں۔

نیطشے۔ شاید آپ دونوں کا خیال صحیح نہیں۔

۴۔ تاریخ کی نسلی تعبیر

اناطول فرانس۔ موسیو بکل۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ فیصلہ کن اسباب، اقتصادی، ذہنی یا نسلی ہو سکتے ہیں۔ میرے زمانہ میں بہت سے طلباء قوموں کے عروج و زوال کو نسلی خصوصیات سے منسوب کر رہے تھے۔ اس طرح پروفیسروں کے لئے یہ ممکن ہو گیا تھا کہ وہ بیک وقت سائنس دان اور وطن پرست بن سکیں۔ بس کاؤنٹ گوبینو اس معاملہ میں ایک استثنیٰ ہیں وہ نہ پروفیسر تھے، نہ محب وطن،

گوبینو۔ جب آپ صرف دس برس کے تھے، تو میں نے ایک کتاب، شائع کی تھی "انسانی نسلوں کے اختلافات۔" جس میں میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ انسانی تخلیق کے ہر شعبہ سائنس، فن، تہذیب، الغرض ہر اس چیز کا جو اس دنیا میں عظیم، بلند اور مفید ہے، سرچشمہ ایک ہی ہے۔ سب کی جڑ ایک ہی ہے اور وہ ہے ٹیوٹن نسل۔ انسانی کنبہ کی اس شاخ کا بیج، غالباً سیاہ اور زرد نسلوں کے بیج سے مختلف تھا۔ اس کے افراد کا انداز کچھ اور ہی تھا اور اس کی مختلف شاخوں نے دنیا کے ہر مہذب گوشہ پر تسلط حاصل کیا ہے۔ نسل کے تصور سے تاریخ کی توجیہہ ہو سکتی ہے، جیسے میرے دوست نیطشے نے کہا ہے قیادت کے لئے ذہن کی ضرورت نہیں۔ بلکہ خون کی ضرورت ہے۔

نیطشے۔ کاؤنٹ گوبینو۔ میں آپ کا مداح ہوں، لیکن اس نسلی تصور سے میرا کوئی واسطہ نہیں، میں نے ہر نسل کے کچھ لوگوں میں اچھے خون کی علامتیں دیکھی ہیں۔ وینس کے کشتی بانوں کا خون، غالباً جرمن نوجوانوں کے خون سے بہتر ہے۔

اناطول فرانس۔ محترم کاؤنٹ۔ آپ کے تصور سے انگریز اور جرمن ناخوش نہیں ہوئے، پروفیسر فری مین نے اسے ناشائستہ سرعت سے اپنایا، پروفیسر ٹرائی اٹیکے نے اسے خوشی سے قبول کیا اور ڈاکٹر برنارڈی نے یہ تسلیم کیا، کہ جرمن قوم تاریخ کی مہذب ترین قوم ہے۔ موسیو چیمبرلین نے، جنہوں نے انگلستان چھوڑ کر جرمنی میں سکونت اختیار کی، ایک ضخیم کتاب لکھی، "انیسویں صدی کی بنیادیں" جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ "اصل تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب جرمنوں نے اپنے قوی ہاتھوں سے عہد پارینہ کی وراثت کو اپنایا" میرا خیال ہے کہ اس وراثت کے معماروں نے تاریخ کی تخلیق نہیں کی تھی۔ مسٹر چیمبرلین کا یہ خیال تھا کہ اگر کسی شخص میں عظمت کے آثار ہوں، تو وہ

Scanned with CamScanner

سمجھ کر اس کی رگوں میں ٹیوٹن خون موج زن ہے' انہیں ڈانٹے کا چہرہ جرمن معلوم ہوا۔ انہیں پولوس رسول کے "گلیتوں کے نام خط" میں جرمن لہجہ کی گونج سنائی دی۔ اور اگرچہ وہ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ مسیح جرمن تھا لیکن انہوں نے پورے وثوق سے کہا' کہ "جو شخص یہ کہتا ہے کہ مسیح یہودی تھا' یا جاہل ہے یا بد دیانت۔" رچرڈ واگنر نے اس تصور کو موسیقی پر چسپاں کیا۔ پچاس برس' مفلسی میں بسر کرنے کے بعد اس وحشی نے یہ جان لیا' کہ تاریخ کی ٹیوٹنی تعبیر کو اپنانے اور اپنے بچپن کی پارسائی کی نمائش کرنے سے وہ شاید رئیس طبقہ کو اپنی موسیقی کی طرف مائل کر سکے۔

نیطشے۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی' لیکن آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ وہ ڈھونگ رچانے میں ماہر تھا۔

اناطول فرانس۔ ہر عظیم شخصیت ایسی ہی ہوتی ہے۔

اس قسم کی "نیم حکیمی" کے بغیر وہ بھوکا مرجاتا۔ جمہوری ممالک میں اس کی خاص طور پر ضرورت پڑتی ہے۔

ولیم جیمز۔ ہمارے زمانہ کے عقلمند لوگ نسل کے تصور کے حامی تھے۔ گالٹن نے عظمت کو وراثت میں تحلیل' علم الارث نے رئیسوں کی اولاد کی حمایت میں ایک مہم شروع کی۔ میکس ملر' لسانیات کی تشریح اس طرح کر رہا تھا کہ آریہ قوم' ہندوستان سے یورپ آئی اور وائزمن ثابت کر رہا تھا (سائنس بہت سی چیزیں ثابت کرتی ہے' فقط ایک دن کے لئے) کہ مادہ حیات ہمارے جسم کے بدنام حصوں میں کہیں چھپا ہوا ہے ماحول کے اثرات سے بے نیاز ہے۔ ماہرین حیاتیات' وراثت پر اور مورخ نسل کے تصور پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔

اناطول فرانس۔ حضرات' شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ موسیو میڈیسن گرانٹ۔ جو حال ہی میں نیویارک سے آئے ہیں' اس مضمون کے ماہر ہیں۔ میں نے اپنے بڑھاپے میں' ان کی کتاب' ایک عظیم نسل کا خاتمہ' دیکھی تھی۔ میں نے اسے اس خیال سے پڑھنا شروع کیا کہ شاید ان کا مطلب فرانس قوم کا خاتمہ ہے' لیکن جب میں نے دیکھا کہ ان کا اشارہ' جرمن اور انگریز اقوام کی طرف ہے تو میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسے آگے پڑھنا فضول ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ غلط کہہ رہے ہیں۔

والٹیئر۔ آپ اپنے خیالات سے ہمیں آگاہ کیجئے' موسیو گرانٹ' اور اگر موسیو فرانس کو آپ سے اتفاق نہیں' تو پریشان نہ ہوجئے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم فرانسیسی غلطی پر ہوں اور باقی

دنیا ٹھیک کہتی ہو۔

گرانٹ۔ میرا نظریہ، مسٹر چیمبرلین اور مسٹر گوبینو کے نظریوں سے مختلف ہے۔ میں ٹیوٹنی نسل کے تصور کو غلط سمجھتا ہوں، کیونکہ یہ نسل، مختلف نسلوں کا امتزاج ہے، جن میں ابھی تک ربط پیدا نہیں ہوا۔ میں اپنا تصور فقط نارڈک نسل تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، جو ہمارے زمانہ میں خصوصیت سے ان جرمنوں میں نظر آتی ہے، جو بالٹک کے علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں، یا ان انگریزوں اور امریکیوں میں، جو اینگلو سیکسن نژاد ہیں۔ لیکن یہ تقسیم جدید ہے اور نسل تاریخ کی طرح قدیم ہے۔ سب سے پہلے نارڈک، ساچی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جنہوں نے ہندوستان کو سنسکرت سے متعارف کیا۔ وہ شمال سے سفید حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے تھے اور انہوں نے اثر مناکحت اور اپنی نسل کے تنزل کو روکنے کے لئے ذات، ایجاد کی "ذات" کا مطلب رنگ تھا اور اس کا وظیفہ اقتصادی نہیں، حیاتیاتی تھا۔ اس کا مقصد اقتصادی مواقع کی اجارہ داری حاصل کرنا نہیں بلکہ خون کا تحفظ تھا۔

پھر ہم سارین قوم کو قفقاز سے ایران میں آتے دیکھتے ہیں۔ آخیئن، فرجیین اور ڈوریئن قوموں نے ایشیائے کوچک اور یونان کی تسخیر کی۔ ابرین اور اوسکن قوموں نے اطالیہ پر فتح پائی۔ جہاں کہیں وہ گئے، وہ جنگجو سپاہیوں، معرکہ پسندوں، سیاحوں حاکموں اور قائدوں کی حیثیت سے گئے۔ دوسری یورپی نسلوں، مثلاً خاموش اور رضاجو ایلپی، بحیرہ روم کے علاقہ کے جوشیلے، متلون مزاج اور تساہل پسند لوگوں سے بہت مختلف تھے۔ یہ تضاد اطالیہ میں بہت نمایاں ہے۔ جنوبی اطالیہ کے لوگ بحرۂ روم کے علاقہ کی دوسری نسلوں کی مانند ہیں۔ وہ ان تمام نسلوں کے گمنام غلاموں کی اولاد ہیں، جنہیں رومنوں نے اپنی وسیع اور فراخ املاک پر کام کرنے کے لئے درآمد کیا تھا۔ شمالی اطالیہ کے لوگ بہتر نسل سے ہیں، کیونکہ ان میں سے اکثر ان جرمن فاتحین کی اولاد ہیں، جو سیزر سے لے کر شارلیمین تک اطالیہ پر حملے کرتے رہے ہیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے فلورنس میں احیائے علوم کی تحریک شروع کی اور پھر اسے اپنے ساتھ روما لے گئے۔ ڈانٹے، رفیل، ٹیشین، مائیکل اینجلو، لیونارڈو ڈاونچی، سبھی نارڈک نسل سے تھے۔ یونان میں، آخین قوم نے مفتوح قوم کے ساتھ اثر مناکحت شروع کر دی اور پیریکلیز کے عہد کے ایتھنز کے ذہین اور زیرک لوگ پیدا کیے۔

اناطول فرانس۔ آخین قوم غیر ذمہ دار تھی کہ اس نے اس طرح اثر مناکحت شروع

کر دی!

والٹیئر- آپ فرانس کی باتوں کی پروا نہ کیجئے، آپ کے خیالات نہایت دلچسپ ہیں، آپ جاری رکھئے۔

گرانٹ- ڈورین قوم نے اثر مناکحت سے پرہیز کیا اور اسپارٹا کی قوم بن گئی- ایک جنگجو قوم جو رومی غلاموں پر حکمران رہی، اعلیٰ طبقے کے یونانی گورے تھے، ادنیٰ طبقہ کے کالے- اولمپس کے دیوتاؤں کے بیان میں انہیں ہمیشہ گورا بتایا گیا ہے- یہ تصور کرنا محال ہے کہ کوئی یونانی فن کار گندمی رنگ کی وینس بنائے گا- آج کلیسا میں تمام فرشتے گورے رنگ کے دکھائے جاتے ہیں، اور ادنیٰ طبقہ کے آدمی گہرے گندمی رنگ کے- قدیم منقش ردوں پر اکثر کوئی گورا نواب گھوڑے پر سوار نظر آتا ہے اور اس کی باگیں ایک سیاہ بالوں الے گنوار کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں- صلیب کی تصویر بناتے ہوئے کوئی فن کار مسیح کو ورے اور دو چوروں کو گندمی رنگ میں ڈھالتے ہوئے نہیں ہچکچائے گا- یہ محض رسم ہیں، بلکہ یہ روایات بتاتی ہیں، کہ مسیح نارڈک، غالباً یونانی نسل کا جسمانی اور اخلاقی صفات ا مالک تھا-

اناطول فرانس- بڑا آدمی بننا بھی بڑی بد نصیبی ہے، تم ساری عمر فاقے کرو اور جب تم رجاؤ تو لوگ تمہیں، سوائے تمہاری اپنی ہیئت کے ہر ہیئت دینے کو تیار ہیں- لیکن آپ پنی باتیں جاری رکھیئے- ناڈرک نسل کے لوگ شوق سے مسیح کو لے جائیں، یہودیوں کو اس ی ضرورت نہیں-

گرانٹ- یونان نے مقدونیہ سے شکست کھائی، جہاں یونانی نسل اثر مناکحت سے راب ہو گئی تھی- مقدونیہ کے لوگ ناڈرک تھے- انہوں نے ایران کو شکست دی، کیونکہ رانیوں نے غیر ایرانی ایشیائی نسلوں سے اثر مناکحت کر کے اپنے آپ کو کمزور کر لیا تھا، پھر عظیم حملوں کے عہد تک ہمیں نارڈک نظر نہیں آئے- وہ بالٹک تک پہنچ گئے تھے- سیکنڈ ہویا کو آباد کر رہے تھے اور اس علاقہ سے وہ سینکڑوں سمتوں میں پھیل چکے تھے- یورپ کا شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں یہ ظالم نہ پہنچے ہوں اور جہاں انہوں نے حکومت نہ کی ہو پہلے نہوں نے روما کو فتح کیا- اور احیائے علم کے زمانہ کے نواب نارڈک تھے- انہوں نے کئی مرتبہ فرانس کو فتح کیا- فرینک، نارڈک ٹیوٹن تھے اور انہوں نے فرانس کو جرمن کا نام دیا- شارلیمین جرمن شہنشاہ تھا- اس کا دارالخلافہ آخن تھا- اس نے جرمن کو اپنی درباری زبان بنایا- دلاوری، سرداری، جاگیرداری، طبقاتی تقسیم، نسلی خودداری، ذاتی اور خاندانی غرور،

Scanned with CamScanner

نارڈک عادات اور خصائل میں شمار ہوتے تھے۔ یہ وہی جابرانہ مزاج تھا' جس نے فرانس، مقلیہ' اور انگلستان کو فتح کیا تھا۔ اسی نے روس کو فتح کر کے ۱۹۱۱ء تک مطیع رکھا۔ اسی نے امریکہ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں نو آبادیاں قائم کیں۔ اسی نے یورپ کے تاجروں پر ہندوستان اور چین کے دروازے کھول دیئے۔ اور اپنے سنتری ایشیا کی ہر بندرگاہ پر متعین کر دیئے' یہ وہی لوگ ہیں' جو بلند ترین کوہساروں کو عبور کرتے ہیں۔ ایلپس کو کھیل کا میدان سمجھتے ہیں اور قطبین کی کھوج میں بے سود سفر اختیار کرتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ نسل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۷۸۹ء میں فرانس میں اس کے قدم اکھڑ گئے۔ انقلاب فرانس دراصل اصلی فرانسوی نسل کی ٹیوٹن سرداروں کے خلاف بغاوت تھی' جنھوں نے فرانس کو ایک ہزار برس تک مطیع رکھا تھا۔ نارڈک قوم کی صلیبی جنگوں میں پیکار پرستی جو خودکشی کے برابر تھی۔ تیس سالہ جنگ' نپولین کے معرکے اور جنگ عظیم نے نارڈک نسل کا خون چوس لیا۔ انگلستان اور جرمنی میں' نارڈک نسل کے لوگ اپنی کم شرح پیدائش کی وجہ سے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ روس میں وہ ان وحشیوں سے شکست کھا گئے ہیں' جن کی قیادت ایک منگول اور ایک یہودی کر رہا ہے۔ امریکہ میں جنوبی یورپ کے مہاجرین' ان مہاجروں کی زیادہ شرح پیدائش' اور جمہور کی حکومت اور ان کے بڑھتے ہوئے اثر نے انہیں بے بس کر دیا۔

اناطول فرانس۔ بہت خوب! کیا عمدہ بات فرمائی ہے آپ نے!

گرانٹ۔ اس کا نتیجہ' تہذیب کا انحطاط ہے انگلستان اور امریکہ میں معیار اور ذوق کا زوال ہے' نغمہ و موسیقی' رقص و سرود' تمثیل۔ کامیاب ارباب سیاست اب عوام میں سے اٹھتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہجرت پر کڑی پابندیاں اور نارڈک اور غیر نارڈک نسلوں کے درمیان اثر مناکحت کی ممانعت' امریکہ کو محفوظ کر دے گی لیکن پانی سر سے گذر چکا ہے' شرح پیدائش کے اختلافات ہجرت اور اثر مناکحت کے ساتھ ساتھ تہذیب کو ختم کر دیں گے۔ ۲۰۰۰ء تک نارڈک نسلی ہر جگہ اپنا اقتدار کھو دے گی اور اس کے ساتھ یورپ اور امریکہ کی تہذیب ادنیٰ نسلوں سے ابھرتی ہوئی ایک نئی بربریت کی نذر ہو جائے گی۔

اناطول فرانس۔ یہ ایک نہایت تاریک تصویر ہے' لیکن پھر بھی ایلپی فرانسیسی' اطالوی' آسٹروی اور روسی باقی رہ جائیں گے۔ یہ بات واضح ہے کہ روسی اپنے آپ کو جمہوریت کا ہاتھوں تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ یہ نارڈک نسل کے لوگوں یعنی انگریزوں کو یہ کیا شرارت سوجھی کہ انہوں نے اکثریت کی حکومت ایجاد کی! لیکن حضرت' سچ سچ بتائیے کیا آپ واقعی

Scanned with CamScanner

سمجھتے ہیں کہ نارڈک نسل کے لوگ بہت عمدہ لوگ ہیں؟ میرے نزدیک تو وہ بہت بڑے جنگجو، ڈاکو اور لٹیرے تھے۔ کیا یہی تہذیب ہے؟

گرانٹ۔ انھوں نے جدید یورپ کی ریاستوں کو منظم کیا اور ہماری تہذیب کو ممکن بنایا۔

نیطشے۔ اگر انھوں نے جدید یورپ کی ریاستوں کو منظم کیا، تو یہ اور بھی بری بات کی۔ بہتر ہوتا کہ یہ ریاستیں قائم نہ ہوتیں، تب پاپائے روم ایک متحدہ یورپ پر حکومت کرتا۔ اپنے استحکام اور طاقت کے زیر اثر کلیسا میں فن اور آزادی کا گداز پیدا ہوتا اور مہذب طبقہ اسی طرح آزاد ہوتا، جس طرح آج پیرس یا دی آنا میں ہے، یا لیودہم کے وقت روما میں تھا، اور عوام "یادگاری توشہ" حاصل کر کے مطمئن رہتے۔

گرانٹ۔ آپ قدرت پرست ہیں، جناب،

نیطشے یقیناً، یونانی زبان جانتے ہوئے میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

اناطول فرانس۔ چند دنوں کی بات ہے کہ ہم نے مل کر ایک "انتخاب" کیا، اور جس طرح امریکی، حیاتیات کے بارے میں رائے شماری کرتے ہیں، اس طرح ہم نے یہ متعین کرنا چاہا، کہ اس عالم بقا میں ہم میں سے عظیم ترین شخصیتیں کون سی ہیں۔ مجھے منتخب لوگوں کے نام یاد ہیں۔ اس فہرست میں شیکسپئر تھا، ابھی تک اسے زمرہ سے خارج کرنے کی کسی کو ہمت نہیں۔ پھر اس فہرست میں بیتھوون اور مائیکل اینجلو کا موسیٰ، اور مسیح، جو واقعی بہت پیارا آدمی ہے شامل تھے۔ افلاطون ان میں فلسفیوں کا نمائندہ تھا اور لیونارڈو فن کاروں کا۔ میں نے والٹیر کو شامل کرنے پر اصرار کیا۔ نیطشے نے نپولین کی سفارش کی، اور برانڈیں نے کہا کہ سیزر کو بھی شامل کر لو" میں نے ربیلیز کا نام لیا۔ لیکن انتخاب کرنے والوں نے حماقت کی، جوہر۔ اجتماع کرتا ہے اور ڈارون کو چن لیا۔ اس فہرست کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے موسیو گرانٹ،

گرانٹ۔ بہت اچھی ہے یہ فہرست!

اناطول فرانس۔ جواب دینے سے پہلے آپ نے یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ یہ فہرست آپ کی نارڈک نسل کے خلاف جاتی ہے۔ ان دس حضرات میں سے صرف تین نارڈک نسل سے تعلق رکھتے ہیں، باقی یہودی، یونانی اور لاطینی ہیں۔ میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ فن اور ادب، فلسفہ اور مذہب، اور قلب و نظر کے معاملات میں نارڈک اتنے عظیم نہیں، جتنے وہ ایک دوسرے کو ذبح کرنے اپنے ہمسایوں کو تباہ و برباد کرنے اور ٹیکس لگانے

میں ہوشیار ہیں۔

گرانٹ۔ آپ کی باتوں نے مجھے بوکھلا دیا ہے، حضور، بروسون کے آنے پر میں اپنا انتقام لوں گا۔

اناطول فرانس۔ میں اسے واپسی کا ٹکٹ خرید دوں گا۔

گرانٹ۔ آپ غالباً صحیح کہہ رہے ہیں، نارڈک اور ایلپی جسمانی ہیئت میں تیز لیکن بحیرۂ روم کے علاقہ کے لوگ ذہنی طور پر ان دونوں سے برتر تھے۔ فن کے معاملہ میں متوخرالذکر کی عظمت میں کسی کو کلام نہیں۔ جہاں تک جدید یورپ کا تعلق ہے، تہذیب شمال سے نہیں، جنوب سے آئی تھی۔ پرانے رومی اسی نسل سے تھے، مصر کی دریا تہذیب، کریٹ کی شاندار منوی سلطنت، ایڑریاکی سلطنت (جو روما کی پیش رو اور رہنما تھی) بحیرہ روم اور بحراسود کے گرد یونانی ریاستیں اور نوآبادیاں، فینیشیا کی بحری اور تجارتی طاقت اور اس کی عظیم نوآبادی، کارتھج۔ یہ سب رومی نسل کی تخلیقات تھیں۔ انہیں یورپ میں کلاسیکی تہذیب پھیلانے کا فخر حاصل ہے۔

اناطول فرانس، آپ کے اعترافات نہایت فیاضانہ ہیں، میں اس بات پر زور نہیں دوں گا کہ ایتھنز کے لوگ، جو نارڈک اور رومی نسلوں سے اثر مناکحت کی پیداوار تھے، سوائے جنگ کے ہر معاملہ میں اسپارٹا کے لوگوں سے بہتر تھے، جو بقول آپ کے خالص نارڈک تھے، میں صرف یہ درخواست کروں گا کہ ذرا سیکنڈ نیویا کی طرف دیکھئے، جس نے عظیم ابسن اور نوبل پرائز کو جنم دیا۔ ذرا ان خالص نارڈک لوگوں کی تہذیبی سرگرمیوں کا احیائے علوم کے اطالویوں کے فن، ادب، سائنس اور فلسفہ سے مقابلہ کیجئے، جو آپ کے نزدیک نارڈک اور غیر نارڈک نسلوں کے ملاپ کی پیداوار تھے۔ کیا آپ کو یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ نارڈک اور غیر نارڈک نسلوں کے ملاپ سے بہتر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

گرانٹ۔ کبھی کبھی۔

نیطشے۔ نسل کیا ہوتی ہے؟

گرانٹ۔ ہر عیاں بالذات چیز کی طرح نسل کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نسل" ایک ہی ماخذ کے لوگوں کے مجموعہ کا نام ہے جس کے اکثر افراد ایک ہی مخصوص رنگت، ایک ہی طرح کے بال، کھوپڑی کی ایک سی ساخت اور ایک ہی قد و قامت رکھتے ہوں۔

اناطول فرانس، جب میں انگلستان میں تھا تو موسیو ہیلزبلک نے مجھے بتایا کہ ایک شخص

نے یہ پتہ لگایا ہے کہ وہ نارڈک نسل سے تعلق رکھتا ہے' اور وہ سر کی ساخت' قد' رنگ اور بادلوں کے لحاظ سے ایلپی ہے' انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ایک عورت کے پانچ بچے ہیں' جن میں سے دو رومی' ایک ایلپی' ایک نارڈک اور ایک تینوں نسلوں کا مرکب ہے۔ یہ سب قسمیں ممکن ہے انگلستان میں موجود ہوں لیکن موسیو .بیلک کا خیال تھا کہ غالباً یہ خاتون سیر و سیاحت کرتی رہی ہے۔

گرانٹ۔ میں مانتا ہوں کہ کوئی نسل خالص نہیں ہوتی' اور ہر فرد میں مختلف نسلوں کا خون شامل ہوتا ہے لیکن یہ بات یقینی ہے' کہ انگلستان کے رئیس' ان امریکیوں سے کہیں زیادہ خالص ہیں' جو جدید امریکہ کے خرنوں کے انتشار' سے پیدا ہوں گے۔

بکل۔ میرا خیال ہے کہ انگریز قوم' کیلٹ' رومن' اینگل' سیکسن' جیوٹ' ڈین اور نارمن نسلوں کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔

گرانٹ۔ لیکن ان میں سے اکثر نسلیں' نارڈک نسل کی شاخیں تھیں۔ حقیقت میں وہ ایک ہی نسل تھے۔

ریٹزل۔ حضرات' کیا میں مخل ہو سکتا ہوں؟ میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یورپ کی یہ تینوں نسلیں دراصل ایک ہی نسل کی شاخیں ہیں۔ یہ نسل مشرق سے ابھری تھی اور ایلپیوں کی طرح وحشی تھی' پھر یہ شمال اور جنوب میں پھیل گئی اور مختلف جغرافیائی اور اقتصادی حالات کے زیر اثر نارڈک' اور رومی نسلوں میں بٹ گئی۔ نسلی اختلافات' ماحول کے اختلافات سے پیدا ہوتے ہیں' اس لئے نسل کو تاریخ کا فیصلہ کن سبب نہیں کہا جا سکتا۔ شمال کے لوگ جب وہ کچھ عرصہ تک گرم ممالک میں رہیں تو جنوب کے لوگوں کی خصوصیات حاصل کر لیتے ہیں۔ پہاڑوں کو عبور کرنے والے ہر جگہ لمبے قد کے ہوتے ہیں چاہے وہ کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ جرمن جو جنوبی برازیل میں ہجرت کر گئے ہیں' آہستہ آہستہ اپنی "توانائی" کھو بیٹھے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے انگریزوں کی طرح وہ درختوں کے نیچے بیٹھتے ہیں اور کسی کالے آدمی کو کام کرنے کے لئے ملازم رکھتے ہیں۔ نسلی خصوصیات۔ جغرافیائی حالات سے پیدا ہوتی ہیں۔

۵۔ تاریخ کی معاشی تعبیر

مارکس۔ ٹھہریئے جناب ریٹزل۔ صرف جغرافیائی ماحول کو آخر اتنی اہمیت کیوں؟ قد' غذا سے کیوں نہیں اور صرف آب و ہوا اور نسل ہی سے کیوں متعین ہوتا ہے؟ مجھے حیرت

ہے کہ یہ بحث اتنی دیر سے ہو رہی ہے اور کسی نے تاریخ کی معاشی تعبیر کا ذکر تک نہیں کیا۔

والٹیئر۔ (اناطول فرانس سے) یہ سیاہ سنجیدہ داڑھی والا دیوتا کون ہے؟

اناطول فرانس۔ (والٹیئر سے) یہ محاذ جنگ کا سقراط۔ کارل مارکس ہے' اس نے ایک بیحد ذور دار کتاب لکھی ہے جس میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں طاقتور' کمزور کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

والٹیئر۔ یہ ایک نادر انکشاف ہے' کیا اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس استحصال کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے؟

اناطول فرانس۔ ہاں! اس کا خیال ہے کہ کمزور اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے طاقتوروں کا خاتمہ کر دیں گے۔

والٹیئر۔ (مارکس سے) آپ کا کیا نظریہ ہے' موسیو؟

مارکس۔ جناب میرا نظریہ نہایت سادہ ہے' میرے نزدیک ہر زمانہ میں معاشی پہلو تاریخ کا بنیادی پہلو رہا ہے۔ پیداوار اور تقسیم کا طریقہ' دولت کی تقسیم اور اسے صرف کرنے کا انداز' آقا اور ملازم کا تعلق' امیر اور غریب کی طبقاتی آویزش۔ یہ ہیں وہ اسباب جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں یعنی مذہب' اخلاق فلسفہ' سائنس' ادب اور فن کی نوعیت کو متعین کرتے ہیں۔ پیداوار سے پیدا ہونے والے مختلف قسم کے رشتے اجتماعی طور پر اقتصادی نظام کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔ اور اس بنیاد پر قانونی اور سیاسی عمارت استوار ہوتی ہے اور اسی کے مطابق اجتماعی شعور ڈھلتا ہے۔

والٹیئر۔ آپ کی باتیں بڑے مجرد اور ٹھوس انداز کی ہیں اور انہیں سن کر میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا۔ لیکن جناب شاید آپ اپنے مجرد تصورات کو مثالوں کے ذریعہ واضح کر سکیں۔

مارکس۔ بہت بہتر! اپنے نظریہ کی روشنی میں انسان کی مکمل تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں تاریخ کو قدیم' متوسط اور جدید زمانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ تاریخ کی یہ تقسیم عہد وسطیٰ کے مفکروں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ میں نے انسانی تاریخ کو شکاری اور شبانی' زراعتی اور دستکاری' صنعتی اور مشینی عہدوں میں تقسیم کیا ہے۔ میرے نزدیک تاریخ میں جتنے عظیم واقعات پیش آئے ہیں وہ عظیم سیاسی نہیں' اقتصادی ہیں۔ میں میراتھون کی جنگ' سیزر کے قتل اور انقلاب فرانس کو نہیں' بلکہ زراعتی انقلاب اور صنعتی

Scanned with CamScanner

انقلاب کو تاریخ کے اہم اور عظیم واقعات سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ ان میں سے ایک نے زندگی کے نظام کو شکاری سے زراعتی بنایا اور دوسرے نے گھریلو صنعتوں کی جگہ کارخانہ کی صنعتوں کو رائج کیا۔

والٹیئر۔ گویا آپ کے نزدیک دولت اور افلاس کی شکلوں کا بدلتے رہنا زندگی کی سب سے اہم حقیقت ہے۔

مارکس۔ محض یہی نہیں بلکہ اقتصادی حالات، سلطنتوں کے عروج زوال کا سبب ہوتے ہیں۔ سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی حالات کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بداخلاقی، تعیش پرستی، نفاست پسندی، یہ اسباب نہیں بلکہ نتائج ہیں۔ ہر چیز کی تہ میں زمین کا فرق اور اس کی نوعیت اپنا کام کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی خاص زمین پر کھیتی باڑی ہو سکتی ہے یا وہ صرف شکار اور بھیڑ بکری پالنے کے لئے موزوں ہے! یا اس میں مفید معدنیات پوشیدہ ہیں؟ مصر اپنے لوہے کی وجہ سے مشہور ہوا، قدیم برطانیہ اپنے ٹین کی وجہ سے اور جدید برطانیہ اپنے لوہے اور کوئلے کی وجہ سے۔ ایتھنز کی چاندی کی کانیں جب خالی ہو گئیں تو ایتھنز کی قوت ختم ہو گئی۔ مقدونیہ کے سونے نے فلپ اور سکندر کے ہاتھ مضبوط کیے۔ روما نے ہسپانیہ کی چاندی کی کانوں کے لئے کارتھیج سے جنگ لڑی اور جب اس کی زمین بنجر ہو گئی تو وہ زوال پذیر ہو گئی۔

اناطول فرانس۔ مجھے تاریخ کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ میرا علم صرف ادب اور فلسفہ کی بیکار تفاصیل تک محدود ہے۔ لیکن جناب، میں اپنے زمانہ کی جنگوں کا جائزہ لے کر آپ کی تائید کر سکتا ہوں۔ وہ سب کی سب قدرتی ذرائع پیداوار، یا کسی اجنبی ملک کے تجارتی مواقع حاصل کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔

مارکس۔ شکریہ آپ نے تجارتی مواقع کا ذکر کیا۔ یہ بھی یقیناً تاریخ کی تعین میں حصہ لیتے ہیں۔ یونانیوں نے ٹروجن جنگ کیوں لڑی؟ کیا وہ ایک آوارہ عورت کے حسن کے لئے لڑی گئی تھی؟ اگر ہیلن کا کوئی وجود تھا، یقین مانئے کہ اسے محض اقتصادی محرکات پر پردہ ڈالنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ یونانی چاہتے تھے کہ ان کے تجارتی رقیبوں، اور ان کے معاونین کو اس شہر سے خارج کیا جائے جو ایشیا کو جانے والے بحری راستہ پر قابض تھے۔

ولیم جیمز۔ تو گویا ہیلن کے چہرہ نے ہزاروں جہازوں کے بادبان ہوا میں نہیں لہرائے تھے۔

مارکس۔ جہاں تک مجھے علم ہے، نہیں! آپ یہ جانتے ہوں گے کہ وہ بحری بیڑا، جسے

Scanned with CamScanner

تھیمو سٹیکلیس نے یزد جرد کے خلاف بنایا تھا۔ مسیح سے پانچ صدیاں پہلے ایتھنز کی جمہوریت کی بنیاد تھا اور ڈیلیا کی حکومت کی دولت سے ایتھنز نے اپنے شاندار صنم خانے تعمیر کئے تھے۔ چرائے ہوئے سونے کی بدولت فن کے یہ شاہکار استوار کئے گئے تھے۔ فن کے اکثر زریں عہد' دولت سمیٹنے کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ لیکن ایتھنز غذا کے لئے در آمد کا محتاج تھا۔ اسپارٹا نے جونہی اس کا محاصرہ کیا' ایتھنز کے عوام بھوکے مرنے لگے اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد یہ عظیم شہر پھر نہ سنبھل سکا۔

یہ بھی دیکھئے کہ یونان میں مزدوروں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے سے صنعتی جدت اور ترقی رک گئی۔ عورتوں کی غلامی سے صحت مند محبت کے امکانات ختم ہو گئے۔ امرد پرستی پیدا ہوئی اور اس نے یونانی صنم تراشی کو متاثر کیا۔ مادی چیزوں کی پیداوار کے طریقے' زندگی کے اجتماعی' سیاسی' اور روحانی وظائف کو متاثر کرتے ہیں۔ لوگوں کا شعور ان کے وجود کا باعث نہیں بنتا' بلکہ ان کے اجتماعی وجود سے ان کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ فرد یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے خیالات' اپنا نظام فلسفہ' اپنے اخلاقی تصورات اور مذہبی عقائد' اپنے جماعتی تعصب اور فنی شعور' منطقی اور غیر جانب دار استدلال سے حاصل کئے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کی زندگی کے اقتصادی حالات نے اس کے افکار کو کس قدر متاثر کیا ہے۔

موفسکو۔ آپ اپنا نظریہ روما کی تاریخ پر کس طرح منطبق کریں گے۔

مارکس۔ روما کی حکومت بنیادی طور پر غلاموں پر ستم روا رکھنے والی حکومت تھی۔ اس سے پہلے تاریخ میں آقاؤں نے کبھی اتنی سخت گیری اور بداخلاقی سے کام نہیں لیا تھا' لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ کسان غریب ہوتے گئے' امیروں نے ان کی زمینیں خرید لیں اور ان پر ہل چلانے کے لئے غلاموں کو در آمد کیا۔ غلاموں نے بے پروائی اور تساہل سے کاشت کاری کی۔ زمین تباہ ہو گئی اور روما کو اپنی غذائی ضروریات کے لئے دوسروں کا محتاج ہونا پڑا۔ غلاموں کی بغاوتوں نے ملک کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ اور ایشیا کی باہمی تجارت روما کے راستہ کم اور باسفورس کی راہ سے زیادہ ہوتی گئی۔ قسطنطنیہ پھلنے پھولنے لگا اور روما پر زوال آ گیا۔

بوسے۔ آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ زمانہ وسطیٰ میں' اقتصادی حالات نہیں' بلکہ مذہب لوگوں کی زندگیوں پر حاوی تھا'

مارکس۔ میرے نزدیک یہ نظریہ سطحی ہے۔ کلیسا کی طاقت ان مظلوم لوگوں کے افلاس

Scanned with CamScanner

اور تباہی پر مبنی تھی جو روحانی سکون اور امید فردا کے بھوکے تھے۔ اس کا انحصار لوگوں کی جہالت اور توہم پرستی پر تھا' جو افلاس کا لازمی نتیجہ ہے اور وہ طرح طرح کے ٹیکسوں کی مدد سے مستحکم ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس نے یورپ کی دو تہائی زرعی زمین خرید لی۔ یہ تھی کلیسا کی طاقت کی اقتصادی بنیاد۔ یہی حال زمانہ وسطیٰ کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا تھا۔ ان کے اسباب بھی اقتصادی تھے۔ صلیبی جنگیں۔ کافروں' سے تجارتی راہیں چھیننے کے لئے لڑی گئی تھی' احیائے علوم' سونے کی فراوانی کی علامت تھی' جو شمالی اطالیہ کی بندرگاہوں کے ذریعہ یوپ اور ایشیا کے درمیان تجارت سے شمالی اطالیہ کو میسر آئی تھی۔ اصلاح مذہب' کا زمانہ اس وقت آیا جب جرمنی کے نوابوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے عوام کا پیسہ' کلیسا کی بجائے ان کی جیبوں میں منتقل ہونا چاہئے۔

بوسے۔ آپ غلطی پر ہیں جناب!

مارکس۔ انقلاب فرانس کی وجہ بوربون خاندان کی بداخلاقی یا موسیو والٹیئر' آپ کا طنزیہ ادب نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی' کہ تین سو سال تک ایک نیا اقتصادی طبقہ' یعنی تجارتی طبقہ' رئیسوں کا ہم سر بننے کی کوشش میں مصروف تھا' اور اس نے ان ناکارہ نوابوں سے' جو لوئی شش دہم کے دربار کی زینت تھے' کہیں زیادہ مال و دولت جمع کر لیا تھا۔ سیاسی طاقت' اقتصادی طاقت کے بعد کبھی نہ کبھی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ کامیاب انقلاب' اقتصادی فتوحات پر محض سیاسی دستخطوں کا کام کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہیرنگٹن نے کہا تھا' کہ حکومت کی ہیئت کا انحصار' زمین کی تقسیم پر ہے۔ اگر ملک کی بیشتر زمین ایک شخص کے ہاتھوں میں ہے تو نظام حکومت بادشاہت ہو گا اور چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے تو رئیسیت اور اگر عوام کے ہاتھوں میں ہے تو جمہوریت۔

گرانٹ۔ آپ کی باتیں بہت حد تک صحیح ہیں۔ غالباً زمینداروں کی تعداد (بمقابلہ' بے زمین شہریوں کے) کم ہونے کی وجہ سے امریکہ میں جمہوریت ختم ہو گئی ہے۔

مارکس۔ امریکہ کو کیوں دریافت کیا گیا تھا؟ کیا مسیحیت کی خاطر؟ نہیں' سونے کے لئے۔ انگریزوں نے اسے ہسپانوی' ولندیزی اور فرانسیسی حکام سے کس طرح چھین لیا؟ اس طرح کہ ان کے پاس بہتر جہاز بنانے کے لئے دولت تھی۔ نوآبادیوں نے انگلستان کے خلاف بغاوت کیوں کی؟ اس لئے کہ وہ غیر معقول ٹیکس نہیں دینا چاہتے تھے اور برطانیہ کے ان رئیسوں کے ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے تھے جنہیں شاہی عطیہ کے طور پر وہاں زمینیں ملی تھیں۔ کیونکہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر شراب اور غلاموں کی تجارت کرنا

Scanned with CamScanner

چاہتے تھے، اور اپنے قرض ایک کم قیمت کے سکہ میں ادا کرنے کے خواہشمند تھے۔

ولیم جیمز۔ کیا مطلب؟

مارکس۔ جناب! آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کے ایک ہم وطن پروفیسر نے اپنی تحقیقات سے امریکہ کے آئینہ نظام اور جیفرسن کے تصور جمہوریت کے اقتصادی اسباب بتائے ہیں۔ یا کبھی آپ نے ڈینیل ویبسٹر کو پڑھا ہے؟ آپ کے شاندار مقرر نے کہا تھا! ہمارے نیو انگلینڈ کے آباؤ اجداد جائداد کے معاملہ میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے حالات کا تقاضا تھا کہ زمین کو تقسیم کیا جائے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس لازمی اقدام سے ہمارے ملک کی حکومت کی تقدیر متعین ہو گئی تھی۔ ان کے سیاسی اداروں کی ہیئت جائداد کے متعلق قوانین سے متعین ہوئی تھی۔ دنیا کی آزاد ترین حکومت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کے قوانین کی رو سے حالت چند لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے اور باقی لوگ محتاج اور قلاش رہیں۔ اس حالت میں عوام کی طاقت، جائیداد کے حقوق کو توڑ دیتی ہے یا جائیداد کا اثر، عوام کی طاقت کو محدود کر دیتا ہے۔ ہمہ گیر حق رائے دہندگی اس معاشرے میں زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا، جہاں جائداد غیر مساوی طور پر تقسیم ہو چکی ہو۔"

والٹیئر۔ یہ آپ دونوں کی تقریر بیحد مؤثر ہے۔

اناطول فرانس، اس میں موسیو مارکس کے نقطہ نظر سے فقط ایک سقم ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ قوانین، جائیداد کی تقسیم میں تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو جناب! پھر آپ کا نظریہ خام ہے۔ آپ سمجھتے ہیں۔ کہ سیاسی ادارے۔ اقتصادی حالات سے متعین ہوتے ہیں اور انقلاب اسی وقت کامیاب ہوتے ہیں، جب کوئی ایسی جماعت ان کی پشت پناہی کرے جو مالی اعتبار سے مستحکم ہو۔ کیا روسی انقلاب آپ کے نظریہ کو غلط ثابت نہیں کر دیتا؟

مارکس۔ بالکل نہیں! میں ابھی اس بات کی وضاحت کر دوں گا کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سیاسی ہیئت کو اقتصادی حالات کے مقابلے میں بدلنا پڑتا ہے۔ کسانوں کے ملک میں پرولتاری انقلاب، پرولتاری نقاب پہن سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت حکومت ان لوگوں کو مفاد کی نمائندگی کرتی ہے، جو زمین کے مالک ہیں۔

اناطول فرانس۔ میرا خیال ہے، کہ بہادر باشویک، اچھے مارکسی نہیں ہیں۔

مارکس۔ میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ میں مارکسی نہیں ہوں۔

Scanned with CamScanner

والٹیئر۔ موسیو مارکس۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک فوجی آمریت کبھی کبھی کسی خاص اقتصادی طاقت کے بغیر قائم ہو سکتی ہے؟ جیسے کہ پریٹورین گارڈ کے زمانہ میں۔

مارکس۔ جناب! فقط کچھ مدت کے لئے ایسا ہو سکتا ہے۔

اناطول فرانس۔ مجھے علم نہیں کہ آپ اس چیز سے واقف ہیں یا نہیں جسے عہد جدید کے لوگ ضبط تولید کہتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ نے اس پر عمل نہیں کیا۔ کیتھولک کلیسا نے اپنے معتقدین کو اس پر عمل نہ کرنے کی تلقین کی ہے اور وہ بڑی خاموشی سے اپنی اس دانشمندانہ دور اندیشی کے نتائج دیکھ رہا ہے' یعنی پروٹسٹنٹ مذہب کے پیروؤں اور فلفسیوں میں شرح پیدائش کم ہو گئی ہے۔ اور پہلے جرمنی اور اس کے بعد امریکہ آہستہ آہستہ پھر کیتھولک ہو رہے ہیں اگر کلیسا کی یہ پالیسی کامیاب ہو گئی (اور اس کی خاموشی دور اندیشی نے کئی جنگیں جیتی ہیں) اور اگر شرح پیدائش سے اصلاح مذہب اور احیائے علوم کی تحریک ختم کر دی گئی تو کیا یہ ایک نہایت اہم واقعہ نہیں؟ لیکن یہ واقعہ تاریخ کی اقتصادی تعبیر کے ماتحت نہیں آتا۔ شاید ہمیں تاریخ کی حیاتیاتی تعبیر کی ضرورت پیش آئے۔

مارکس۔ آپ غلطی پر ہیں' جناب! ضبط تولید کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے اسباب اقتصادی ہیں۔ معیار زندگی بڑھ گیا ہے۔ شہروں میں مخلوق کی فراوانی ہے اور آپ کے ملک کے قوانین زمین' والدین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ جائداد کو اپنے بیٹوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دیں۔

گرانٹ۔ لیکن یقیناً آپ یہ بات تسلیم کریں گے کہ نسلی اسباب بعض اوقات اقتصادی اسباب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں؟

مارکس۔ ہرگز نہیں'

گرانٹ۔ تو پھر آپ ایشیا پر یورپ کے نارڈکوں کی فتح کی کیا توجیہہ کریں گے؟

مارکس- اس کی توجیہہ محض اس اتفاق کی بنا پر کی جا سکتی ہے- کہ یورپ میں صنعتی انقلاب پہلے آیا- آپ اس وقت کا انتظار کیجئے جب چین میں صنعتی انقلاب آئے اور آپ نارڈکوں کو ایشیا سے فرار ہوتے دیکھیں-

گرانٹ- لیکن میں نے اکثر (مثلاً امریکہ میں ہڑتالوں یا صدارتی انتخاب کے موقع پر) عوام کو اقتصادی وجودہ کی بنا پر نہیں، بلکہ نسلی وجوہ کی بناء پر گروہوں میں تقسیم ہوتے دیکھا ہے-

مارکس- افراد اور جماعتیں اکثر اس طرح کے غیر اقتصادی محرکات سے متاثر ہوتے ہیں جیسے نسلی، مذہبی، وطنی اور جنسی- لیکن جب ان افراد اور جماعتوں کے اعمال تاریخی طور پر اہم بنتے ہیں تو وہ ان اشخاص کے زیر اثر آ جاتے ہیں جو اپنے اقتصادی مفاد کا پورا شعور رکھتے ہیں- کیا وہ ارباب سیاست جو، جوش آفریں، تقریروں اور موسیقی کے ترنم کے ساتھ سپاہیوں کو میدان جنگ میں بھیجتے ہیں، اقتصادی محرکات سے بالکل منزہ ہوتے ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ کولمبس نے جزائر ہند کی اس لئے تلاش کی کہ وہ نئے مسیحیوں کو پاپائے روم کے حضور میں پیش کرنا چاہتا تھا- ممکن ہے، اگرچہ اسے یقین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، کہ اس مرد پیر کے ذہن میں یہ خیالات موجود ہوں- لیکن کیا آپ یہ مان سکتے ہیں کہ فرڈی ننڈ اور ازابلا نے ان وجوہ کی بناء پر اس کی معاونت کی- افراد، غیر اقتصادی محرکات کی وجہ سے عمل کر سکتے ہیں- یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے بچوں، اپنے ہم وطنوں یا اپنے دیوتاؤں پر قربان کر دیں، لیکن یہ مجنونا یا بے ربط اعمال قوموں کے عروج و زوال کو متعین کرنے کے ضمن میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے- میں اقتصادی جبریت کو افراد پر منطبق نہیں کرتا-

ولیم جیمز- مجھے آپ کی یہ بات سن کر خوشی ہوئی- میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ اخلاقی قوتیں، بھی تاریخ کی تعین میں حصہ لیتی ہے، مثلاً ولبر فورس اور گیریسن کے زیر اثر غلامی سے نفرت، لیکن آپ میرے اس خیال کی تصحیح کر سکتے ہیں-

مارکس- تاریخ میں اخلاقی قوتوں اور قدروں کی کوئی جگہ نہیں- ہر عظیم واقعہ کے پس پردہ اقتصادی قوتیں کار فرما ہوتی ہیں- محض اخلاقی وعظوں سے گیریسن غلامی کے خلاف اپنی مہم کو ترقی دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا، اور جب لنکن نے غلاموں کو آزاد کیا تو یہ ایک جنگی اقدام تھا- جنوب کو کمزور کرنے کے لئے جنوبی ریاستیں، شمالی ریاستوں سے علیحدہ ہونا چاہتی تھیں، کیونکہ ٹیکسوں سے ان کا مفاد مجروح ہوتا تھا، اور وہ کانگرس پر تسلط پانے کی

Scanned with CamScanner

طرف سے ناامید ہو چکی تھیں، شمالی ریاستیں جنوب کو اپنے سرمایہ داروں کی منڈی اور غذا اور خام مال کا ذریعہ سمجھ کر اپنے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتی تھیں۔ نصب العین کی حیثیت محض ایک نقاب کی سی ہے۔ ہر حالت میں نصب العین ایک مادی ضرورت ہے، جسے اصطلاح میں ایک اخلاقی امنگ کہتے ہیں۔

اناطول فرانس۔ کیا آپ اشتمالی نصب العین کے متعلق بھی یہی کچھ فرمانے کی زحمت گوارا کریں گے؟

مارکس۔ ہاں ہاں! یقیناً۔

اناطول فرانس۔ افسوس!

۶۔ تاریخ کی نفسیاتی تعبیر

ہیگل۔ جناب، آپ کے خیالات بہت انقلابی اور تشویشناک ہیں۔ تاریخ کے متعلق اب تک جتنے نظریے پیش کیے گئے ان میں زندگی کا ہر پہلو موجود ہے سوائے انسانی ذہن کے۔ آپ کی باتیں سن کر انسان کو یہ گمان ہونے لگتا ہے، کہ دنیا میں ذہانت اور جرات محض ناکارہ چیزیں ہیں اور چونکہ ایک ہی طرح کے جغرافیائی اقتصادی اور نسلی حالات افراد اور کبھی کبھی قوموں کو، یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احمق اور فطین انسان میں کوئی فرق نہیں۔ یا کوئی شہری عالم ہے یا جاہل، آپ کے نظام حیات میں مرد مجاہد کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

مارکس، میرے نزدیک دنیا میں مرد یا مرد مجاہد کا وجود نہیں۔ فکر، آرزو، کا سرچشمہ ہے اور قوموں اور گروہوں کی آرزوؤں کی بنیاد ہمیشہ معاشی ہوتی ہے جیسا کہ بسمارک نے کہا تھا، کہ قوموں کے باہمی روابط میں اخلاق کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور مرد مجاہد یا مرد کی حیثیت محض ایک آلہ کی ہے اور عظیم شخصیتیں عوامی تحریکوں یا غیر ذاتی قوتوں کے اظہار کا ایک وسیلہ ہیں۔ اگر وہ یہ نہیں تو وہ سمجھ لیجئے کہ وہ ایسا بے اثر دیوانہ ہے جس پر تاریخ کوئی توجہ کیے بغیر آسانی سے نظر انداز کر دیتی ہے۔ نظریات کا تاریخ سے وہی تعلق ہے جو فکر کا فرد کے عمل سے۔ دونوں صورتوں میں خیال، نتیجہ کا سبب نہیں ہوتا، بلکہ اس کا سبب وہ آرزو ہوتی ہے جس کا ضروری نہیں کہ فرد کو شعور و احساس ہو۔ حقیقت میں کسی خاص زمانے کے مخصوص تمدن کا اقتصادی زندگی کے ساتھ وہی رشتہ ہے جو خیال کا جسم کے ساتھ ہے یہ تعبیر و تاویل ہے جس سے تحریکوں اور اجتماعی قوتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ہیگل- مجھے حیرت ہے کہ ایک جرمن اس طرح کی باتیں کر رہا ہے- معلوم ہوتا ہے کہ کانٹ، ہیلیسنگ، ہرڈر گوئٹے، شیلر، بیتھوون اور میرے عہد زریں کے بعد جرمنی نے اپنی روح، صنعت میں گم کر دی- اب جرمنی ماہرین کیمیا اور کاریگر پیدا کرتا ہے، فلسفی اور فن کار نہیں- اسی لئے وہ تاریخ کی تعبیر کلوں کے نقطہ نظر سے کرتا ہے- ہماری خواہش ہے کہ گوئٹے آپ کے سامنے اپنے نظریے کی وضاحت کرے- یا ہرڈر، جس نے ۱۷۸۴ء میں اپنی کتاب "فلسفہ تاریخ انسانیت کے بارہ میں افکار" سے ہمیں متاثر کیا تھا اپنے خیالات کی توضیح کرے- وہی ہرڈر، جس نے کہا تھا کہ تمام تاریخ انسانی نسل کی تعلیم کی داستان ہے-

اناطول فرانس، تاریخ کے متعلق آپ ہمیں اپنا نظریہ بتایئے- جب میں چھوٹا تھا تو میرے ملک میں آپ کی دھوم تھی، اور کزن تو بات بات میں آپ کا نام لیتا تھا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی آپ کے فلسفہ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکا- لیکن ممکن ہے کہ یہاں، جنت کی ان وادیوں میں، ہم اسے سمجھ سکیں-

ہیگل- جناب! مجھے جان بوجھ کر ادق انداز اختیار کرنا پڑا کہ کہیں میرا فلسفہ احمقوں کے ہاتھ میں نہ آ جائے- اپنی نسل کو یہ سمجھانا آسان نہیں تھا کہ اس کائنات میں ذہانت' اسی حد تک موجود ہے، جس حد تک ہم اسے یہاں استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ خدا اتنا سبب اول نہیں جتنا کہ مقصد حیات ہے، پھر مجھے یہ باتیں اس طرح ادا کرنی پڑیں کہ محتسب مجھے گردن زدنی نہ قرار دیدے،

والٹیئر- میں آپ سے متفق ہوں، جناب! اس لئے فریڈرک کی موت کے بعد، جرمنی میں سوچنا غیر قانونی فعل سمجھا جانے لگا تھا،

ہیگل- لیکن در حقیقت، میرا فلسفہ بہت سادہ تھا- خدا حقیقت مطلق ہے اور حقیقت مطلق کائنات کی تمام چیزوں پر مشتمل ہے، جو روبہ ارتقا ہیں "خدا" عقل ہے اور عقل اس قانون فطرت کا تانا بانا ہے، جس میں تمام موجودات پھلتی پھولتی ہیں- خدا روح ہے، اور روح، زندگی ہے- تاریخ روح کے ارتقا اور زندگی کی نشوونما کا نام ہے- تاریخی عمل، روح یا زندگی کی خودشعوری یا آزادی حاصل کرنا ہے- آزادی، زندگی کی جان ہے بالکل اسی طرح جیسے کشش ثقل پانی کی- تاریخ میرے نزدیک آزادی کے ارتقا کا نام ہے- اس کا مقصد یہ ہے کہ روح مکمل طور پر آزاد ہو جائے-

والٹیئر- جناب ہیگل، یہ تو انقلاب کی زبان ہے،

ہیگل- میرا مقصد بھی یہی تھا- میں نے تاریخ کو تین واضح ادوار میں تقسیم کیا تھا

مشرقی دور، جس میں صرف فرد آزاد ہے۔ یونان و روما کا دور، جس میں چند افراد آزاد ہیں اور جدید دور، جس میں روح، اپنی آزادی کا شعور حاصل کرتی ہے، اسے ریاست میں منظم کرتی ہے تاکہ ہر شخص آزاد ہو جائے۔

مارکس۔ ہم یعنی نوجوان جرمنی کے اراکین، آپ کے اس قصور کو کبھی معاف نہیں کر سکے کہ یورپ کی سب سے زیادہ رجعت پسند ریاست پرشا کی مدح خوانی کی، لیکن ہم آپ کی مابعدالطبیعات کے پوشیدہ مطالب سمجھ گئے تھے اور آپ کی جدلیات کی اہمیت کو قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے، میرے کانوں میں ابھی تک یہ الفاظ گونج رہے ہیں، "مقدمہ، ضد مقدمہ، ترکیب" کراؤ سے ہمیں بتایا ہے کہ عہد قدیم، مقدمہ تھا، عہد جدید، ضد مقدمہ اور پولیشیا، ترکیب۔" لیکن ہم طلباء نے اس بات کو ایک اور بہتر مثال کے ذریعہ سمجھا تھا۔ یعنی، پیاس، مقدمہ شراب جو، ضد مقدمہ اور زمین پر بیہوش ہو کر گرنا، ترکیب۔

ہیگل۔ خوب ہنس لو، مجھ پر اور میرے فلسفے پر، میرے بائیں بازو کے بچو! لیکن اس بات پر بھی غور کرو کہ تمام تاریخ، تمام مابعدالطبیعات کی طرح، میری جدلیات کی روشنی میں چمک اٹھتی ہے۔ ہر عہد اپنے اندر ایک تضاد رکھتا ہے، جس طرح تمہاری سرمایہ داری کے اندر اس کا توڑ موجود ہے۔ آہستہ آہستہ وہ تضاد واضح اور شدید ہوتا رہتا ہے اور آخرکار، تفرقہ، جنگ، انقلاب اور انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ متضاد عناصر، نئے انداز سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اور نئی ہیئتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس فارمولے کی مدد سے آپ مستقبل کے متعلق پوری آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک منزل سے اس کی متضاد منزل پیدا نہیں ہوتی بلکہ دونوں کا امتزاج ایک نئی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس لئے جب سرمایہ داری اشتراکیت سے ٹکراتی ہے تو نتیجہ اشتراکیت نہیں ہوتا بلکہ ریاستی سرمایہ داری۔ انقلاب پسند سرمایہ دار بن جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ریاست کہتے ہیں۔ اور اگرچہ بہت سے لوگوں کو تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اس طرح ہماری رسائی تاریخ کی ایک اعلیٰ منزل تک ہو جاتی ہے۔

مارکس۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ نے اپنے زمانہ کے باغیوں کا خیرمقدم کیوں نہ کیا؟ کیا آپ کے نظریہ کے مطابق وہ مستقبل کے پیغمبر نہیں تھے؟ آپ نے جان بوجھ کر یہ غلط بیانی کیوں کی کہ قدیم یونان کے مقابلہ میں پرشا میں زیادہ آزادی ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ پرشا، تاریخ کی برگزیدہ ترین تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے، اور چونکہ پرشا میں ملوکیت تھی جس کے ہاتھ فرد آپ تھے، آپ نے تاریخ میں الٹ پلٹ کر کے یہ ثابت کیا کہ ادنیٰ منزل میں فقط

ایک شخص آزاد ہوتا ہے۔ گویا وہ ہے استبداد کی منزل۔ دوسری منزل جس میں چند لوگ آزاد ہوتے ہیں، رئیسیت یا جمہوریت کا دور ہے اور آخری منزل جس میں سب آزاد ہوتے ہیں ملوکیت ہے۔ خداوند! ملوکیت! آپ نے قوموں کو اس طرح ترتیب دیا، جس طرح ایک بچہ ڈاک کے ٹکٹوں کو ترتیب دیتا ہے۔ اور آپ نے یہ فارمولا بتایا کہ ترقی، تہذیب کو مغرب کی طرف دھکیل رہی ہے، اور کوئی تہذیب جس حد تک مغربی ہو گی۔ اسی حد تک ترقی یافتہ ہو گی۔ آپ نے شام کی تہذیب کو چین کی تہذیب پر ترجیح دی۔ اپنے استدلال کی رو سے آپ کو امریکہ کو جرمنی پر ترجیح دینی چاہئے تھی، لیکن آپ نے وطن پرستی کو بہتر سمجھا،

ہیگل۔ حالات کا تقاضا یہی تھا۔

مارکس۔ نہیں، جناب! چاہے آپ کہیں ہوں، حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔

اناطول فرانس۔ آپ اس طرح باتیں کر رہے ہیں، جیسے آپ حقیقت کی تہ تک پہنچ چکے ہیں۔ اتنے تیقن سے بات نہ کیجئے۔ شاید حقیقت کا کوئی وجود ہی نہیں۔

کارلائل۔ ایک بڈھے کو بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجئے، تو میں یہ عرض کروں کہ آپ نے گو مرد مجاہد کی تاریخ سے قطعی خارج کر دیا ہے، اس کے باوجود آپ بحث و تمحیص سے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ میرا خیال ہے کہ عالم گیر تاریخ یعنی انسان کے کارناموں کی تاریخ، دراصل عظیم شخصیتوں کی تاریخ ہے۔ یہ لوگ عوام کی قیادت کرتے تھے، اور ایک وسیع مفہوم میں ان کا مرتبہ خالق کا تھا۔ انہوں نے ہر اس چیز کی تخلیق کی جسے انسان نے بنایا ہے یا حاصل کیا ہے۔ ہر وہ چیز جسے ہم اپنی دنیا میں مکمل صورت میں دیکھتے ہیں، خارجی طور پر مادی انجام ہے، ان خیالات کا جو ان شخصیتوں کے ذہن میں موجزن تھے۔ ساری دنیا کی تاریخ کی روح یہی خیالات تھے۔ اگر ہم انہیں اچھی طرح جان سکیں تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے دنیا کی تاریخ کی روح کو پا لیا۔

ولیم جیمز۔ خوب! بہت خوب! آپ نے بڑی پتے کی بات کہی، کارلائل، وقت آگیا ہے کہ ہم ان افکار کی تہ تک پہنچیں جو تاریخ کے محرک ہیں۔

ہیگل۔ حضرات! جوش سے کام لیے بغیر سوچئے تو آپ بھی میری طرح اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہی افکار ہر عہد کی روح ہوتے ہیں۔ یعنی ہر عہد کے فکر اور احساس کا ایک منفرد انداز ہوتا ہے، اور تاریخ اس انداز کا نتیجہ ہے۔ عظیم شخصیتوں کا اثر و رسوخ اسی صورت میں قائم ہوتا ہے کہ وہ اس انداز فکر کے غیر شعوری آلے بن جائیں۔ اگر کوئی غیر

معمولی شخصیت، اس انداز فکر سے ہم آہنگ نہ ہو سکے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ عظیم شخصیتیں، جنہیں آئندہ نسلیں بزرگ و برتر جانتی ہیں لازمی نہیں کہ متقدمین سے عظیم تر ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ تہذیب کی تعمیر میں ان کا بھی تھوڑا سا حصہ ہے، لیکن متاخرین کی یہ خوش قسمتی ہے کہ عمارت کو استوار کرنے کے لئے آخری اینٹ رکھنے کی خدمت ان کے حصے میں آتی ہے۔ ان افراد کو اس "فکر عمومی" یا عین کا شعور نہیں ہوتا جسے وہ بے نقاب کر رہے ہوتے ہیں، لیکن انہیں اپنے زمانے کے تقاضوں کا ادراک ضرور ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ترقی کے لئے کیا چیز لازمی ہے؟ عظیم شخصیتیں اس لحاظ سے تخلیق سے زیادہ پرورش کرنے اور پروان چڑھانے کی خدمت انجام دیتی ہیں۔ وہ زمانہ کے بطن میں جو اسرار پنہاں ہیں، انہیں بے حجاب کرتی ہیں۔

کارلائل۔ جناب ہیگل۔ میں ان شخصیتوں کے متعلق تو زیادہ نہیں جانتا جنہیں آپ نے پرورش کرنے اور پروان چڑھانے والی شخصیتیں کہا ہے لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ کروموبل کے بغیر تاریخ اس سے مختلف ہوتی جیسی وہ اب ہے۔ یہی حال فریڈرک اور نپولین کا ہے۔ نپولین کا وجود نہ ہوتا تو انسان انقلاب فرانس کو کبھی عفو و درگذر کی نظر سے نہ دیکھتا۔ عظیم شخصیتوں پر یقین نہ رکھنے کا انجام دہریت ہے۔

نیطشے۔ (جیسے اپنے آپ سے) عظمت کی پرستش، دیوتاؤں کی پرستش کی مقدس یادگار ہے، لیکن کوئی شخص اب عظمت کی تعظیم اور احترام کرنا نہیں جانتا۔ دنیا میں دیوتا ناپید ہیں۔ اب ہم فوق البشر کے منتظر اور متمنی ہیں۔

والٹیئر۔ کیا یہ شخص دیوانہ ہے؟

اناطول فرانس۔ جناب! یہ مجذوب ہے۔

ولیم جیمز۔ مجھے تاریخ کے اس عظیم شخصیتوں والے نظریے سے دل چسپی ہے۔ وہ کیا اسباب ہیں، جو ہر نسل کو مختلف بناتے ہیں؟ جن کی بنا پر ملکہ این کا انگلستان، ملکہ الزبتھ کے انگلستان سے اس قدر مختلف معلوم ہوتا ہے؟ جناب مارکس کہتے ہیں، کہ یہ تبدیلیاں افراد کی رضا سے مستغنی ہوتی ہیں۔ میں یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔ یہ اختلافات افراد کی مثال ان کی جرات اور ان کے عزائم کے مجموعی اثرات سے پیدا ہوتے ہیں۔ نہیں! مسٹر مارکس، عوام، تاریخ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ وہ غیر معمولی شخصیتوں کی قیادت قبول کرتے ہیں۔ ایک ہی نسل میں بسمارک نے اس جرمنی کو، جو الہیات میں مستغرق تھا، عسکریت اور استعماریت کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ ایک ہی نسل میں نپولین نے اس فرانس پر اپنا

Scanned with CamScanner

تسلط قائم کر لیا جو تکان اور افسردگی سے عافیت پسند ہو چکا تھا، اور اپنے عمل اور ذہانت کی سحر آفرینی سے سارے ملک کو جاہ و جلال کی آرزو کا تب و تاب عطا کر دیا۔ تھیوڈر روز ویلٹ نے بھی امریکہ کو قریب قریب اسی طرح زندگی بخشی۔ میں ایمرسن کا ہم نوا ہوں، جس نے کہا تھا کہ میں چینی مینیکیس کے اس قول سے متفق ہوں کہ ایک برگزیدہ شخصیت تو نسلوں کی معلم ہوتی ہے۔

لو کے اخلاق کا ذکر سن کر بیوقوف عقلمند ہو جاتے ہیں اور متزلزل مزاج لوگ ارادوں کو مستحکم کر لیتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ میرے دوست، موسیو ٹارڈ میری بات کی تائید فرمائیں گے کیونکہ میرا تصور تاریخ، ان کے نظریہ نقل کے بغیر نامکمل ہے۔

ٹارڈ، ہاں، میرے عزیز ہم عصر، مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے۔ دنیا میں بڑے آدمی بھی ہیں اور چھوٹے بھی اور صرف بڑے آدمی ہی حالات کو بدل سکتے ہیں۔ تمام جغرافیائی، نسلی اور اقتصادی حالات کو لے لیجئے، کسی نہ کسی کو ہر تبدیلی کے لئے کوئی فیصلہ کن عمل کرنا پڑے گا، چھوٹا آدمی خوف کی وجہ سے فیصلہ کن عمل نہیں کرتا، اور غالباً وہ کبھی نہیں سوچتا کہ روایتی اعمال کے علاوہ کسی اور طرز عمل کی بھی ضرورت ہے۔ رسم و رواج اس کے لئے کافی ہوتے ہیں لیکن عظیم شخصیت ضرورت کو محسوس کرتی ہے سوچتی ہے اور حالات کو بدل دیتی ہے۔ کبھی وہ ناکام رہتی ہے، لیکن اگر وہ کامیاب ہو جائے تو اس سے کم تر آدمی اس کی پیروی اور تقلید کرتے ہیں، اور نقالی کا سیلاب سارے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ایک جاپانی تاجر نے مغربی رسم رواج کی نقل کی۔ دس نے اس کی نقل کی۔ اب سینکڑوں نے ان کی پیروی کی اور سارے جاپان کی ہیئت بدل گئی ہے۔ میں کیتھولک کیوں بنا؟ نقالی سے، میں فرانسیسی کیوں ہوں؟ جناب ہیگل میں آپ سے محض نسل اور خون کے اعتبار سے نہیں، بلکہ عادات اور زبان، رواج اور احساس و فکر کے انداز میں بھی مختلف کیوں ہوں؟ نقل و اتباع کی بنا پر، نقل و اتباع کی تاریخ، دراصل تاریخ کی جان ہے۔ اقتصادی اور جغرافیائی حالات کے پس پردہ حیاتیاتی قوتیں کار فرما ہیں، جن کی رو سے مفید تبدیلیاں کامیاب ہوتی ہیں۔ مرد عظیم تبدیلی پیدا کرتا ہے اس کا خیال، انقلاب ہے۔ روح عہد اور جغرافیائی حالات وہ فضا ہیں جس میں خیال کو کامیاب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ معمولی اور غیر معمولی انسانوں کے درمیان جنگ کا نام تاریخ ہے۔

کارلائل، آپ کا شکریہ! آپ نے بہت خوب بات کہی ہے۔

لسٹروارڈ، حضرات! میں ان خیالات میں صرف ایک بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور

وہ یہ کہ تاریخ بڑے بڑے اختراعات کی تاریخ ہے۔ اقتصادی تبدیلیوں کے پیچھے، میکانکی تبدیلیاں ہیں، اور ان کے پس پردہ سائنس کی ترقی کام کر رہی ہے اور اس کے پیچھے غیر معمولی شخصیتوں کے افکار ہیں۔ عظیم انسان، شاید تاریخ کے عظیم واقعات، جنگ، انتخاب، ہجرت کے اسباب نہ ہوں، لیکن وہ ان ایجادات اور انکشافات کے اسباب ضرور ہوتے ہیں جو دنیا کو نئی ہیئت بخشتے ہیں اور ہر نئی نسل کو اگلی نسل سے مختلف بناتے ہیں۔ علم کی نشوونما تاریخ کی جان ہے۔

بکل۔ "آپ کا ارشاد بجا ہے۔ ہر ملک کی سیاسی تاریخ اس کی ذہنی ترقی کی تاریخ میں تحلیل ہو سکتی ہے۔"

وارڈ۔ جناب والٹیئر یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ بربریت سے تہذیب کیوں کر پیدا ہوئی؟ جواب ہے کہ اختراعات سے۔ امریکہ تاریخ میں اہم انسان، امریکہ کے صدر یا سیاست دان نہیں بلکہ موجدین ہیں۔ فلٹن، وٹنی، مورس، مکورمک، رائیٹ برادران، ایڈیسن، ان لوگوں کے کارناموں کے اثرات اس وقت بھی باقی رہیں گے، جب دنیا امریکی سیاست دانوں کو فراموش کر چکی ہو گی۔ بھاپ کے انجن نے انیسویں صدی کی تعمیر کی۔ برقی قوت، کیمیا اور طیارے، بیسویں صدی کی تعمیر کر رہے ہیں۔"

مارکس۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اقتصادی تبدیلیوں کے پیچھے نئی اختراعات کام کرتی ہیں، لیکن ان اختراعات اور سائنسی تحقیق کے پیچھے اقتصادی ضروریات اور تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک ٹیکنیکل ضرورت دس یونیورسٹیوں سے زیادہ سائنسی تحقیق کو حرکت بہم پہنچاتی ہے اور ہر اختراع، ایک طویل تحقیق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ معمولی اور بسا اوقات غیر مرئی مراحل سے گزر کر پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے،

اناطول فرانس اختراعات اور ایجادات، دراصل ہماری زندگی کی ضروریات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اقتصادیات اس کا ایک پہلو ہے۔ کچھ ایجادیں اور بہت سی تاریخ، محبت کی ضرورت سے پیدا ہوئی، جس کی کوئی اقتصادی بنیاد نہیں۔ جب محبت، اقتصادیات کو چھوتی ہے تو وہ مرنے لگتی ہے اور آپ کے نظریہ کے مطابق لوگ موسیقی کی تخلیق کیوں کرتے ہیں؟

ملد کس میں اسے محض ایک حادثہ تصور کرتا ہوں۔ ہماری زندگیوں میں اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ بالکل ایسے جیسے تارکول اور صابن کی۔

نیٹشے۔ میرے نزدیک موسیقی کے بغیر زندگی ایک غلطی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اب ہم زیادہ بحث نہ کریں۔

اناطول فرانس۔ ہاں، موسیو موفسکو، موسیو بکل اور موسیو ر-ٹرل، ہم زمین پر رہتے ہیں اور اس لئے ہمیں ہمیشہ زمین کے قوانین کی پابندی کرنا پڑے گی، اگرچہ ہم اس کی حدوں کو عبور کریں گے اور کبھی کبھی ہمالیہ کے اوپر پرواز بھی کریں گے، اور یہ ممکن ہے موسیو گرانٹ، کہ چند نسلیں، کسی سازگار ماحول میں خاصی مدت رہنے کے بعد جسم خون، اور ذہنی صلاحیتوں کے نقطہ نظر سے دوسری نسلوں پر فوقیت رکھتی ہوں، لیکن ذرا ایک ہزار سال کے لئے ان بہترین نسلوں کو ادنیٰ نسلوں کا ماحول دے دیجئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے؟ جہاں تک موسیو مارکس کا تعلق ہے میں انہیں اس خیال کی ترغیب نہیں دلا سکتا کہ آپ سب بھی ٹھیک کہتے ہیں اور ان کا خیال بھی درست ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے، لیکن آپ، جناب ہیگل! عظیم شخصیتوں کی اہمیت کو تسلیم کرلیں گے اگر جناب جیمز، ٹارڈ اور کارلائل آپ کی روح عصر کو وہ فضا سمجھ کر تسلیم کرلیں، جو عظیم شخصیتوں کا انتخاب کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اپنے اپنے تصورات کے متعلق اپنے دلوں میں تھوڑا سا شبہ پیدا کرلیں تو ہم سب آسانی سے باہم متفق ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، میں عظیم شخصیتوں کا گرویدہ ہوں، قطع نظر اس کے کہ وہ تاریخ کا سبب ہیں کہ نہیں۔ میں فرانس کے دس عظیم اذہان کو باقی سارے فرانس پر ترجیح دوں گا۔ یہ یاد رکھئے، جب آپ تاریخ لکھتے ہیں تو عظیم واقعات ہمیشہ عظیم شخصیتوں کی زبانی بیان ہوتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے اعداد و شمار اور خاکوں سے ماضی مجھ پر اتنا واضح نہیں ہوتا جتنا کہ ایک عظیم انسان کی نظروں سے دیکھ کر روشن ہوتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک عظیم انسان میں وہ سارے رشتے یکجا ہو گئے ہیں، جو تاریخ کے واقعات میں منتشر تھے۔ ہم جرمنی کو بغیر گوئٹے کے، انگلستان کو بغیر شیکسپئر کے اور فرانس کو بغیر والٹیئر کے، کس طرح معاف کر سکتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں؟

والٹیئر۔ اب دیر ہو گئی ہے، آخر غیر فانی انسانوں کو بھی تو نیند آتی ہے'

۷۔ مجتمع تاریخ

جب ہم پہاڑی پر سے اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو فلپ نے کہا:۔ یہ بدھا ٹھیک کہتا ہے ان تمام نظریوں پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو وہ مہمل معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر انہیں یکجا کر دو، تو ان میں معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں تجزیہ سے عاجز آچکا ہوں۔ میں

ترکیب کا آرزو مند ہوں۔

اب میں نے کہا: آج رات سب سے زیادہ عقل کی بات والٹیئر نے کہی تھی (اور اس نے یہ بات کروچے سے چرائی تھی) کہ تاریخ صرف فلسفیوں کو لکھنی چاہئے کیونکہ وہ واقعات کو کل کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ فقرہ کہہ کر اس نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

ایریَل نے کہا:۔ لیکن تم یہ بات بھول رہے ہو کہ تاریخ کتنی طویل داستان ہے۔ کوئی انسان اتنی دیر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس ساری داستان پر محیط ہو کر صحیح مناظر پیدا کرے، خواہ وہ سبزیوں پر ہی گذارا کیوں نہ کرے۔

میں نے کہا: "یہ صحیح ہے ہمیں ماہرین کی ضرورت ہے جو ہمیں سائنس اور تاریخ کے حقائق بہم پہنچائیں۔ لیکن دونوں حالتوں میں، اگر ان حقائق میں ربط پیدا نہ کیا جائے تو نتیجہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے، فلسفہ کا سائنس کے ساتھ وہی تعلق ہونا چاہئے جو تاریخ سے اور یہ تعلق ربط کے تعلق کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہم کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر فلپ نے کہا:۔

"اس بحث سے مجھے تاریخ لکھنے کا ایک نیا انداز سوجھا ہے۔ بالعموم جب کوئی شخص تاریخ لکھتا ہے، مثلاً "تاریخ یونان" تو اس کا مطلب ہوتا ہے یونان کی سیاسی یا زیادہ سے زیادہ اقتصادی اور سیاسی زندگی۔ پھر ایک اور شخص یونان کی صنعت اور تجارت کے متعلق ایک اقتصادی جائزہ سا پیش کر دیتا ہے۔ ایک اور شخص یونانی مذہب کی تاریخ مرتب کرتا ہے دوسرا فلسفے کی، پھر ایک تیسرا ادب کی۔ اور اسی طرح اور شخص اجتماعی زندگی کی اور پھر ایک اور شخص یونانی فنون لطیفہ کی اور پھر ہم طلباء سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم ان ٹکڑوں کو جوڑیں اور اپنے ذہن میں یونان کی پیچیدہ زندگی کی ایک مربوط اور ہم آہنگ تصویر بنائیں۔ ہم سے اس کام کی توقع رکھی جاتی ہے، جو ایک فاضل مؤرخ نہیں کر سکا۔ کسی قوم کی تاریخ کو حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ ہر حصہ کو مصنوعی طریقہ سے دوسرے حصوں سے کاٹ دیا جاتا ہے اور ہم اسے صرف وقت اور تسلسل کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، اور باہمی اثر انگیزی نظر فروز تصادم اور تعاون کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ میرے نزدیک ماضی کو اس طرح بیان کرنا بڑا بے تکا پن ہے۔"

ایریَل نے کہا:۔ "منتشر تاریخ!"

میں نے شکایتاً کہا:۔ "آج کل کے مفکروں میں جرات نہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بحث کرتے ہیں، مثلاً وہ اس سوال پر بحث کریں گے کہ آیا افلاطون کا مطلب الف تھا یا

Scanned with CamScanner

ب؟ یا یہ کہ سورج آسمان پر ہے یا ہمارے دماغ میں؟ اور کیا ایک سنگترہ، تاریکی میں بھی زرد رہتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میرا خیال ہے کہ جب سے کلیسا نے انسان کو یہ بتانا چھوڑ دیا کہ وہ کیا سوچیں، وہ کائنات سے خوفزدہ ہو گیا ہے۔"

فلپ نے کہا:۔ "خیر مجھے ایک خیال سوجھا ہے۔"

"بقول ایرئیل کے تاریخ منتشر ہے، تو پھر آخر ایک مجتمع تاریخ کیوں نہ ہو؟ جس میں کوئی شخص ایک عہد کو لے کر مثلاً پیری کلیس یا والٹیئر کے عہد کو پیش نظر رکھ کر صرف ایک صدی یا ایک نسل پہ اپنی توجہ مرکوز کرے اور اس کی پوری تاریخ لکھے اور زندگی کے تمام پہلوؤں مثلاً اقتصادی، سیاسی، عسکری، سائنسی، فکری مذہبی، اخلاقی، ادبی، تمثیلی اور فنی پہلو کو ہم آہنگی اور ربط کے سانچے میں ڈھالے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم مسئلہ ارتقا سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ہم ہر چیز کو تسلسل اور عینیت کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں" مثلاً ہم یہ سمجھتے ہیں کہ افلاطون کے فلسفہ کا سبب سقراط کا فلسفہ تھا، یا ارسطو کے فلسفے کا سبب افلاطون کا فلسفہ تھا یا سپینوزا کے فلسفہ کا سبب ڈے کارٹ کا فلسفہ تھا۔ لیکن واقعات کی توجیہہ صرف ان سے پہلے واقعات ہی نہیں، بلکہ ان کے اردگرد کے واقعات بھی ہو سکتے ہیں۔ افلاطون کا فلسفہ ممکن ہے، کہ سقراط کے فلسفہ سے اتنا متاثر نہ ہوا ہو، جتنا اپنے زمانہ کے سیاسی اور ثقافتی حالات سے۔ مثلاً ان تقریروں سے جو اس نے سنیں، یا تھیٹر کی ان تمثیلوں سے جو اس نے دیکھیں، یا ان اصنام سے جو مندروں اور بازاروں میں اس کی نظر کے سامنے آئے، اور ممکن ہے ارسطو افلاطون سے اتنا نہیں، جتنا اپنے مقدونیہ کے دوستوں سے متاثر ہوا ہو۔"

ایرئیل نے کہا:۔ "بہت خوب، فلپ، "تم کمال کر رہے ہو۔" اس نے جواب دیا، "میرا مذاق نہ اڑاؤ۔" ایرئیل! میں ایک سنجیدہ بات کہہ رہا ہوں، میں مردوں اور عورتوں کے اعمال کو ان کے عہد کے ساتھ وابستہ کر کے ان میں ربط پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں ماضی کو جیسا کہ وہ تھا، یکجا کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔ نپولین کے عہد کو لو، دیکھو، کس طرح سیاسی حالات، اقتصادی حالات پر مبنی تھے، نپولین کی جنگوں کی تقدیر انگلستان کے سونے نے متعین کی اور ویلنگٹن کے پس منظر میں روتھس چائلڈ کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ دیکھو، کس طرح ان کا ادب اس زمانہ کے مذہبی اور سیاسی مسائل کی عکاسی کر رہا تھا، مثلاً شیلے، بائرن اور شاتو بریاں کا ادب۔ دیکھو کہ ان کا فن کس طرح روما کی انقلابی نقل کا منہ چڑا رہا تھا۔ ٹالما اسٹیج پر روسکیس کی طرح اکڑ کر چلتا تھا۔ موسیقی نے رومانی اور مجاہدانہ اختیار کر لی تھی۔ کس

Scanned with CamScanner

طرح بیتھوون کبھی کبھی شعوری طور پر انقلابی جذبات اور نپولین کی عظمت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ سارا عہد ایک تھا۔ صرف فرانس ہی میں نہیں، بلکہ روس کے مغرب میں سارے یورپ میں اس کی حالت ایک سی تھی۔ میں ایک عہد کی تاریخ چاہتا ہوں، جو سارے پہلوؤں پر حاوی ہو، جیسا کہ وہ اس وقت تھا جب زندہ تھا۔"

ایریئل نے کہا۔ "اس طرح کی تاریخ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا۔ "غالباً ایک عہد کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ اسی طرح ممکن ہے، جس طرح تمام عہدوں میں ایک پہلو کا مطالعہ، والٹیئر کے عہد کا مطالعہ اسی طرح ممکن ہے، جس طرح کہ گبن کی "رومی سلطنت کا انحطاط اور زوال" یا "تاریخ قوانین" یا گروٹ کی "تاریخ یونان" ممکن تھی۔ سائمنڈز نے احیائے علوم پر سات جلدیں لکھ کر وہی کیا، جس کی فلپ! تم سب مورخوں سے توقع رکھتے ہو۔"

"ہاں" فلپ نے کہا "وہ بہت اعلیٰ درجے کی کتاب ہے میں ہر عہد کی تاریخ اسی طرح چاہتا ہوں۔ تاریخ اور انسانی زندگی کے متعلق ہمارا تصور کتنا بہتر ہو جائے اگر ہم اسی قسم کی کتابیں پڑھا کریں اور اس سے بہتر یہ، کہ اگر ہم تاریخ کا اس طرح مربوط مطالعہ کریں، تو کتنے مکمل انسان بن جائیں۔ کہاں ہیں، گوئٹے، لیونارڈو اور ارسطو، جو مربوط نظریہ کے دیوتا تھے!"

"تم خود ایسی تاریخ کیوں نہیں لکھتے؟" ایریئل نے کہا "مثال قائم کرو اگر ایسا کرنا ممکن ہے تو کر دکھاؤ۔"

فلپ نے کہا۔ "میں انیسویں صدی کی تاریخ اسی انداز سے لکھنا چاہتا ہوں، اور اپنی کوتاہیوں کے پیش نظر اسے صرف یورپ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ شاید ہم تینوں مل کر یہ کام کر سکیں۔ کیا آپ میرے ساتھ شریک ہوں گے؟ دیکھو اس عہد کی ایک تمثیل بن سکتی ہے۔

پہلا ایکٹ۔ نپولین کا عہد،

دوسرا ایکٹ۔ رومانی عہد،

تیسرا ایکٹ۔ حقیقت پسندی کا عہد،

چوتھا ایکٹ۔ استعماری عہد،

پوری انیسویں صدی کو ایک تصویر میں ڈھالنا کتنا دلچسپ کام ہے۔ انیسویں صدی کے یورپ کی منتشر، پیچیدہ اور شاندار زندگی کو ربط بخشنا، ایک شاندار کارنامہ ہو گا۔"

ایریئیل نے کہا: "آؤ پھر ہم تینوں مل کر یہ کام کریں' میں خواتین کا مطالعہ کروں گی۔

تو پھر یہ کام کب شروع کریں؟"

فلپ۔ "کل"

ایریئیل نے کہا۔ "لیکن ایک بات ہے جس کے متعلق ان غیر فانی شخصیتوں کے سلسلے میں مطمئن نہیں ہوں۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ آیا تاریخ ترقی کر رہی ہے کہ نہیں؟ یا یہ کہ ہم مستقبل کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ نہیں؟"

فلپ نے کہا:۔ "دیکھو' شاید ہمیں پھر ان سے ملاقات کا موقع ملے۔"

Scanned with CamScanner

کیا ترقی سراب ہے؟

ا۔ ترقی کا آغاز

یونانیوں نے جن کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ حائل ہے، ہمیں اس بعد اور فصل کی وجہ سے ایسے لوگ نظر آتے ہیں، جنہوں نے تاریخ میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں نہایت سرعت سے ترقی کی۔ انہوں نے اپنے متنوع ادب میں ترقی کے متعلق بہت کم بحث کی ہے۔ اسکیلیس کے پرومیتھیئس میں ایک ٹکڑا ہے، جس میں پرومیتھیئس ہمیں بتاتا ہے کہ اس کے آگ کے انکشاف نے کس طرح انسانیت کو تہذیب سے آشنا کر دیا۔ اس نے ثقافتی نشوونما کی منازل کا متذکرہ پچاس سطروں میں اس انداز سے کیا ہے کہ کئی امریکی ریاستیں اسے آج غیر اخلاقی حد تک جدید سمجھیں گی۔

یورڈپڈمیس میں بھی ترقی کی طرف ایک اشارہ ملتا ہے۔ لیکن یہ تصور، زینوفن کے سقراط اور افلاطون کے یہاں بھی موجود ہے۔ اور ارسطو کی سرد مہر رجعت پسندی تو اس تصور کو خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ یونانیوں نے تاریخ کو ایک چکر سے مثال دی ہے، اور ارسطو کا یہ خیال کہ تمام فنون اور علوم، ان گنت مرتبہ ایجاد اور فنا ہوئے ہیں، تھیلیس سے لے کر مارکس اور یلیئس تک یونان کے اس نقطہ نظر کا نچوڑ ہے، جو اس نے علوم کے سلسلہ میں پیش کیا تھا۔ رواقیوں نے یہ تعلیم دی تھی کہ مستقبل سے کوئی امید نہ رکھو، حتیٰ کہ اپی کیورس کے پیرو بھی اپنی لذتوں کو ایک اداسی کے ساتھ قبول کرتے تھے اور بریڈلے کی طرح یہ محسوس کرتے تھے کہ "سب ممکن دنیاؤں میں یہ دنیا بہترین دنیا ہے، اور اس میں ہر چیز ایک لازمی بدی کی حیثیت رکھتی ہے۔" لذت پرست ہیکیساس نے زندگی کو ایک فضول اور ناکارہ چیز تصور کر کے خودکشی کی تلقین کی اور شوپنہار کی سی لمبی عمر پائی۔ آزادی کی دولت چھن جانے کے بعد یاسیت ایتھنز کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئی، لیکن روما کی تاریخ میں بھی ہر قدم پر ہمیں یہی یاسیت ملتی ہے۔ لیوکریٹس، انسانوں کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ترقی کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہمارے اس سوال کا کہ "کیا

ترقی ایک سراب ہے؟" نہایت مختصر جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے تمام چیزیں ایک ہی حالت میں رہتی ہیں، لیکن یہ عظیم شاعر اور مفکر، اگر آج زندہ ہوتا تو موجودہ تہذیب کے متعلق بھی یہی بات کہتا؟ یقیناً وہ ہماری مشینوں اوزاروں کی تعداد سے متاثر اور مرعوب ہوتا، جو ہماری ہر آرزو کو پوری کرتی ہیں۔ لیکن غالباً وہ اپنے محزوں انداز میں ہم سے یہ سوال پوچھتا کہ کیا یہ انسان، جو بڑی بڑی مشینیں استعمال کرتے ہیں، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے آباؤ اجداد سے بہتر ہیں؟ وہ اس خبر میں دلچسپی کا اظہار کرتا کہ ایک جوان بیوی نے ایک کھڑکی کے آلہ توازن سے اپنے شوہر کو قتل کر دیا، اور اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ انسانیت کو کئی صدیوں کے بعد آلات توازن کے فوائد اور استعمال کا علم حاصل ہوا ہے۔ وہ لازمی طور پر یہ کہتا کہ یہ فرق، مقاصد کا نہیں، محض ذرائع کا ہے اور یہ کہ شوہر کشی ایک قدیم صنعت ہے۔ زندگی میں جتنی زیادہ تبدیلیاں ہوتی ہیں چیزیں اتنی ہی زیادہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہیں۔ غالباً ہماری ساری ترقی وسائل اور اطوار کی ترقی ہے، مقاصد اور اعیان کی نہیں۔

دوسرے رومی لیوکریٹس سے بھی گئے گزرے ہیں، وہ محض مستقبل کو شک کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ماضی کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ ہوریس ماضی کا قصیدہ خواں ہے، ہٹیٹس اور جووینال اپنے عہد کے انحطاط کا رونا روتے ہیں، اور ورجل اپنے خوش آئند تخیل کی شدت سے نغمہ سرائی کرتے کرتے، یکایک، تواردِ ابدی کے المناک تصور میں کھو جاتا ہے۔

"پھر وہ قدیم پیغمبر، ٹیفیس پیدا ہو گا اور ایک اور جنم لے گا جو ہمارے محبوب مجاہدوں کو لے جائے گا۔ پھر جنگیں ہوں گی اور عظیم المرتبت، اکیلیس پھر ٹرائے بھیجا جائے گا۔ وقت پھر ماضی کو جدت کے القباس میں ملبوس کر کے حال میں لے آئے گا۔ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے، سب کچھ فریب ہے" اور مارکس ییلیئس انسانی وجود کا کمال حاصل کر کے یعنی اپنے اندر سیاست اور فلسفہ کا ایک خوش آئند امتزاج پیدا کرنے کے بعد لکھتا ہے:۔

"خرد مند روح تمام دنیا کا سفر کرتی ہے، اپنے گرد خلا میں گھومتی ہے اور ازل کا مشاہدہ کرتی ہے اور کائنات کی تخریب اور احیا کے ادوار پر غور کرتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں کسی نئی چیز سے روشناس نہیں ہوں گی اور ہمارے آباؤ اجداد نے ہم سے بہتر کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ ایک چالیس برس کا انسان، جو اوسط ذہانت کا مالک ہے ماضی اور مستقبل کے سب واقعات دیکھ لیتا ہے۔ دنیا میں اتنی یکسانیت ہے۔"

ترقی کے تصور کے خلاف یونانیوں کا عناد یا اس سے بیزاری کے کیا اسباب ہیں؟ کیا

اس کی وجہ ان کے تاریخی تجربہ کا اختصار تھا کہ ان کی تہذیب بہت سرعت سے اوج کمال پر پہنچی اور پھر زوال پذیر ہو گئی- یا ان کے یہاں تاریخی دستاویزوں کا فقدان تھا، جس کی وجہ سے ان میں وہ نظر پیدا نہ ہو سکی، جو انہیں ان کی ترقی کے معیار سے آگاہ کرتی- ان کے یہاں بھی زمانہ وسطیٰ آیا تھا اور ایک ہزار برس کی مدت میں وہ بربریت کی منزل سے فلسفہ کی منزل تک پہنچے تھے- اس مدت کے بعد ہی انہوں نے ادب کی تخلیق شروع کی تھی- لیکن کیا کاغذ اتنا مہنگا تھا کہ اسے محض تاریخ لکھنے پر ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا؟ یا ترقی میں عدم یقین اس سبب سے تھا کہ یونانی صنعت اپنی نشوونما میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھی اور کریٹ کے علم حرفت سے کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی تھی- یا ان مادی آسائشوں کی خاصی مقدر پیدا نہ کر سکی تھی، جو جدید "ایمان ترقی" کی بنیاد ہیں-

زمانہ وسطیٰ میں آسائشوں کی کمی نے ترقی کے تصور کو ابھرنے کا موقع نہ دیا لیکن اس وقت جنت کی امید زندگی کا مرکز تھی- حیات بعد ممات پر یقین عموماً افلاس کی شدت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے فرد میں بھی اور جماعت میں بھی- اور جب دولت آتی ہے تو بہشت بے معنی اور بے مقصد نظر آنے لگتی ہے- لیکن ایک ہزار برس تک یہ تصور لوگوں کے ذہن پر مسلط رہا-

مغربی یورپ میں احیائے علوم اور صنعتی انقلاب کے ساتھ دولت آئی، اور دولت میں اضافہ کے ساتھ ترقی کی کشش زیادہ اور نجات کی امید کم ہو گئی- جدید تاریخ کا عظیم ترین واقعہ کوپرنیکس کا یہ انکشاف ہے کہ زمین کی، عالم سیارگاں میں کوئی اہمیت نہیں- اس تصور نے بہت سی نازک روحوں کو ناخوش کر دیا، لیکن جب جنت، محض آسمان اور مکان میں تحلیل کی گئی تو انسان کی لچک دار روح نے ایک ارضی جنت میں ایمان پیدا کیا، کیمپ نیلا مور اور بیکن نے "جنت الارض" پر کتابیں لکھیں، اور عالم گیر مسرت کے لابدی ہونے کا اعلان کیا- یورپ نے آسائشیں اور لذتیں در آمد کیں اور صوفیوں اور سادھوؤں کو خارج کیا- تجارت نے شہر تعمیر کئے- شہروں نے یونیورسٹیاں بنائیں، یونیورسٹیوں نے سائنس کو ترقی دی، سائنس نے صنعت کی طرح ڈالی، اور صنعت نے ترقی کے امکانات پیدا کیے- گیرا گینٹوا نے پینٹیا گردیل کو لکھا: "تمام دنیا عالموں، فاضل مدرسوں، اور بڑے بڑے کتب خانوں سے بھری پڑی ہے" پیرڈی لارمی نے ۱۴۵۰، ۱۵۵۰ کے زمانے کے متعلق کہا: "ایک صدی میں ہم نے انسانوں اور علم و فضل کے کارناموں میں اس قدر ترقی کی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد، چودہ صدیوں میں بھی نہ کر سکے تھے" ان الفاظ میں ہمارے معاصرین کا لہجہ بول

رہا ہے۔ کس صدی نے اپنے آپ کو اس قسم کے بلند بانگ اندازوں سے نہیں یاد کیا؟ لیکن یہ خود اعتمادی احیائے علوم کی جان تھی۔ ہمیں اس کی جھلک فرانسس بیکن کی ہر نظر میں نظر آتی ہے اور یہی خود اعتمادی' ایشیائی روح کے مقابلہ میں یورپ کا طغرائے امتیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ ترقی کا تصور صنعتی اور لادین تہذیب کے لئے وہی حیثیت رکھتا تھا' جو جنت کی آرزو زمانہ وسطیٰ کی مسیحیت کے لئے رکھتی تھی۔ جدید ذہن کے لئے عزیز ترین تصور' جو ہمارے سماجی فلسفہ کا نچوڑ ہے۔ ترقی اور جمہوریت کا تصور ہے۔ اگر یہ دونوں تصورات بالائے طاق رکھ دیئے جائیں تو ہم ذہنی طور پر برہنہ اور مضحکہ خیز بن جائیں گے اور ہمارے احیا کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔

۲۔ ترقی کا عروج

ترقی کے تصور کی تعیین' اٹھارویں صدی عیسوی میں ہوئی' روسو زمانہ کی رو سے مختلف تھا۔ اس نے امریکی وحشیوں کو' جنہیں اس نے نہیں دیکھا تھا' پیرس کے ان ظالموں پر ترجیح دی' جنہوں نے اس کے اعصاب کو شدت سے متاثر کیا تھا۔ روسو کے نزدیک فکر انسان کے انحطاط کی علامت تھا۔ وہ ماضی کے عہد زریں کی تلقین کرتا تھا جس میں جنت اور ہبوط آدم کی گونج سنائی دیتی تھی۔ لیکن جب ہماری نظر ولولہ آفریں اور باہمت والٹیئر پر پڑتی ہے' تو ہمیں روشنی کے زمانہ کی خوشگوار فضا دکھائی دیتی ہے۔ اس خداوند ذہن' کو سرخ ہندیوں کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ انسان وحشیت کے زمانہ کے مقابلہ میں عہد تہذیب میں بہتر زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے وحشی انسانوں پر آہستہ آہستہ غلبہ پانے کے طرف سے اطمینان اور یقین تھا' اور وہ پیرس کو جنت پر ترجیح دیتا تھا'

اس کے پیرو' ٹرگو اور کنڈورسے ترقی کے تصور کو اپنے عہد کی روح رواں بنا دیا تھا۔ ۱۷۹۳ء میں ایک فرانسیسی رئیس کنڈورسے گلوٹین سے خوفزدہ ہو کر پیرس کے گردونواح میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ روبس پیئر نے اسے دعوت دی کہ وہ آئے اور موت قبول کرے' کیونکہ اس نے تام پین کی طرح بادشاہ کے قتل کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ ایک تنہا کمرہ میں جہاں اس کی رسائی نہ دوستوں تک تھی نہ کتابوں تک اور ایسی حالت میں کہ کوئی جانباز بھی یاسیت اور نومیدی کا شکار ہو جاتا' کنڈورسے نے ایک نہایت امید آفریں کتاب لکھی جسے ترقی پسند ادب کی ایک مستند کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔ انسان کی آئندہ عظمت کی شاندار پیشین گوئی کر کے کنڈورسے پیرس سے بھاگ کر ایک دور دراز کی دیہاتی سرائے میں جا

Scanned with CamScanner

چھپا، اور وہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر آرام سے بستر پر لیٹا اور سو گیا۔ لیکن جب وہ بیدار ہوا تو وہ سپاہیوں کی حراست میں تھا۔ دوسرے دن لوگوں نے اسے قید خانے میں مردہ پایا۔ گلوٹین کو فریب دینے کے لئے وہ اپنے ساتھ زہر کی ایک شیشی لیتا گیا تھا۔

اس کی کتاب پڑھ کے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک غمگین اور متشکک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذرا اس شخص کو دیکھئے جس نے بظاہر ہر چیز کھو دی تھی۔ جس نے اپنی دولت و ثروت، انقلاب پر نچھاور کر دی تھی، جو ان وحشیوں کا ہدف ستم تھا، جو انقلاب کے بعد برسر اقتدار تھے اور جس نے انقلاب فرانس کو جسے وہ مستقبل کی روشنی سمجھا کرتا تھا، ابتری اور انتشار پر ختم ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اس کی کتاب انسان کی امید آفرینی کا کمال تھی۔ اس سے پہلے کبھی انسان کو انسانیت پر اتنا اعتماد حاصل نہیں ہوا۔ اور نہ شاید اس کے بعد۔ دیکھئے کہ کنڈورسے طباعت کے معاملہ میں کس قدر طلاقت سے کام لیتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ چھاپا انسان کو آزادی اور حریت سے آشنا کرائے گا۔ اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ چھاپا محض حس انگیز بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "فطرت نے توسیع علم اور، آزادی، نیکی، اور حقوق انسانیت کے احترام کا باہمی رشتہ قائم کیا ہے۔ فراوانیزز، انسانوں کو انسانیت، فراخدلی اور انصاف کی طرف مائل کرے گی۔" اس کے بعد وہ روشنی کے عہد کے مشہور ترین عقیدہ کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "انسان کی صلاحیتوں کے نشوونما کی کوئی حدود نہیں ہیں۔ انسان لامتناہی طور پر کمال حاصل کر سکتا ہے۔ حصول کمال کی ترقی جو ہر اس طاقت سے بلند ہے جو اس ترقی کے راستے میں حائل ہوتی ہے اس دنیا کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔"

آخر میں وہ مستقبل کی ایک نہایت خوش آئند تصویر کھینچتا ہے۔ "علم میں اضافہ سے غلامی کم ہو جائے گی۔ طبقوں اور قوموں کی غلامی۔ پھر وہ وقت آئے گا، جب دنیا میں صرف آزاد قومیں ہوں گی، جو صرف، عقل و دانش کو اپنا آقا تسلیم کریں گی۔ اس وقت ظالم اور مظلوم، پادری اور ان کے پیرو اور معتقد صرف تاریخ کے اوراق اور تھیٹر کی سٹیج پر نظر آئیں گے۔ سائنس زندگی کی معیاد کو دوگنا تگنا کر دے گی۔ عورت مرد سے، مزدور، سرمایہ دار سے اور غلام بادشاہ کی پابندیوں سے آزاد ہو جائے گا اور شاید انسانیت جنگ کو فراموش کر دے گی۔" اور آگے چل کر وہ نہایت شدت سے کہتا ہے۔

"کتنا اہم ہے یہ نظریہ اس فلفی کی تسلی کے لئے، جو دنیا کی غلط کاری، ناانصافی اور جرم پسندی پر متاسف ہے۔ مستقبل کے اس امکان پر غور کرنے سے اسے عقل کی ترقی

اور آزادی کے قیام کی تمام کوششوں کا اجر مل جاتا ہے۔ وہ ان تمام کوششوں کو انسانیت کی تقدیر کے سلسلہ کی کڑیاں سمجھتا ہے اور اس تصور میں اسے نیکی کی صحیح خوشی اور ایک ایسی لازوال خدمت کرنے کا سرور حاصل ہوتا ہے، جسے انقلابات زمانہ نہیں مٹا سکتے۔ یہ جذبہ اس کی پناہ گاہ ہے، جہاں اس پر ظلم کرنے والوں کی یاد اس کا تعاقب نہیں کر سکتی۔ وہ تخیل میں اپنے آپ کو اس انسان سے وابستہ کر دیتا ہے، جو اپنے حقوق حاصل کر چکا ہے، جو ظلم و ادبار کا بوجھ پھینک چکا ہے۔ اور تیز قدموں سے راہ مسرت پر گامزن ہے۔ وہ اپنے دکھ بھول جاتا ہے۔ وہ آلام اور مصائب، طعن و تشنیع کی پروا نہیں کرتا بلکہ ان عقل مند اور خوش نصیب لوگوں کی محفل میں بیٹھتا ہے جن کی قابل رشک حالت اس نے اپنی سنجیدہ کوششوں سے پیدا کی ہے۔"

کتنی پر زور امید آفرینی ہے یہ! کتنی بے باک عینیت اور انسانیت کے لئے کتنی ہمدردی ان الفاظ سے ٹپکتی ہے! ہم کنڈورسے کے اس معصوم جوش و خروش کو مضحکہ خیز سمجھ کر رد کر دیں یا اپنے زمانہ کی ذہنی کم ہمتی کو، جس نے اپنے کچھ خواب پورے کر لیے ہیں، لیکن باقی خوابوں کی تکمیل کی اس میں جرات نہیں۔

اس روشن فلسفہ کے پیچھے تجارتی اور صنعتی انقلاب کارفرما تھا۔ اب نئے معجزے پیدا ہو رہے تھے۔ مشینیں، یہ مشینیں بے اندازہ مقدار میں اور نہایت سرعت کے ساتھ اور زندگی کے لوازمات اور اس کی آسائشیں پیدا کرتی تھیں۔ یہ محض وقت کی بات تھی کہ تمام اہم ضروریات زندگی پوری ہو جائیں گی اور افلاس مٹ جائے گا۔ بینتھم اور بڑے مل نے یہ سمجھا (۱۸۳۰ء میں) کہ اب انگلستان، اپنے سب باشندوں کے لئے تعلیم کی سہولتیں پیدا کر سکتا ہے، اور ہمہ گیر تعلیم سے ایک صدی کے اندر تمام سماجی مسائل سلجھ جائیں گے۔ کومٹے نے تاریخ کو تین منزلوں میں تقسیم کیا۔ دینیات سے مابعد الطبیعات اور مابعد الطبیعات سے سائنس۔ بکل کی "تاریخ تہذیب" (۱۸۵۷ء) نے یہ امید بیدار کی کہ علم کی توسیع سے تمام انسانی آلام ختم ہو جائیں گے۔ دو برس بعد ڈارون نے اپنا نظریہ ارتقا پیش کیا۔ جدید ذہن اس دنیا میں رس بس گیا اور ڈانٹے کی جنت اور روسو کا "زریں ماضی" اس دنیا داری میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ سپنسر نے ترقی کو ارتقا کے ساتھ وابستہ کر دیا اور ترقی کو زمانہ کی لازمی اور اٹل تقدیر سمجھنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر طرف سے نادر ایجادات کی بھرمار ہونے لگی، اور دولت میں اضافہ ہونے لگا۔ سائنس، جو اب دینیات کی زنجیروں سے آزاد ہو چکی تھی، ہر چیز کو ممکن سمجھنے لگی۔ سیاروں کی پیمائش ہونے لگی اور

انسان بہادری سے طیور کی پرواز کا مقابلہ کرنے لگا۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء ۱۹۱۸ء سے پہلے انسان کی صلاحیتوں کے متعلق ہر قسم کا مبالغہ آمیز عقیدہ جائز تھا۔

۳۔ ترقی یا تنزل

تاہم، دولت اور طاقت کے اضافہ کے ساتھ اور اس سرعت رفتار کے ساتھ "جو مغربی تہذیب کا طغرائے امتیاز ہے"، بعض لوگوں نے ترقی کی حقیقت یا قدر پر شک و شبہ کا اظہار کیا۔ میکاؤلی نے "احیائے علوم" کے عہد میں کہا:۔ ہر زمانہ میں، انسانوں کی دنیا یکساں رہی ہے۔ ایک ملک اور دوسرے ملک کے اختلافات سے قطع نظر، دنیا کا نقشہ ہمیشہ یہی نظر آتا رہا ہے کہ کچھ قومیں روبہ ترقی رہی ہیں اور کچھ انحطاط پذیر۔ فونٹینل نے اپنے مکالمات مردگاں میں سقراط اور مونٹین کو دوزخ میں دکھایا ہے۔ جہاں سب فلسفی ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں وہاں وہ ترقی کے تصور پر بحث کرتے دکھائے گئے ہیں۔ سقراط اس ترقی کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے، جو انسانیت نے اس کی موت کے بعد کی ہے اور وہ یہ سن کر غمگین ہو جاتا ہے کہ انسان ابھی تک وحشی ہیں۔ مونٹین اسے یقین دلاتا ہے کہ دنیا روبہ انحطاط ہے۔ اب پیریکلیس، ارسٹیڈیس اور سقراط جیسی عظیم شخصیتیں نظر نہیں آتیں۔ بڑھا فلسفی اپنے کندھے جھٹک کر کہتا ہے۔ "اپنے زمانہ میں ہم اپنے آباؤ اجداد کا بیحد احترام کرتے تھے، اور اب ہماری اولاد ہمیں ضرورت سے زیادہ تعظیم کی نظر سے دیکھتی ہے۔ درحقیقت ہمارے آباؤ اجداد میں ہم میں اور ہماری اولاد میں کوئی فرق نہیں" اور فونٹینل اس بحث کا نچوڑ یوں پیش کرتا ہے! "دل ہمیشہ یکساں رہتا ہے، عقل اپنی پختگی کی کوششوں میں مصروف ہے۔ جذبات، نیکیاں اور بدیاں اب بھی وہی ہیں لیکن علم بڑھ رہا ہے۔"

ایکرمین نے کہا: "انسانیت کی نشوونما کئی ہزار سال ہوئے شروع ہوئی تھی" گوئٹے نے جواب دیا: "شاید ممکن ہے کئی لاکھ سال پہلے شروع ہوئی ہو، لیکن جب تک انسانیت قائم ہے، اس کے راستہ میں رکاوٹیں رہیں گی اور اسے مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا تاکہ وہ اپنی قوتیں اور صلاحیتیں پختہ تر کر سکے۔ انسان زیادہ ہوشیار اور زیادہ زیرک تو ہو جائیں گے لیکن نہ بہتر یا خوش تر اور نہ عمل میں چالاک تر سوائے ایک محدود عرصہ کے لئے۔ مجھے وہ وقت نظر آ رہا ہے جب خدا انسانیت سے بیزار ہو جائے گا اور پھر ایک نئی نسل کی تخلیق کرے گا" شوپنہار نے کہا: "تاریخ کا اصل اصول ہے: ایک موضوع اور فاعل کا اختلاف" نیٹشے نے کہا: کہ "انسانیت ترقی پذیر نہیں، نہ انسانیت کا کوئی وجود

ہے۔یا دنیا ایک وسیع جسمانی معمل ہے جہاں ظالم فطرت اپنے تجربات کرتی ہے۔ جہاں کچھ باتیں ہمیشہ کامیاب ہو جاتی ہیں لیکن اکثر چیزیں ناکام رہتی ہیں" رومانوی جرمنی اس نتیجہ پر پہنچا تھا۔

ڈزرائیلی ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے سب سے پہلے مادی اور اخلاقی ترقی، طاقت میں اضافہ اور مقاصد کی بہتری کے درمیان فرق کیا تھا۔ "یورپ کے لوگ ترقی کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ چند سائنٹیفک انکشافات کی مدد سے انہوں نے ایک ایسے سماج کی طرح ڈالی ہے جو آسائشوں کو تہذیب سمجھتی ہے، مہذب یورپ خوش نہیں ہے، اس کا وجود ایک نجارہ ہے جسے وہ ترقی کا نام دیتا ہے۔ کس مقصد کے لئے ترقی؟ رسکن نے جو ایک متمول شخص تھا، ترقی اور دولت کے ہم معنی ہونے پر شک کا اظہار کیا۔ کیا یہ متمول دوکاندار یا تاجر، جانسن یا شیکسپیئر یا چاسر کے عہد کے انگریزوں سے بہتر انسان ہیں؟ کارلائل اور ٹالسٹائے نے یہ بات تسلیم کی کہ انسان نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے وسائل ایجاد کر کے بہت ترقی کی ہے۔ لیکن اس بے پناہ قوت سے کیا فائدہ جب وہ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے صرف ہوتی ہے جو پہلے کی طرح متناقض اور مہمل اور بے معنی ہیں۔

۱۸۹۰ء میں سر آرتھر بالفر نے اپنے حکیمانہ اور پرزور انداز میں کہا کہ انسانی کردار اور اجتماعی تنظیم، فکر پر نہیں (جو ترقی کرتا ہے) بلکہ احساس اور جبلت پر مبنی ہے، جو ہزاروں سال میں بھی نہیں بدلتے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ہے راز ہماری اس ناکامی کا کہ ہم اپنے بڑھتے ہوئے علم کو زیادہ خوشی اور دائمی امن حاصل کرنے کے لئے استعمال نہیں کر سکے۔ ممکن ہے، یہ پھیلتا ہوا علم ہی ہمارے عہد کی یاسیت کا سبب ہو، اہل مدرسہ نے کہا تھا! "علم میں اضافہ، اندوہ میں اضافہ کے مترادف ہے" اور ان کا جدید ہم خیال۔ اناطول فرانس کہتا ہے۔ "ساری کائنات میں سب سے زیادہ غمگین مخلوق انسان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ میرے دوست، انسان اشرف المغمومات ہے۔"

جدید صنعت کی اشتمالی تنقید نے ہمارے "ایمان ترقی" کو کسی حد تک متزلزل کر دیا۔ لوگوں کو ہمارے زمانہ کی ناانصافیوں کا احساس دلانے کے لئے اشتراکیوں نے ماضی کے امن و سکون کو سراہنا شروع کیا۔ رسکن، کارلائل، مورس، اور کروپٹکن نے زمانہ وسطیٰ کا ایسا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا، کہ ہر شخص حسرت سے یہ سوچنے لگا کہ کاش وہ کسان ہوتا، جو کھیتوں سے وابستہ رہتا، اور اپنی کاشت کا ایک مقررہ حصہ زمیندار کو دے دیا کرتا! اس کے ساتھ ساتھ جدید سیاست کی آزاد تنقید نے، ہر شعبہ میں بداخلاقی اور کم صلاحیتی کو بے

نقاب کر کے ہمیں جمہوریت کی کبریائی حیثیت پر شک کرنے پر مجبور کر دیا' جو ایک صدی سے ہماری دیوی بن چکی تھی۔ چھاپے اور عوامی اخباروں کی ایجاد نے کم تر اذہان کو بلند کرنے کی بجائے بلند فطرتوں کو گرا دیا۔ سیاست' مذہب' ادب' حتیٰ کہ سائنس پر بھی اوسط قسم کے لوگ چھا گئے۔ نارڈک علم انسان اور عزم للیقین کا فلسفہ' سوقیانہ علم اصلاح نسل اور وی اینا کی نفسیات سے مقابلہ کرنے لگا۔ صحافت نے ادب کی جگہ لے لی۔ فلم کی ایجاد نے ڈرامے کے فن کو پس پشت ڈال دیا۔ عکاسی نے مصوری کو حقیقت سے دور دھکیل کر اسے عجیب و غریب ٹیڑھی ترچھی شکلیں اور مہلک صورتیں اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ روڈاں میں بت تراش نے تراش خراش کو ترک کر کے مصوری شروع کر دی۔ بیسویں صدی میں موسیقی' چینی برتنوں کی نزاکت اور لطافت کی رقیب بن گئی۔

فن کے انحطاط اور جنگ کی آمد سے ترقی پر ہمارا ایمان متزلزل ہو گیا۔ صنعت کی توسیع اور رئیسیت کے زوال نے مل کر فنی ہیئت کو تباہ کر دیا۔ جب مشین نے کاریگر کی جگہ لی تو کاریگری ختم ہو گئی اور جب مشین نے وسیع منڈیوں کی تلاش پر مجبور ہو کر اپنی مصنوعات کو فراواں مخلوق کی ضروریات کے مطابق ڈھالا' تو کثرت' یکسانیت اور بدذوقی نے حسن اور آہنگ کی جگہ لے لی۔ اگر رئیسیت باقی رہتی اور عوام کے لئے جمالیاتی ذوق کا سرچشمہ بنی رہتی تو ممکن تھا کہ صنعت اور فن دونوں ترقی کرتے۔ لیکن جمہوریت کو سیاست اور فن دونوں میں عوام کی پسندیدگی اور قبول عام کو کسوٹی بنانا پڑا۔ لاتعداد اوسط درجے کے انسانوں کا ذوق کارخانہ دار' تمثیل نگار' فلمی منظر نگار' ناول نویس اور آخرکار مصور' صنم تراش اور معمار کا رہنما بن گیا۔ قیمت اور حجم' قدر کا میزان بن گئے۔ حسن اور قدرت فن کی جگہ جو فن کے مقاصد تھے' ایک عجیب و غریب ندرت نے لے لی۔ فن کار جو صدیوں کے تمدن یافتہ رئیس طبقہ کے ذوق کی تحریک سے محروم ہو گئے تھے' اب تصور اور عمل کے کمال کے جویا نہیں ہیں' بلکہ حیرت انگیز تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں' جس میں یقیناً ندرت اور انفرادیت ہے۔ مصوری ذہنی مرض کی علامت بن گئی۔ معماری صدیوں کے لئے نہیں بلکہ ایک محدود مدت کے لئے عمارتیں بنانے پر مجبور ہوئی اور اس طرح اپنے لئے نشوونما کی راہیں مسدود کر لیں۔ موسیقی' عوام کے گھرانوں اور کارخانوں میں جا کر' قصابوں اور خادماؤں کے اعصابی نظام کے مطابق' نئے آہنگ تلاش کرنے لگی۔ صنم تراشی' لباس کی غیر مقبولیت کے باوجود تنزل پذیر ہوتی گئی۔ اگر موجودہ زمانہ موٹریں اور چہرہ کی آرائش و زیبائش کے سامان ہمیں نہ دیتا' تو ہم یہ سمجھتے کہ بیسویں صدی میں فن بالکل مفقود ہو گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

اور پھر "جنون عظیم" کا دور آیا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کا جامہ تہذیب خطرناک حد تک نازک اور باریک ہے۔ انہیں یہ اندازہ ہوا۔ ان کا امن کتنا عارضی اور غیر محفوظ، اور ان کی آزادی کس درجہ ناتواں ہے۔ جنگوں کا تواتر اب ختم ہو گیا تھا، لیکن اس کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سائنس، جو کبھی ترقی کی ضامن تھی، اب فرشتہ اجل بن گئی تھی۔ وہ اس صفائی اور سرعت سے قتل اور خوں ریزی کرتی تھی کہ زمانہ وسطیٰ کی جنگیں کالجوں کے اکھاڑے معلوم ہونے لگی تھیں۔ سورما ہواباز، عورتوں اور بچوں پر بم پھینکتے تھے، اور ماہرین کیمیا زہریلی گیس کی ثنا خوانی میں رطب اللسان تھے۔ ایک صدی کے مترجم ادب، سائنس دانوں کے تعاون، تجارتی تعلقات اور مالی احتیاج سے جو بین الاقوامی دوستی قائم ہوئی تھی، تباہ و برباد ہو گئی اور یورپ، مختلف اقوام میں تقسیم ہو کر رہ گیا، جو ایک دوسرے کے خون کی پیاسی تھیں۔ جب یہ جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ فاتح اور مفتوح دونوں نے وہ تمام چیزیں کھو دی ہیں جن کی خاطر وہ لڑ رہے تھے، اور ایک حریص استعماریت پاٹسڈم سے منتقل ہو کر پیرس چلی گئی اور منظم اور منضبط حکومت کی جگہ جنگجو آمریت نے لے لی۔ جمہوریت گو پھیل رہی تھی لیکن مر چکی تھی۔ امید کا نام و نشان بھی مٹ گیا اور وہ نسل جس نے جنگ پر بھروسا کیا تھا، اب کسی چیز پر بھی یقین نہیں کر سکتی تھی۔ بیزاری اور کلبیت کی موجوں نے سوائے کم تجربہ یافتہ بہت پختہ روحوں کے، ہر شخص کو اپنی زد میں لے لیا۔ ترقی کا وہ تصور جس نے کبھی انسان کو ایک بے سود عینیت کی طرف مائل کیا تھا اب بے حقیقت فریب معلوم ہونے لگا۔

۴۔ چند اور فروعی باتیں

والٹیئر نے کہا تھا! "اگر تم مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو تو اپنی اصطلاحوں کی تعریف کرو" ترقی کا کیا مطلب ہے؟ اعتباری تعریفیں بے کار ہیں۔ ہم ترقی کے تصور کو کسی ایک قوم، ایک مذہب یا ایک نظام اخلاق کے نقطہ نظر سے نہیں جانچ سکتے۔ مثلاً رحم دلی میں اضافے کا تصور، نیٹشے کے جوان پیروؤں کو خائف کر دے گا۔ ہم ترقی کو خوشی کی اصطلاح میں بھی تحلیل نہیں کر سکتے کیونکہ دنیا میں احمق، ذہینوں کے مقابلہ میں زیادہ خوش ہیں۔ اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ قابل احترام شخصیتیں، خوشی نہیں عظمت کی جویا ہیں۔ کیا ترقی کی کوئی معروضی تعریف ہو سکتی ہے، جو ہر فرد، ہر اجتماع اور ہر جنس کے نقطہ نظر سے صحیح ہو؟ آیئے ہم عارضی طور پر ترقی کی تعریف یوں کریں کہ یہ ماحول پر زندگی کا بڑھتا ہوا تسلط ہے۔

ماحول آرزو کی تکمیل کے سامانوں کا نام ہے۔ اور ذہن اور مقصد کا انتشار پر' اور ہیئت اور عزم کا مادہ پر غلبہ کا دوسرا نام ترقی ہے۔

ترقی' ضروری نہیں کہ مسلسل ہو۔ اس میں تاریک ایام اور مایوس کن انحطاط کے دور بھی آ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آخری منزل بلند ترین منزل ہے تو ہم کہیں گے کہ ہم نے ترقی کی ہے۔ اور زمانوں کی قدر جانچتے وقت فکری الجھاؤ سے گریز کرنا پڑے گا۔ ہمیں دو ایسی قوموں کا باہمی موازنہ نہیں کرنا چاہئے جن میں سے ایک شباب سے گزر رہی ہے اور دوسری پختگی کی منزل کو پہنچ چکی ہے۔ کسی عہد کی بدترین صفات کا کسی دوسرے عہد کی حسین ترین صفات سے مقابلہ صحیح انداز فکر کے منافی ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ امریکہ اور آسٹریلیا جیسی نو عمر قوموں میں عام ذہنی افتاد' تنظیمی' سیاحتی اور سائنسی قسم کی ہے اور مصوری' شاعری یا صنم تراشی کی طرف مائل نہیں' تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہر عہد اور ہر مقام کو ایک خاص قسم کے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے اور ثقافتی قسم کے ذہن اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب عملی قسم کے ذہن۔ ان کے لئے پہلے راستہ صاف کر چکے ہوں۔ اگر ہمیں یہ نظر آئے کہ تہذیبوں کے دور آتے اور گزر جاتے ہیں اور انسان کے ہر فعل کا انجام فنا ہے تو ہم موت کو برحق جان کر اس بات سے اطمینان حاصل کریں گے کہ ہم نے اپنی اور اپنی قوم کی محدود زندگی میں تھوڑی بہت ترقی کی ہے' اور پہلے سے کسی قدر بہتر ہو گئے ہیں۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ آج کل کے فلسفی' افلاطون اور سقراط کے پایہ کے نہیں ہیں' یا ہمارے صنم تراش' ڈونا ٹیلو یا انجلو کا درجہ حاصل نہیں کر سکے' یا ہمارے مصور مرتبہ میں ویلاسیکوز سے کم تر ہیں۔ ہمارے شاعر اور مغنی' شیلے اور باخ کی بلندیوں تک پرواز نہیں کر سکے تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ سب ستارے ایک ہی رات کو نہیں چمکے تھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آیا کل یا اوسط انسانی صلاحیت میں پہلے کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے یا نہیں اور آج وہ بلند ترین منزل پر ہے کہ نہیں؟

جب ہم زندگی کو ایک مربوط زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنی جدید زندگی کا اس کے خطرات اور انتشار کے ساتھ' وحشی لوگوں کی زندگی سے مقابلہ کرتے ہیں جو جہالت' بربریت' آدم خوری اور امراض سے پر تھی' تو ہمیں کچھ تسکین ہوتی ہے۔ ہماری نسل کے ادنیٰ درجے کے لوگ ان لوگوں سے شاید کچھ کم ہی مختلف ہوں' لیکن ان مدارج سے اوپر ہزاروں' لاکھوں انسان ایسے ہیں' جنہوں نے ایسی ذہنی اور اخلاقی سربلندی حاصل کی ہے کہ وحشی انسان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ شہری زندگی کے پیچیدہ تانے

بانے میں ہم کبھی کبھی وحشی ایام کی خاموش سادگی کے تصور میں پناہ لیتے ہیں، لیکن غیر رومانی لمحات میں ہم جانتے ہیں کہ یہ زندگی کے فرائض سے فرار ہے، اور یہ کہ وحشت اور بربریت کی پرستش ہماری شخصیت کی ناپختگی کی علامت ہے۔ ان وحشی قبائل کی زندگی کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے بچوں کی اموات کی شرح زیادہ اور زندگی کی معیاد کم تھی۔ ان کی رفتار ست تھی۔ ان میں قوت برداشت کم تھی۔ ان کا عزم ناتواں تھا اور ان میں طاعون کی وبا اعلیٰ پیمانہ پر پھیلتی تھی۔ دوست دار اور سبک رو وحشی، فطرت سے مشابہ ہے۔ دلچسپ، لیکن کیڑے مکوڑوں اور غلاظت کے لئے دلچسپ۔

لیکن وحشی اس خیال کی تردید کر سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ تم اپنی سیاست اور اپنی جنگوں سے کس طرح لذت اندوز ہوتے ہو؟ اور کیا تم واقعی ان وحشیوں سے زیادہ خوش ہو، جن کے قبائلی نام تم علم الانسان کی کتابوں میں پڑھتے ہو؟ ترقی کے نام لیوا یہ بات تسلیم کریں گے کہ ہم نے فن پیکار میں بہت ترقی کی ہے اور ہمارے سیاست دان (سوائے دوچار کے) میلو اور کلاڈئیس کے زمانہ کے رومی سیاست دان ہو سکتے تھے، اگرچہ مسٹر کوچ، لیروی ایک زیادہ ترقی یافتہ صورت تھے۔ جہاں تک خوشی کا تعلق ہے اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی کیا حقیقت ہے وہ ایک غیر مرئی فرشتہ ہے، جو ہمارے مشاہدہ میں آتے ہی غائب ہو جاتا ہے، اور شاید ہی کوئی اس کی پیمائش کر سکے۔ خوشی اور مسرت کا انحصار پہلے صحت پر ہے، پھر محبت پر اور پھر دولت پر جہاں تک دولت کا تعلق ہے، ہم اس طرح ترقی کر رہے ہیں کہ وہ ہمارے ارباب فکر کے ضمیر پر گراں گزرتی ہے۔ جہاں تک محبت کا تعلق ہے ہم اس جذبہ میں عمق کی کمی کو ندرت اور تنوع سے پورا کرتے ہیں۔ ہماری غذا اور ادویہ کے دستور ہمیں اس خیال کی طرف مائل کرتے ہیں کہ سادہ وحشیوں کے مقابلہ میں ہم امراض سے زیادہ گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ خیال بے بنیاد ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں طبیب زیادہ ہوں گے، وہاں بیماریاں بھی پہلے سے زیادہ ہوں گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماضی کے مقابلہ میں ہمارے زمانہ میں امراض کی کثرت نہیں۔ دولت البتہ ہمارے پاس زیادہ ہے۔ ہماری دولت ہمارے لئے یہ ممکن بناتی ہے کہ ہم ان امراض کا علاج کریں، جن میں مبتلا ہو کر وحشی ان کے یونانی نام جانے ہوئے بغیر مرجایا کرتے تھے۔

صحت اور خوشی کا ایک معروضی اور قابل اعتبار پیمانہ ہمارے پاس موجود ہے، اور وہ ہے بیمہ کمپنیوں کے اموات کے اعداد و شمار۔ بعض حالات میں یہ اعداد و شمار تین صدیوں پر حاوی ہیں۔ مثلاً جنیوا میں ۱۶۰۰ء میں اوسط معیاد زندگی بیس برس تھی، اور ۱۹۰۰ء میں

چالیس برس، ۱۹۲۰ء میں امریکہ کے سفید باشندوں کی اوسط عمر ترپن سال تھی، اور ۱۹۲۶ء میں چھپن سال۔ اسی قسم کے اعداد و شمار ہمیں جرمنی سے حاصل ہوئے ہیں، ان اعداد و شمار کے مطابق جرمنی میں ۱۵۲۰ء میں اوسط عمر بیس سال تھی، ۱۷۵۰ء میں وہ تیس سال ہوئی، ۱۸۷۰ء میں چالیس سال۔ ۱۹۱۰ء میں پچاس سال اور ۱۹۲۰ء میں ساٹھ سال۔ اگر یہ اعداد و شمار، حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر زندگی ایک نعمت ہے تو ہم اس کی مقدار میں روز افزوں اضافہ کر رہے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ اس رفتار کو قائم رکھیں گے۔ حال ہی میں گورکنوں نے اپنے سالانہ اجلاس میں ان خطرات کا ذکر کیا، جو ان کے پیشہ کو عمر کا اوسط بڑھ جانے کی وجہ سے درپیش ہیں۔ اگر گورکن مغموم ہیں تو ترقی کے حقیقی ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

۵۔ تاریخ کا خلاصہ

تاریخ کے موضوع اور مواد کے سلسلے میں اب تک جو اعتراضات اور جو ترمیمات ہمارے سامنے آئیں، آیئے ان کی روشنی میں مسئلہ ترقی کو ایک مربوط زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں یاسیت پسندوں کے نقطہ نظر کی تردید قطعی غیر ضروری ہے۔ ضروری فقط اسی قدر ہے کہ ہم اس نقطہ نظر کو جس حد تک ہو سکے اپنے نقطہ نظر میں سمونے کی کوشش کریں۔ جب ہم تاریخ کو قوموں کے عروج و زوال کا ایک نقشہ تصور کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس صعود و ہبوط کے انتشار میں کچھ لمحے انسانی تاریخ کے معراج کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ یہ لمحے ترقی کے وہ مرحلے ہیں، جو کبھی ضائع نہیں ہوئے۔ آہستہ آہستہ انسان نے وحشت کی منزلیں طے کیں، سائنس کے عہد تک پہنچا۔ ترقی کے اس عہد تک پہنچتے پہنچتے اس نے جو منزلیں طے کی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے :۔

پہلی منزل : زبان نطق یا گویائی : زبان اچانک پیدا نہیں ہوئی۔ اور نہ یہ دیوتاؤں کا عطیہ ہے، بلکہ یہ ذریعہ اظہار، صدیوں کی کوششوں کے بعد، حیوانوں کی تناسلی فطرت سے شعر و شاعری کی منزل تک پہنچا ہے۔ الفاظ یا چیزوں کے عام ناموں کے بغیر، جو خاص تصورات کو ایک جماعت کی نمائندگی کرنے کی صلاحیت بخشتے ہیں، کلیے کبھی معرض وجود میں نہ آتے، اور عقل کبھی وحشت کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکتی۔ الفاظ کے بغیر، فلسفہ اور شاعری، تاریخ اور نثر سب چیزیں ناممکن تھیں۔ الفاظ کے بغیر فکر کبھی آئن شٹائن اور اناطول فرانس کی باریکیاں حاصل نہ کر سکتا، الفاظ کے بغیر نہ مرد مرد بن سکتا اور نہ عورت

عورت۔

دوسری منزل، آگ: کیونکہ آگ نے انسانوں کو آب و ہوا کی محتاجی سے رہائی دلائی، اور اسے دنیا پر محیط ہونے کی اہلیت بخشی۔ اسی کی بدولت اس کے اوزاروں کو درشتی اور پائیداری حاصل ہوئی اور ہزاروں چیزیں جو پہلے کھانے کے قابل نہیں تھیں انسان کی غذا کا جزو بن گئیں۔ اور سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ آگ نے اسے رات کا آقا بنایا۔ اور اس کے شام و سحر کے لمحات کو جگمگا دیا۔ ذرا اس زمانہ کا تصور کیجئے جب انسان نے تاریکی کو تسخیر نہیں کیا تھا، ہماری روایات اور غالباً ہمارے خون میں اب تک اس تاریخی کے خوف لرزاں ہیں۔ کبھی ہر جھٹپٹا، انسان کے لئے ایک المیہ تھا، اور انسان غروب آفتاب سے خوفزدہ ہو کر اپنے غار میں گھس جاتا تھا، اب ہم صبح سے پہلے غاروں میں نہیں جاتے۔ اگرچہ طلوع کے منظر سے محروم رہنا حماقت ہے، لیکن ان قدیم خدشات سے آزاد ہونا بھی ایک نعمت ہے۔ انسان نے جب رات کو خود ساختہ ستاروں سے روشن کیا تو اس کی روح درخشاں ہو گئی، اور زندگی میں ہما ہمی اور مسرت کے امکانات بڑھ گئے۔ ہم شاید کبھی مصنوعی روشنی کی ایجاد کا پوری طرح شکریہ ادا نہ کر سکیں!

تیسری منزل، حیوانوں کی تسخیر: ہمارے حافظے فراموش گار اور ہمارا تخیل ناتواں ہے کہ ہم یہ نہیں سوچ سکتے کہ جدید حالات میں ہم خون خوار درندوں کے حملوں سے محفوظ ہیں۔ اب حیوان ہمارے لئے تفریح کا مشغلہ اور ہماری غذا ہیں۔ لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا، جب انسان صیاد بھی تھا اور صید بھی اور غار یا کٹیا سے باہر ایک قدم رکھنا بھی اس کے لئے خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ دنیا کی تسخیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس سیارہ پر انسانیت کو حاوی کرنے کی جنگ، انسانی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ تھی۔ اس کے مقابلے میں اور سب جنگیں، معمولی خانہ جنگی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جسم کی طاقت اور ذہن کی قوت کا یہ معرکہ رزم ایک طویل مدت تک جاری رہا، اور آخرکار جب ذہنی قوت نے فتح پائی تو انسان، دنیا میں محفوظ ہو گیا، اور اب یہ حفاظت نسلاً" بعد نسل ہمیں میراث میں ملتی ہے، اور پیدائش کے وقت سے ہماری ملکیت ہے۔ اس پیکار اور اس فتح کے سامنے ہنگامی انحطاط کے لمحات کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

چوتھی منزل، زراعت: شکاری عہد میں تہذیب ناممکن تھی۔ تہذیب کے لئے ایک مستقل سکونت، ایک پائیدار طرز زندگی کی ضرورت ہے۔ تہذیب ہمیں، گھر اور مدرسہ کی بدولت حاصل ہوئی، اور گھر اور مدرسہ اس وقت وجود میں آئے جب حیوانوں کے گوشت

کے بجائے زرعی پیداوار ہماری غذا بنی۔ صیاد کو شکار مشکل سے ملتا تھا' لیکن عورت' جسے وہ گھر چھوڑ جاتا تھا' زمین کی زرخیزی میں اضافہ کرتی تھی۔ بیوی کی محنت سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ وہ مرد کے غلبہ سے آزاد ہو جائے گی' اور اپنے غلبہ کو قائم رکھنے کے لئے مرد آخر کھیتی باڑی کی بے کیف زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ انقلاب صدیوں میں رو پذیر ہوا' لیکن جب مکمل ہوا تو تہذیب کا آغاز ہوا۔ میرڈتھ نے کہا تھا کہ عورت وہ آخری مخلوق ہو گی جسے مرد تہذیب سے آراستہ کرے گا۔ میرڈتھ کی یہ بات اتنی غلط تھی کہ ایک جملے میں شاید ہی کسی نے اتنی غلط بات کہی ہو۔ اس لئے کہ تہذیب دو بڑے اسباب سے پیدا ہوئی۔ ایک گھر "جس نے وہ اجتماعی رجحانات تکمیل کو پہنچائے' جو سماج کو مربوط رکھتے ہیں۔ دوسرے زراعت' جس نے انسان کو شکار' گلہ بانی اور قتل سے باز رکھا اور اسے اتنی مدت تک ایک ہی جگہ رہنے پر مجبور کیا کہ وہ گھر مدرسے' کلیسا' کالج' یونیورسٹیاں اور تہذیب کی تعمیر کرنے لگا۔ لیکن عورت نے مرد کو زراعت اور گھر عطا کئے۔ اس نے جس طرح بھیڑوں اور سوروں کو گھریلو بنایا تھا' اسی طرح مرد کو بھی خانہ پسندی کی صفت بخشی۔ مرد' عورت کا آخری گھریلو جانور ہے' اور غالباً وہ آخری مخلوق ہے جسے عورت تہذیب سے آشنا کرے گی۔ یہ کام ابھی شروع ہوا ہے۔ ذرا اپنی غذا کو دیکھئے' اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ابھی تک شکاری عہد میں ہیں۔

پانچویں منزل' اجتماعی تنظیم : دو شخص آپس میں جھگڑ رہے ہیں' ایک دوسرے کو پچھاڑ کر قتل کر دیتا ہے اور پھر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ جو شخص زندہ ہے وہی راستی پر تھا اور جو ارا گیا ہے وہ غلطی پر تھا۔ یہ طریقہ ہمارے بین الاقوامی تنازعات چکانے میں اب بھی ستعمال ہوتا ہے۔ دو اور شخصوں کو دیکھئے' جو آپس میں جھگڑ رہے ہیں' ایک دوسرے سے کہتا ہے' چلو ہم دونوں لڑائی سے باز آئیں۔ ممکن ہے ہم دونوں اس لڑائی میں مارے جائیں۔ اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ ہم اپنا جھگڑا قبیلہ کے ایک بڈھے کے پاس لے چلیں اور اس سے فیصلہ کی درخواست کریں۔ جس وقت ایک شخص نے دوسرے سے یہ بات کہی وہ انسانی تاریخ کا ایک نہایت اہم لمحہ تھا' کیونکہ اگر دوسرا شخص انکار کر دیتا تو بربریت جاری رہتی۔ اگر وہ ہاں کر دیتا تو تہذیب انسان کے حافظہ پر ایک اور نقش چھوڑ جاتی۔ وہ نقش کیا تھا؟ انتشار کی جگہ نظم' بربریت کی جگہ تدبر اور تشدد کی جگہ قانون کا احترام۔ یہ بھی ایک عطیہ فطرت ہے جسے ہم اس لئے محسوس نہیں کرتے کہ ہم اس کی حفاظت میں پلے ہیں۔ ہم اس کی اہمیت اسی وقت محسوس کرتے ہیں' جب ہم دنیا کے ان

Scanned with CamScanner

حصوں میں سفر کرتے ہیں، جہاں ابھی تک انتشار اور بدنظمی کا تسلط ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ہمارے دارالعوام کسی خاص قدر و وقعت کے مستحق نہیں، کیونکہ وہاں اوسط ذہن کی نمائندگی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں زندگی اور جائیداد کا وہ تحفظ میسر ہے جس کی قدر ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں، کہ خانہ جنگی یا انقلاب ہمارے ملک کی وحشت اور بربریت میں تحلیل کر دے۔ آج کل کے محفوظ سفر کا مقابلہ زمانہ وسطیٰ کے یورپ کے اس سفر سے کیجئے جس میں ہر طرف راہزن تھے۔ تاریخ میں کبھی وہ ربط اور آزادی نظر نہیں آئی، جو آج کل کے انگلستان میں دکھائی دیتی ہے۔ اور شاید جب شہری اداروں میں قابل شخصیتوں کو جگہ ملنے لگے تو امریکہ میں بھی یہی صورت نظر آنے لگے۔ تاہم ہمیں سیاسی خرابیوں یا جمہوری بدنظمی سے اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ سیاست، زندگی نہیں، بلکہ زندگی کا ایک نقش ہے۔ اس کی بدعنوانیوں کی تہ میں سماج کا روایتی نظام قائم رہتا ہے۔ کنبہ میں، مدرسہ میں اور ہزاروں دوسرے اداروں میں، جو ہماری فطری انتشار پسندی کو تعاون اور نیک دلی میں تبدیل کر دیتے ہیں، ہم اس بات کا شعور نہیں رکھتے کہ ہم ایک ایسے سماجی نظام کا جزو ہیں جو سینکڑوں نسلوں کی سعی و ناکامی اور صدیوں کے علم اور دولت کا نتیجہ ہے۔

چھٹی منزل، اخلاق: یہاں ہم مسئلہ تہذیب کی شاہرگ کو چھیڑ رہے ہیں۔ کیا ہم اخلاقی طور پر وحشیوں سے بہتر ہیں؟ جہاں تک ذہانت، اخلاق کا ایک حصہ ہے ہم نے یقیناً ترقی کی ہے۔ ذہانت کا اوسط پہلے کے مقابلہ میں بہت بڑھ گیا ہے اور پختہ اذہان کی تعداد اب کہیں زیادہ ہے۔ لیکن جہاں تک کردار کا تعلق ہے ہم یقیناً مائل بہ تنزل ہیں۔ فکر کی چالاکی بڑھ گئی ہے، لیکن روح کا استحکام کم ہو رہا ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کے حضور میں ہم ارباب فکر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ ہم اپنے خیالات کی تعداد کے لحاظ سے ان سے بہتر ہیں اور ہم نے اپنے آپ کو ان اوہام سے آزاد کر لیا ہے، جو ان کے لئے اطمینان قلب کا ذریعہ تھے لیکن ہم، اپنی ہمت، اعمال و مقاصد سے وفاداری، اور شخصیت کی سادہ توانائی میں ان سے بہت پیچھے ہیں۔

لیکن اگر اخلاق کے معنی وہ خوبیاں ہیں، جن کی مسیح نے تلقین کی تھی تو ہم نے باوجود کانوں اور جھونپڑیوں کے اور باوجود جمہوری خرابیوں اور جنسی بے راہ رویوں کے مقابلے کے کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کی ہے، ہم اپنے آباؤ اجداد کے مقابلے میں زیادہ نرم دل ہیں۔ ہم میں رحم اور سخاوت کے سلوک کی، حتیٰ کہ غیر ملکیوں اور دشمنوں کے ساتھ "نسبتاً" زیادہ

صلاحیت ہے۔ ایک سال میں ہمارے ملک کے لوگوں نے سخاوت اور صدقہ کے طور پر دس کھرب ڈالر یعنی اپنے ملک کے مجموعی سکہ کا نصف خرچ کیا۔ ہم اب بھی قاتلوں کو پھانسی کی سزا دیتے ہیں، لیکن ہمارے دلوں میں اس قدیم دستور قصاص کے متعلق شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان جرائم کی تعداد، جن کے ارتکاب پر ہم یہ سزا دیتے ہیں بہت کم ہو رہی ہے۔ دو سو برس گزرے انگلستان میں ایک شلنگ چرانے کے جرم میں آدمی کو پھانسی کی سزا دی جاتی تھی۔ اور اب بھی اگر کوئی بہت بڑی چوری نہ کر سکے تو اسے سزا ملتی ہے۔ ایک سو چالیس برس گزرے سکاٹ لینڈ کی کانوں میں کام کرنے والے غلام تھے۔ فرانس میں مجرموں کو اعلانیہ طور پر اذیتیں دے کر مارا جاتا تھا۔ انگلستان میں مقروض لوگوں کو زندگی بھر قید بھگتنی پڑتی تھی اور معزز لوگ غلام پکڑنے کے لئے افریقہ کے ساحل پر حملے کرتے تھے۔ پچاس سال گزرے، ہمارے قید خانے، غلاظت اور وحشت کے انبار تھے، جہاں چھوٹے مجرم، بڑے مجرم بننے کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اب ہمارے قید خانے تھکے ہوئے قاتلوں کی سیرگاہیں ہیں۔ ہم اب بھی اپنے مزدوروں کی مزدوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن ہم "اصلاحی کام" کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ علم الارث نے، فطری انتخاب کے اس طریقہ میں جو کمزور اور ناتواں کو مٹا دیتا تھا، رحم دلی اور انسانیت کے عناصر شامل کر کے مصنوعی انتخاب کے ذریعہ توازن پیدا کر دیا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں پہلے سے زیادہ تشدد ہے حالانکہ حقیقت ہے کہ دنیا میں اخباروں کی تعداد اب پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئی ہے اور وسیع اور بارسوخ ادارے جرائم اور جنس سے تعلق رکھنے والے واقعات کی خبریں دنیا کے ہر گوشہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں، تاکہ ان کے ناظروں کے، جو دفتری کام اور یک زوجگی سے تنگ آ چکے ہیں ضمیر کی تسکین ہو سکے۔ اور ہمارے صبح کے ناشتہ کو دل چسپ بنانے کے لئے پانچوں براعظموں کی بدعنوانیاں اور سیاسیات ایک ہی صفحہ پر یکجا کر دی جاتی ہیں۔ ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا کا ایک نصف حصہ باقی نصف کو تباہ کر رہا ہے اور جو اس تباہی سے محفوظ رہتے ہیں ان میں سے اکثر خودکشی کر لیتے ہیں۔ لیکن بازاروں میں، گھروں میں، اجتماعی اداروں میں، ذرائع نقل و حرکت میں، ہمیں قاتل اور خودکشی کرنے والے نظر نہیں آتے۔ ہر طرف صرف جمہوری خوش سلوکی اور ایک بے تصنع خوش خلقی نظر آتی ہے جو اس وقت کے اخلاق سے سینکڑوں درجے بہتر ہے جب مرد مصنوعی تواضع سے کام لیتے تھے، اور جب بیت المقدس میں مسیح کے نام پر لڑنے کے لئے جاتے تو اپنی بیویوں کی عصمت محفوظ رکھنے

کے لئے انہیں زنجیروں میں جکڑ جاتے تھے۔

ہمارا دستور نکاح ' اگرچہ انتشار اور ابتری کا حامل ہے ' لیکن وہ اس دستور نکاح سے بہت بہتر ہے ' جس کی رو سے عورت یا تسخیر ہوتی تھی یا خریدی جاتی تھی۔ آج مرد اور عورت والدین اور اولاد ' استاد اور شاگرد ' کے درمیان بربریت تاریخ کے کسی اور عہد کے مقابلہ میں کہیں کم ہے۔ عورت کی آزادی اور اس کا مرد پہ تفوق ' اس مرد میں نفاست کے جذبات کی علامت ہے جو کبھی اس معاملہ میں کشت و خون سے گریز نہیں کرتا تھا۔ محبت ' جس سے وحشی انسان قطعی نابلد تھا ' اور جسے صرف جسم کی ایک بھوک سمجھتا تھا ' اب نغمہ و احساس کا ایک حسین گلستان بن گئی ہے ' جس میں مرد کی عورت کے لئے طلب ' اگرچہ اس کا سرچشمہ جسمانی ہوس ہی ہے شعر و سخن میں رنگ و بو کی بساط بچھاتی ہے۔ اور جوان جس کے گناہ اس کے عمر رسیدہ بزرگوں کو ناخوش گوار معلوم ہوتے ہیں ' اپنی چھوٹی چھوٹی خامیوں کا اس ذہنی بیتابی اور اخلاقی جرات سے کفارہ ادا کرتا ہے جن کی قدر اس وقت معلوم ہوگی جب تعلیم ہماری سماجی زندگی کو منزہ اور پاک کرنے کا فیصلہ کرے گی۔

ساتویں منزل ' اوزار : رومانی لوگوں کے مقابلے میں ' جو وحشت کی طرف مراجعت کی تلقین کرتے ہیں ' ہم اوزاروں ' انجنوں اور مشینوں کے گیت گاتے ہیں جو انسان کو حلقہ بگوش کر کے اب اسے حریت عطا کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی دولت پر شرمسار نہیں ہونا چاہئے :۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ آسائشیں اور مواقع ' جو کبھی صرف نوابوں اور جاگیرداروں تک محدود تھے ' اب ہر صاحب عمل کا حق بن گئے ہیں۔ یہ لازمی تھا کہ تہذیب کی عمارت فرصت کے لمحات پر استوار ہوتی۔ یہ بڑھتی ہوئی ایجادیں ہمیں ماحول پر قابو پانے میں مدد دے رہی ہیں۔ اب ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ ہم حیوانوں کی طرح انہیں اپنے جسموں سے منسلک رکھیں۔ ہم انہیں ایجاد کرتے ہیں ' استعمال کرتے ہیں ' اور پھر اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ ہم مہیب بازو بناتے ہیں ' جو ایک مہینہ میں وہ اہرام بنا کر رکھ دیں جن کی تعمیر کے لئے کبھی لاکھوں مزدوروں کی محنت درکار تھی۔ ہم اپنے لئے وہ عظیم آنکھیں بناتے ہیں جو آسمان پر ستاروں کی خبر لاتی ہیں اور وہ باریک بیں آنکھیں تیار کرتے ہیں ' جو زندگی کے خلیوں کو جا ٹٹولتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں ' تو براعظموں اور سمندروں کے پار خاموش آوازوں سے ہم کلام ہو سکتے ہیں۔ ہم زمین اور ہوا پر لازوال دیوتاؤں کی طرح سیاحت کرتے ہیں۔ یہ مانا کہ محض رفتار بے سود ہے ' لیکن ہمیں طیارہ اس لئے عزیز ہے کہ یہ انسانی جرات اور استقلال کی علامت ہے۔ پرومیتھیئس کی طرح مدتوں زنجیروں میں

Scanned with CamScanner

اسیر رہنے کے بعد ہم نے اب آزادی حاصل کر لی ہے اور اب ہم شاہین سے چشمک کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

نہیں، یہ اوزار ہمیں غلام نہیں بنا سکتے۔ مشینوں سے ہماری شکست محض ایک عارضی حادثہ ہے۔ وہ حقیر کام، جو کبھی آقا اور غلام دونوں کے لئے باعث ذلت تھے، اب انسانوں کے کندھوں سے اٹھا کر ہم نے فولاد اور آہن کے عضلات کے سپرد کر دیئے ہیں۔ بہت جلدی چشموں اور ہواؤں کی بابرکت طاقت، کارخانوں اور گھروں کی ملکیت بن جائے گی، اور انسان کو ذہنی کاموں کے لئے فرصت نصیب ہو جائے گی۔ غلام انسان انقلابوں کی مدد سے نہیں بلکہ ایجادوں کے ذریعے آزادی حاصل کرے گا۔

آٹھویں منزل، سائنس: بکل ٹھیک کہتا تھا، ہم محض علم میں ترقی کرتے ہیں۔ اوری دوسری برکتیں ذہن کی روشنی سے پیدا ہوتی ہیں۔ تحقیق کی بے نام شرافت میں اور دارالعمل کی خاموش جنگوں میں ایک ایسی داستان پنہاں ہے، جو سیاست کی بدعنوانیوں اور جنگ کی بے سود خونریزی کی یاد بھلا دیتی ہے۔ اس قلمرو میں انسان اشرف المخلوقات معلوم ہوتا ہے اور تاریکی اور ستم گری کے بادلوں کو چیرتا ہوا سرچشمہ نور تک جا پہنچتا ہے۔ اسے ذرا اس ننھے سیارہ پر کھڑا دیکھئے۔ وہ کس طرح ان اجرام فلکی کی پیائش، اور تحلیل کرتا ہے، جو اس کی حد نظر سے بہت دور ہیں۔ وہ کرۂ ارض، سورج اور چاند کے انقلابات کی پیش گوئی اور دنیاؤں کی پیدائش اور موت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یا ذرا اس ماہر ریاضی کو دیکھئے۔ کس طرح وہ الجھی ہوئی راہوں سے نئے اصول نکالتا ہے اور ان گنت ایجادوں کے لئے راستہ صاف کرتا ہے، جو ہماری نسل کی طاقت میں اضافہ کرتی ہیں۔ یہ ایک پل ہے، چار فولادی چادروں پر لاکھوں ٹن لوہا معلق ہے جو ساحل کو ساحل سے ملاتا ہے، اور کروڑوں انسانوں کی گزرگاہ بنتا ہے۔ یہ بھی شاعری ہے، شیکسپئر کی شعری کی طرح زور دار۔ یا اس شمر نما عمارت کو دیکھئے، جو بڑی بیباکی سے فلک کی طرف اٹھ رہی ہے جو ہماری دور اندیشی کی بدولت پیچ و خم کے ہر خطرہ سے محفوظ ہے، اور رات کو ہیرے کی طرح جگمگاتی ہے، یہاں طبیعات میں نئی ابعاد نئے عناصر، نئے ذرے، اور نئی قوتیں ہیں۔ یہاں چٹانوں پر زندگی کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ یہاں دارالعمل میں حیاتیات ذی حیات کائنات کو بدل رہی ہے، جس طرح طبیعات نے مادہ کو تبدیل کر دیا تھا۔ ہر جگہ آپ کو اس قسم کے منکسرالمزاج اور گمنام شخص مطالعہ اور مشاہدہ میں مستغرق دکھائی دیں گے۔ یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ان لوگوں کی سپردگی اور انہماک کو کون سی محرکات نشوونما بہم پہنچاتی ہیں۔ جب ان کی کوششیں

پھل لائیں گی تو وہ مر چکے ہوں گے، لیکن اس کے باوجود وہ کوشش کیے جاتے ہیں۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ جس طرح انسانوں نے مادہ کو مسخر کیا ہے وہ اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکا۔ ترقی کے حق میں ہمارا سارا استدلال اس جگہ پر متزلزل نظر آتا ہے۔ نفسیات نے ابھی تک انسان کے عمل کو بدلنا تو درکنار سمجھا بھی نہیں۔ ابھی تک وہ تصوف، مابعدالطبیعات، تجزیہ نفسی، نظریہ کردار، اساطیر الغدود، اور عنفوان شباب کے دوسرے امراض میں مبتلا ہے۔ محتاط بیانات صرف وہی ماہرین نفسیات کرتے ہیں، جن کے متعلق ہم عموماً کچھ سنتے ہی نہیں۔ ہمارے وطن میں انتہا پسند بیانات کے لئے جمہوری جنون ہر سائنس کو فیشن بنا دیتا ہے، لیکن نفسیات ان امراض اور طغیانیوں پر قابو پا لے گی۔ وہ دوسری سائنسوں کی طرح ذمہ داریاں سنبھال کر پختگی اور معراج حاصل کرے گی، اگر کوئی دوسرا بیکن پیدا ہو کر اس وسعت اور اسلوب مشاہدہ کو متعین اور محدود کر دے تو ہم میں سے کون، ان ہنگامہ پرور انکشافات کی حد بندی کر سکتا ہے جو علم ذہن کے ذریعہ ہم تک پہنچ سکتے ہیں؟ حال ہی میں انسان اپنے خود ساختہ ماحول سے توجہ ہٹا کر خود اپنی طرف دیکھنے لگا ہے۔

نویں منزل، تعلیم: ہم اپنے تجربات کا سرمایہ اگلی نسل کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں بخش رہے ہیں۔ یہ تعلیم ہمارے زمانہ ہی میں ایجاد ہوئی ہے، سب کے لئے مدرسوں کے سامان اور تعلیم اور تدریس کی سہولتیں بہم پہنچانے پر خاصی دولت اور محنت صرف ہوتی ہے۔ غالباً یہی ہمارے زمانہ کا اہم ترین پہلو ہے۔ کسی زمانہ میں کالج ایک عیاشی سمجھے جاتے تھے۔ کالج کی تعلیم فقط امیر طبقہ کے مردوں کو میسر آ سکتی تھی۔ آج یونیورسٹیاں اتنی متعدد ہیں کہ ہر شخص پی ایچ ڈی بن سکتا ہے۔ گو ہم نے قدیم زمانہ کے بہترین اذہان پر تفوق حاصل نہیں کیا لیکن ہم نے انسانی علم کے اوسط معیار کو ضرور بلند کر دیا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کا ذکر چھوڑیئے، ایتھنز کی بیوقوف، مجنون اور وحشی مجلس کا تصور کیجئے۔ اس کے عوام اس کی مذہبی رسوم، اور اس کی مجبور اور مقہور عورتوں کے متعلق سوچیے، جو صرف طوائف بن کر ہی تعلیم حاصل کر سکتی تھیں۔

صرف کوئی بچہ ہی یہ شکوہ کر سکتا ہے کہ ان مدرسوں اور یونیورسٹیوں نے جہاں دونوں جنسیں تعلیم پاتی ہیں ابھی تک دنیا کی تعمیر نو نہیں کی۔ تاریخی نقطہ نظر سے تعلیم کا یہ تجربہ ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔ اس کو ابھی اتنا وقت نہیں ملا کہ اپنی قدر و اہمیت کو ثابت کر دکھائے۔ وہ دس ہزار برس کی جہالت اور اوہام پرستی کو ایک دن میں تو دور نہیں کر سکتا،

Scanned with CamScanner

ہاں یہ ممکن ہے کہ جہالت کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش اور عام انتخاب کے ذریعہ عقائد کی تعین، بالآخر تعلیم پر حاوی ہو جائے۔ ترقی کے اس اقدام کے بارے میں ہم ابھی یہ نہیں کہہ سکتے، کہ یہ انسانیت کا ایک مستقل کارنامہ ہے، لیکن مفید نتائج ابھی سے نظر آرہے ہیں۔ لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ ذہنی برداشت اور آزادی امریکہ کے شمال میں زیادہ ہے اور جنوب میں کم؟ اس کی محض یہی وجہ نہیں کہ ابھی تک جنوب کے پاس اتنی دولت نہیں کہ وہ کافی مدرسے تعمیر کر سکے۔ شاید ہمارے سیاسی عہدوں میں اوسط قسم کی شخصیت کی مقبولیت اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ ان خطوں سے منتخب ہوتے ہیں، جہاں اقتصادی ضروریات اور سیاسی تصرف ذہن کی تربیت کی مہلت نہیں دیتے۔ ہماری تعلیم کے نتائج اس وقت کیا ہوں گے جب ہم میں سے ہر شخص بیس برس کی عمر تک تعلیم پائے گا اور اس کے بعد انسانیت کے ذہنی خزانے اس کے لئے کھلے ہوں گے۔ پھر ذرا جبلت مادری پر غور کیجئے۔ سب صحت مند والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد ان سے بہتر ہو۔ یہ ہے انسانی ترقی کے پیچھے قوت، جو کسی آئین سازی یا اخلاقی تدریس سے کہیں زیادہ معتبر ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت پر مبنی ہے۔ عنفوان شباب کا عہد طویل تر ہوتا جاتا ہے۔ ہم نے ابتدا بے بسی سے کی لیکن ہم آہستہ آہستہ اس اعلیٰ انسان کی طرف ترقی کر رہے ہیں، جو ہماری تاریک روحوں سے پیدا ہو گا۔ ہم تہذیب کا خام مال ہیں۔

ہمیں تعلیم سے نفرت ہے کیونکہ ہمیں جوانی میں اس کی اصل ہیئت سے واسطہ نہیں پڑا تعلیم محنت شاقہ سے حقائق یکجا کرنے کا نام نہیں، بلکہ عظیم شخصیتوں سے تعارف اور شناسائی کا نام ہے۔ یہ محض روزی کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ دنیا کو سمجھنے، اس پر تسلط پانے اور اس کی قدر پہچاننے کا وسیلہ ہے۔ اس کی پوری تعریف یہ ہے کہ یہ انسانیت کی سائنسی، ذہنی، اخلاقی اور فنی میراث کو اکثر لوگوں تک صحیح طور پہنچانے کا نام ہے۔ جس میراث کے ذریعہ نسل، فرد کی تربیت کرتی ہے اور اسے انسانیت بخشتی ہے۔ ہم پیدا ہوتے ہی انسان نہیں بن جاتے۔ ہم پیدائش کے وقت مضحکہ خیز اور بدبودار حیوان ہوتے ہیں۔ ہم انسان بنائے جاتے ہیں۔ ہم پر، ان سینکڑوں راہوں سے انسانیت تھوپی جاتی ہے، جن کے ذریعہ ماضی ہماری ذہنی اور ثقافتی میراث کو حال میں منتقل کرتا ہے، اور اس میراث کی بقا، ہمارے جہلا اور حمقا کے باوجود، ہمیں ہر عہد گذشتہ پر فوقیت عطا کرتی ہے۔

دسویں اور آخری منزل، تحریر اور طباعت۔ یہاں بھی ہمارا تخیل کمزور ہے۔ ہم جہالت، نامردی اور خوف کے ان زمانوں کو پوری طرح یاد نہیں کر سکتے، جو ادب کی ایجاد

سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ان زمانوں میں انسان اپنے علم کو فقط زبان ہی کے ذریعہ اپنی اولاد تک منتقل کرتے تھے۔ اگر کوئی نسل بھول جاتی یا غلط فہمی سے کام لیتی، تو اسے علم نئے سرے سے حاصل کرنا پڑتا۔ تحریر نے ذہنی کارناموں کو ایک مستقل حیثیت عطا کی۔ اس نے ہزاروں سال تک افلاس اور واہمہ پرستی کے ادوار میں بھی، فلسفہ کی حکمت اور تمثیل اور شاعری کے حسن و جمال کو محفوظ رکھا۔ اس نے مختلف نسلوں کو مشترکہ میراث کے ذریعہ یک جا کر دیا۔ اس نے وہ قلمرو ذہن تخلیق کی، جس میں عظیم شخصیتوں کی عظمت ضائع نہیں جاتی۔

جس طرح تحریر نے نسلوں کو ملایا، اس طرح طباعت نے اپنی ہزار خامیوں اور خرابیوں کے باوجود تہذیبوں کو ہم آہنگ کیا۔ اب یہ لازمی نہیں ہے کہ اس کرۂ ارض کی فنا سے پہلے ہماری تہذیب ختم ہو جائے۔ تہذیب اپنا مقام بدل لے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر ملک کی زمین، غلط کاشت کاری سے بنجر ہو جائے گی، اور نئی زمینیں ہر نسل کے بہترین افراد کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ لیکن تہذیب کوئی مادی حقیقت نہیں ہے۔ یہ سائنسی علم اور ثقافتی تخلیق کا مجموعہ ہے اور چونکہ یہ دوسری سرزمینوں پر منتقل ہو سکتے ہیں اس لئے تہذیب کی فنا لازمی نہیں۔ وہ محض اپنے لئے ایک نیا گھر بنا لیتی ہے۔ فقط حکمت اور حسن ہی بقا کے مستحق ہیں۔ مفکر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا آبائی شہر قائم رہے۔ وہ اس بات پر مطمئن ہے کہ اس شہر کے کارنامے انسانیت کی مستقل میراث بن جائیں۔

اس لئے ہمیں مستقبل کے بارے میں مایوسی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ ہم جنگوں سے تنگ آ چکے ہیں اور اس ذہنی تکان میں سپنگلر کی اس پیش گوئی پر ایمان لے آتے ہیں کہ مغربی تہذیب ختم ہونے والی ہے، لیکن تہذیبوں کے عروج و زوال کا یہ عالمانہ خاکہ ضرورت سے زیادہ نفیس ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل اس مہذبانہ یاسیت کا مضحکہ اڑائے گا، پہلے بھی جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ جو اس جنگ عظیم سے زیادہ ہولناک تھیں۔ انسان اور تہذیب پھر بھی زندہ رہے۔ واٹرلو کے پندرہ برس بعد، شکست خوردہ فرانس نے وہ عظیم اذہان پیدا کئے کہ پیرس کا مفلس علاقہ ان سے بھر گیا۔ ہماری تہذیب اور تمدن کی میراث کبھی اتنی محفوظ نہیں تھی، اور نہ کبھی ذہنی طور پر اتنی متمول تھی، جتنی اب ہے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اس میراث میں اضافہ کریں اور اسے آئندہ نسلوں تک منتقل کریں اور یہ یقین رکھیں کہ وقت اس کی خرابیوں کو فنا کر دے گا اور اس کی حسین اور باقدر صفات بہت سی نسلوں کو روشن ضمیری دینے کے لئے قائم و دائم رہیں گی۔

Scanned with CamScanner

باب شانزدہم

تہذیب کی تقدیر

۱۔ اعصابی دور

۱۸۱۸ء میں شوپنہار نے اپنی کتاب "دنیائے عزم و فکر" تصنیف کی۔ انسان کا ترقی اور تہذیب پر جو یقین اور ایمان ہے یہ تصنیف اس پر ایک زور دار اور جامع حملہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۸۲۱ء میں کیٹس دق اور مایوسی سے جاں بحق ہوا، اور مرنے سے پہلے وہ مکمل شاعری تخلیق کی جو خزاں کی پژمردہ کلیوں کی مہک اور فریب زدہ آرزوؤں کے المیہ سے گراں بار ہے۔ ۱۸۲۲ء میں شیلے، شاید اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کے بغیر ڈوب کر مر گیا۔ بقول سیزر کے وہ "کافی مدت زندہ" رہ چکا تھا۔ اور یورپ میں آزاد خیالی کی ہمہ گیر شکست کے بعد اس نے زندہ رہنا گوارا نہیں کیا۔ ۱۸۳۴ء میں بائرن مرگی کے مرض میں مبتلا ہو کر مرگیا۔ اس دنیا کو جس کا نقشہ اس نے "ڈان ژادن" میں شدید طنز کے ساتھ کھینچا تھا، اس نے خوشی اور اطمینان کے ساتھ خیرباد کہا۔ ۱۸۳۵ء میں ڈی موسے نے اپنی کتاب "نمائندہ صدی کے اعترافات" شائع کی جس میں اس نے اس "تباہ حال دنیا" اور مایوس لوگوں کا ذکر کیا۔ ۱۸۳۷ء میں پشکن نے روس میں اور لیوپارڈی نے اطالیہ میں یاس آفریں شاعری کر کے وفات پائی۔ مختصر یہ کہ اس نسل کے اکثر لوگ یاس پسند تھے۔

لیکن ۱۸۵۰ء تک یورپ کی توانائی پھر زندہ ہوئی، اور زندگی اور ادب کی تحریک نے دوبارہ جنم لیا۔ ایجادات نے صنعتی فتوحات کی طرح ڈالی۔ مشینوں نے انسان کو لمحات فرصت عطا کرنے شروع کئے اور ریل گاڑیاں اور دخانی کشتیاں، قوموں اور تہذیبوں کو اشیاء اور افکار کے مبادلہ سے متحد کرنے لگیں۔ یہی زمانہ جدید ڈرامے کی انقلابی فتوحات کے آغاز کا دور ہے جس میں ہیوگو نے ۱۸۳۰ء میں ہرنانی لکھا، اور ۱۸۲۸ء میں ابسن پیدا ہوا۔ انہیں دنوں بالزاک اور سٹینڈ حال ناول کو درجہ کمال تک پہنچا رہے تھے۔ ہائنے اور ہیوگو شعر و سخن اور سینٹ بیویو اور ٹین تنقید نگاری کی تکمیل میں مصروف تھے۔ ٹنی سن اور براؤننگ نے اپنے پہلے دیوان شائع کئے۔ ڈکنز اور تھیکرے کی رقابت کا آغاز ہوا۔ ترجنیف،

دوستووسکی، اور ٹالسٹائے روس میں پھل پھول رہے تھے۔ ڈیلا کروا، مصوری میں قدامت پرستی کے خلاف اپنی پہلی جنگیں لڑ رہا تھا اور ٹرنر انگلستان کو آفتاب کی شعاعوں سے لبریز کر رہا تھا۔ ڈارون، جدید سائنس کے اہم ترین معرکہ کے لئے مواد جمع کر رہا تھا۔ اسپنسر ایک نیا فلسفہ تعمیر کرنے میں مصروف تھا، اور رینان نے ایک بہتر دنیا کی امید میں اپنی کتاب "سائنس کا مستقبل" لکھی۔ مختصر یہ کہ ہر طرف احیا کا دور دورہ تھا۔

اس موت و حیات، تہذیب اور تعمیر کے پس منظر میں ہمیں جنگ کے بعد کی یاسیت کو سمجھنے اور اسے قابل عفو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ واقعات کا پس منظر حقائق کے ادراک کا واحد طریقہ ہے۔

یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ جنگ عظیم ہمارے فکری حزن کا واحد سبب ہے۔ جنگ نے محض ان افکار اور احساسات کو نمایاں کیا، جو اس صدی کے اوائل سے ابھرنے شروع ہو گئے تھے، سپینگلر نے اپنی عظیم کتاب "انحطاط مغرب" کا خاکہ ۱۹۱۴ء میں یعنی جنگ سے پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ لیکن جونہی جرمنی نے شکست کھائی، اس نے اس کتاب کو نیٹشے کے بعد اہم ترین فلسفیانہ طرز فکر کی بنیاد سمجھنا شروع کر دیا، مسٹر مینکن کو کبھی اپنے عہد سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، اور نہ انہوں نے کبھی مستقبل سے کوئی توقعات وابستہ کی تھیں۔ لیکن جنگ کی بربریت اور امن کی کلیت کے بعد امریکہ کے ہزاروں نوجوانوں نے انہیں اپنے طرز فکر اور انحطاط پذیر تہذیب سے تنافر کا بہترین نمائندہ قرار دیا۔ جنگ کے بعد کا یورپ ہی، کیسرلنگ کے فلسفہ کو جو مہاتما بدھ اور کنفیوشس کی صدائے بازگشت تھا، آمادگی اور انہماک سے سن سکتا تھا۔ اور جب اس نے ہمیں یہ یقین دلایا کہ پرانی تہذیب ختم ہو رہی ہے تو اس کے خلاف احتجاج کی آواز نحیف تھی۔ ڈین انج اور ہلیئر .بیلک صرف اسی بات پر متفق ہیں کہ تہذیب کا خاتمہ قریب ہے۔

بہت سے اسباب نے مغرب کو اس غیر روائتی انکسار پر مائل کیا تھا، ہنری ایڈمس نے قوت کی تذلیل کے تصور پر یاسیت کی بنیاد رکھی۔ میڈیسن گرانٹ نے یہ قدرے معقول استدلال کیا کہ نارڈک نسل جنگ کی وجہ سے تعداد میں کم، اثر مناکحت سے ناتواں، روی نسل سے ضعیف اور ایشیا کی بغاوت، اور جمہوریت سے ختم ہو رہی ہے۔ لوتھروب سٹوڈرڈ نے ان خیالات کی تبلیغ پوری قابلیت سے اور ایک ایسے لہجہ میں کی جس میں احتیاط کے پہلو کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی اور پروفیسر میکڈوگل نے بھی اس عام نوحہ گری میں اپنی لے شامل کردی۔ اسی زمانہ میں عظیم ماہر مصریات، پروفیسر فلنڈرز پیٹری نے یہ اعلان

Scanned with CamScanner

کہا کہ ایک نئی تہذیب کی تخلیق کے لئے لازمی ہے کہ مختلف نسلیں آپس میں مل جائیں۔
لیکن اس نے بھی یہ محسوس کیا کہ اس اشتراک نسل سے مغربی تہذیب ختم ہو رہی ہے۔
اس کا خیال تھا کہ تہذیب ۱۸۰۰ء میں اوج کمال پر پہنچ چکی تھی اور انقلاب فرانس کے بعد
اس کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ چار یا پانچ صدیوں میں ایک نئے نسلی امتزاج سے ایک نئی
نسل پیدا ہو گی۔ جو ایک نئی تہذیب کی داغ بیل رکھے گی۔

سپنگلر بھی قدیم زمانہ کا ذکر رومانیت کے افسردہ انداز میں کرتا ہے اس لئے کہ اس نے
اپنی پیٹھ پر روسو کی طرح سافتی نظام کے زخم نہیں کھائے تھے' وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب
کے وجود کے لئے :

"۱۸۰۰ء کے لگ بھگ انقلاب کا زمانہ آیا' زندگی کی ایک حد پر' زندگی بھرپور اور خود
اعتماد تھی' وہ داخلی تقاضوں کی بدولت' گوتھک طفولیت سے گوئٹے اور نپولین تک مسلسل
ارتقا کی مظہر رہی۔ لیکن دوسری حد پر ہمارے عظیم شہروں کی خزاں اور' مصنوعی اور بے
جان زندگی ہے' جس کے سانچے عقل و خرد نے بنائے ہیں۔ آج ہمارے کام' انتخاب کو
قائم رکھنے اور بہتر بنانے سے متعلق ہیں۔ کوئی عظیم جاندار تخلیق کرنے کی بجائے یونان کے
عہد زوال کے سکندری مہندسین کی طرح ہم تفاصیل اور فروعات جمع کرنے میں مصروف
ہیں۔ جو شخص یہ نہیں سمجھتا کہ یہ انجام لابدی ہے اور اس میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔
وہ تاریخی شعور سے نابلد ہے۔"

ہم ختم ہو چکے ہیں' یا بقول اس غیر متزلزل جرمن کے مابعدالطبیعاتی ضروریات نے
ہمارا خاتمہ کر دیا ہے۔ سپنگلر کو افادیت پر اعتقاد نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی ان
دلائل کے مطابق رواں دواں ہے' جنہیں منطق کبھی نہیں سمجھ سکتی۔

۲۔ اقوام کی فنا

تاہم سپنگلر کے نظریہ کی حمایت میں ہمارے پاس کافی شہادت موجود ہے۔ یہ شہادت
مابعدالطبیعات پر مبنی نہیں' کیونکہ مابعدالطبیعات کو آسانی سے مسترد کیا جا سکتا ہے۔ یہ
شہادت' تاریخ کی آساس پر قائم ہے' اور اگر تاریخ دروغ گوئی سے کام نہ لے تو وہ ناقابل
تردید ہے۔ تاریخ' جس کے چہرہ پر فنا کی چھاپ ہے۔ تاریخ' جس کا اہم ترین قانون یہ ہے
کہ ہر وہ چیز جو ابھرتی ہے' گرتی بھی ہے۔ انیسویں صدی کی تحقیقات نے پوری تفصیل
سے ہمیں قوموں' نسلوں اور ریاستوں کے زوال کی داستانیں سنائی ہیں۔ اس سے پہلے شاید

Scanned with CamScanner

ہی کبھی کسی قوم نے ماضی کو اتنا کھنگالا ہو، جتنا کہ پچھلے سو سال میں لوگوں نے عہد گزشتہ کی چھان بین کی ہے۔ ترقی اور مورخوں کی صدی نے طیاروں، ریڈیو، اور زہریلی گیس کی صدی کے لئے مایوسی اور انحطاط کی میراث چھوڑی ہے۔

تاریخ کس طرح تقدیر کی مجبوریوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ذرا متکبر مصر کی طرف دیکھئے، جس نے ریگ زار پر ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔ یورپ سے زیادہ پر اجلال صنم کدے تعمیر کیے، بحیرہ روم کے تمام باشندوں پر حکومت کی، کروڑوں غلاموں پر ظلم و تعدی کا مینہ برسایا اور اپنے بادشاہوں اور اسقفوں کو "مکان ابد" میں جگہ دی۔ لیکن اس ابد، کا کیا باقی رہ گیا؟ سڑتی ہوئی ہڈیوں پر سفید بال نمایاں ہیں۔ اہرام مصر میں سے بھی موت کا تعفن برآمد ہوتا ہے۔ ان مجسمات اوہام کے گرد، صحراؤں کی ریت اڑ اڑ کر چکر لگاتی ہے۔ حکومت ہر سال انہیں صاف کرنے پر خاصی رقم خرچ کرتی ہے۔ اور جب مسافر، جس کے چہرہ پر ریت کے ٹکڑے جم جاتے ہیں، انہیں دیکھنے کے بعد لوٹتا ہے، تو یہ سوچتا ہے کہ اگر حکومت ایک دو صدیوں تک ان اہرام کی جھاڑ پونجھ نہ کروائے تو کیا ہو! وہ تصور کرتا ہے کہ ان پر ریت کی تہیں چڑھ جائیں، حتیٰ کہ ان میں سے طویل ترین عمارت بھی نظروں سے اوجھل ہو جائے، اور پھر مصر کی عظمت اور بربریت کا کونسا نشان باقی رہ جائے!

یونان کو لیجئے۔ اور اس پہاڑی پر چڑھیے جو پار تھینون کو جاتی ہے۔ یاد کیجئے کہ کس طرح نو برس تک، اکٹنس اور لیسکلیس نے اس سادہ لیکن مکمل صنم کدہ کی تعمیر کی نگرانی اور راہنمائی کی، جو توازن اور طرز کے لحاظ سے اعتدال و توازن کی مثال ہے۔ اور جس کے خطوط اس طرح قوموں کا انداز اختیار کرتے ہیں کہ ان سے انسانی جسم کی حرارت اور گداز چھلکتے ہیں۔ غور کیجئے کہ کس طرح فیڈیاس اور اس کے تلامذہ نے سخت مرمر میں سے اصنام تراشے۔ مردوں کے اس قدر حسین اصنام کہ انہیں دیکھ کر ذہن اور شخصیت پھلے پھولے بغیر نہیں رہ سکتے، دیوتاؤں کے پرشکوہ اور متین بت، جنہیں دیکھ کر انسان ان دیوتاؤں کو بھول جاتا ہے، جو عیاشی اور کشت و خون میں مصروف رہتے تھے۔ کئی صدیوں تک یہ مندر پہاڑی پر کھڑا رہا۔ سورج کی روشنی میں چمکتا دمکتا رہا۔ کئی نسلیں اس کے مشاہدہ سے روحانی غذا حاصل کرتی رہیں اور یہ محسوس کرتی رہیں کہ یہاں، شاید ایک دو لمحوں کے لئے انسان دیوتا بن گئے تھے۔

لیکن ۱۶۸۷ء میں جنگ کے بادل گھر آئے۔ ترکوں نے، ایتھنز پر فتح حاصل کر کے

پار تھینون کو اپنا بارود خانہ بنایا- وینس والوں نے پیریئس میں اپنی جنگی کشتیاں بھیجیں اور انہوں نے پار تھینون پر توپیں چلا کر اسے تباہ و برباد کر دیا- جب آپ اس پہاڑی پر' اس حسن اور خرد کے مجسمہ کو خراج عقیدت پیش کرنے جاتے ہیں' تو وہاں آپ کو پار تھن نظر نہیں آتے فقط ان کے چند آثار دکھائی دیتے ہیں جو شاید ایک دو زلزلوں کے جھٹکے سے ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں- پار تھینوں کا اکثر و بیشتر حصہ آپ کے قدموں کے نیچے ہو گا- سفید' درخشاں پتھر کے کروڑوں ریزے' جب آپ لوٹیں گے تو یہ سوچیں گے کہ کیا تاریخ کا سبق یہی ہے' کہ انسان جانکاہی اور جانفشانی سے ایک عمارت تعمیر کرے اور بے حس اور بے رحم زمانہ اسے مٹا ڈالے- زمانہ دائم و قائم ہے اور انسانی فن فانی- اور حسین ترین چیزیں زیادہ جلد فنا ہوتی ہیں-

پار تھینون ختم ہوا' یونان ختم ہوا' روما آیا اور اس شدت اور تندی سے دنیا پر چھا گیا کہ کبھی گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ یہ بھی ختم ہو جائے گا- لیکن شرح پیدائش اور زمین کی کم زرخیزی نے اسے تباہ کر دیا- اب اس کا کوئی نشان تک نہیں رہا' سوائے اس کے امیروں کی یاد کے' جن کی ہم نقل کر سکتے ہیں- کریٹ ختم ہو گیا- جوڈیا' فینیشیا' کارتھج بابل' اور ایران ان دیوتاؤں کی مانند ہیں' جن کے پرستار ختم ہو گئے ہیں- یہ وہ صنم کدے ہیں' جہاں زائرین تو جاتے ہیں' لیکن کوئی دست دعا نہیں اٹھاتا- ان سب پر موت طاری ہے-

یورپ آیا- اطالیہ' ہسپانیہ' فرانس' انگلستان' جرمنی- اور ایک ایسی تہذیب پیدا ہوئی کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی- انہوں نے کلیسا بنائے' جو پار تھینون کے ہمسر تھے- یونانیوں سے بہتر سائنس تعمیر کی- ایسی موسیقی تخلیق کی' کہ قدما کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی- اور علم کو جمع کر کے اسے اس پیمانے پر دوسروں تک منتقل کیا- کہ اس سے پہلے کبھی ممکن نہ ہوا تھا- لیکن سپنگلر اٹھتا ہے اور اس یورپ سے یوں خطاب کرتا ہے' جو جنگ سے ہراساں اور لرزاں ہے:

"تم مر چکے ہو' میں تم میں انحطاط کی تمام علامتیں دیکھتا ہوں- تمہارے ادارے' تمہاری جمہوریت' تمہاری بدعنوانیاں' تمہارے وسیع و عریض شہر' تمہاری سائنس' تمہارا فن' تمہاری اشتراکیت اور دہریت' تمہارا فلسفہ' حتیٰ کہ تمہارا ریاضی' ان تمام صفات کا حامل ہے' جو قدیم ریاستوں کی آخری منزلوں کو ممیز کرتی تھیں- ایک اور صدی گزرنے دو' اور تہذیب تم سے دور کہیں اپنا گھر بنائے گی- یہ تمہارا سکندری عہد ہے-"

Scanned with CamScanner

امریکہ آتا ہے اور ایک ایسی جامع تہذیب کی بنیاد رکھتا ہے، کہ اس سے پہلے شاید ہی کبھی پیدا ہوئی ہو، اور غالباً یہ تہذیب، سب پچھلی تہذیبوں سے زیادہ عروج حاصل کرے گی۔ لیکن اگر تاریخ میں کچھ صداقت ہے اور اگر ماضی، مستقبل کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے سکتا ہے تو یہ تہذیب بھی، جسے ہم محنت شاقہ اور عرق ریزی سے تعمیر کر رہے ہیں، تباہ ہو جائے گی۔ اور آج جہاں ہم محنت و مشقت میں مصروف ہیں، یہاں ہزاروں سال کے بعد وحشیوں کا راج ہو گا۔

یہ ہے وہ نقشہ، جو مورخ کا تصور، ماضی اور مستقبل کے متعلق قائم کرتا ہے۔ وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تاریخ میں فقط ایک امر یقینی ہے اور وہ ہے انحطاط۔ جس طرح زندگی میں فقط ایک چیز قطعی ہے اور وہ ہے موت!

۳۔ اقتصادیات اور تہذیب

یہ بڑی المناک تصویر ہے۔ آیئے دیکھیں کہ کیا المناک تصویر صحیح ہے؟

تہذیب کیا ہے؟ تہذیب، تحفظ اور ثقافت، تنظیم اور آزادی کا ایک مرکب ہے۔ اخلاق اور قانون، کے ذریعہ سیاسی تحفظ، پیداوار اور مبادلہ کے ذریعہ، اقتصادی تحفظ، علم اطوار اور فنون کی نشوونما اور تبلیغ کے ذریعہ ثقافت، یہ ایک پیچیدہ مرکب ہے، جس کے کئی اسباب و علل ہیں، جن میں سے کوئی سبب بھی عظمت یا انحطاط کا باعث بن سکتا ہے۔ ہم اس مرکب کو اجزا میں تحلیل کرنے کی کوشش کریں گے اور ہر ایک جزو کا الگ الگ مطالعہ کریں گے۔

اقتصادی اسباب۔ اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دنیا انسان کے وجود میں آنے سے پہلے موجود ہوتی ہے اور اگرچہ انسان اپنے ماحول کو اتنا ہی متاثر کرتا ہے، جتنا کہ ماحول اسے۔ ماحول پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ آب و ہوا زمین کی زرخیزی پر پابندیاں عائد کرتی ہے۔ کم بارش آہستہ آہستہ کسی تہذیب کو ختم کر سکتی ہے، جس طرح کہ اس نے شام اور بابل کی تہذیبوں یا اس قدیم تہذیب کو ختم کیا تھا، جس کے آثار، اینڈریوز نے منگولیا میں دیکھے ہیں۔ اہمیت کے اعتبار سے خوش گوار آب و ہوا کے بعد زمین کی زرخیزی کا دوسرا درجہ ہے۔ یہ سبب لابدی نہیں ہے کیونکہ یونان اور روما کا اکثر حصہ چٹانوں، دلدلوں اور ریگزاروں پر استوار ہوا تھا۔ لیکن روما کے زمینداروں نے یونان کو فتح کیا تھا اور زمین میں زرخیزی کی کمی تھی، جس نے روما کو تباہ کیا۔ افسروں کے کسانوں پر مظالم اور زمین کی

زمینداروں کی جگہ کاشتکاروں کی نگہداشت اور اس کے ساتھ کاشت کاری کی نوعیت میں انحطاط نے روما کو مجروح و متاثر کیا اور اب اسی طرح امریکہ کو مجروح اور متاثر کر رہا ہے۔ اس کے برعکس، چین کی دائمی زرخیزی، اس قدیم مگر نوجوان ملک میں تہذیب و تمدن کے اعادہ کی توجیہہ کرتی ہے۔ تہذیب کی راہ، مغرب کی طرف نہیں بلکہ ہرے بھرے کھیتوں کی طرف جاتی ہے۔ جب انسان گرم ممالک سے نکلتا ہے تو اسے سلطنت قائم کرنے کا امکانات شمال اور جنوب میں نظر آتے ہیں۔ لیکن آج کل وہ تمام اصولوں کی طرف سے بے نیازی اختیار کر کے اور ان کا مذاق اڑا کر مشرق کی طرف لوٹ سکتا ہے، لیکن یہ بات اب بھی صحیح ہے کہ ہر جگہ زمین کی نوعیت روح کی تہذیب پر اثر انداز ہوتی ہے۔

زمین غذا کے علاوہ معدنیات پیدا کرتی ہے اور بعض حالتوں میں سونا اور چاندی، لوہا اور کوئلہ، قوموں کی بقا کے لئے گندم اور جو سے زیادہ اہم ثابت ہوتے ہیں۔ پھر انگلستان کی مثال لیجئے۔ لاریم کی چاندی کی کانیں ختم ہو گئیں تو یونان مفلس اور ناتواں ہو گیا۔ یہی حال روما کا ہوا۔ ہسپانیہ میں چاندی کی کانوں کا انتشار اس کی کمزوری کا باعث بنا۔ انگلستان کی موت اس وقت قریب ہو گی، جب نیوکاسل کوئلہ درآمد کرنے لگے گا۔ اور جب چین کی زمین اپنی معدنی دولت دوبارہ اگلنے لگے تو وہ شاید پھر تہذیب کے معاملہ میں دنیا کی قیادت کرنے لگے۔ بروکس ایڈمس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ایلیس لورین کی فتح کے بعد جرمنی نے انگلستان سے صنعتی قیادت چھین لی تھی اور ۱۸۹۷ء میں پنسلوینیا کے کوئلے کے میدانوں کے افتتاح سے امریکہ صنعتی طور پر تمام دنیا سے سبقت لے گیا۔ اس وقت یورپ چین پر اس کے کوئلے کے حصے بخرے کرنے کے لئے لپکا، اور امریکہ فلپائن پر قبضہ کر لیا۔ کوئلہ بادشاہ ہے، تیل ولی عہد ہے اور برقی قوت، تاج و تخت کی جھوٹی دعوے دار ہے۔

ان اقتصادی اسباب کی طرح تجارتی حیثیت اور طاقت بھی تہذیب کے قیام و استحکام کا ایک اہم سبب ہے۔ کسی قوم کو ایشیا اور تہذیب کے اس مبادلہ کی سہولتیں حاصل کرنے کے لئے جو قوموں کو زندگی کی تحریک اور زرخیزی عطا کرتی ہیں، اس کے لئے کسی اہم تجارتی شاہراہ سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ یونان، ٹرائے کی فتح اور ایجیئن پر تسلط کے بعد ابھرا۔ روما نے کارتھج کی شکست اور بحیرہ روم پر تسلط کے بعد عروج حاصل کیا۔ ہسپانیہ میں سروانٹیس اور ویلاسکویز اس لئے پیدا ہوئے کہ وہ نئی دنیا کی رہگزر پر تھا۔ اطالیہ میں احیائے علوم ہوا، کیونکہ وہ مغرور لوگوں کی آماجگاہ اور یورپ اور مشرق کے درمیان تجارت کا وسیلہ تھا۔ روس بہت آہستہ آہستہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوا کیونکہ زمانہ وسطیٰ کے بعد

زمینی راہوں کی جگہ بحری راستوں نے لے لی تھی، اور کسی قسم کی سیاسی چالبازی یا جنگ سے وہ ان سمندروں پر قبضہ نہیں جما سکا، جن میں اس کے دریا آگر ملتے تھے۔ جب کونٹیشائن نے قسطنطنیہ کو اپنا دارالخلافہ اور قدیم بازنطین، روس، اور جرمنی اور آسٹریا سے لیوانٹ تک کی شاہراہوں کا وسطی مقام بن گیا تو روما کا انحطاط شروع ہو گیا۔ جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ اور تجارتی راہیں بحیرہ روم سے شمالی اوقیانوس میں منتقل ہو گئیں تو اطالیہ کے زوال کے دن آ گئے۔ جب طیاروں کے ذریعہ تجارت میں اضافہ ہو گا تو تہذیب اپنی آماجگاہ ہوائی راستوں کے اڈوں پر بنائے گی۔ برلن سے بغداد، تک کا تصور شاید کل محض خواب نہ رہے۔ اور جب چین، مغرب کا قومی رقیب اور خریدار بن جائے تو ممکن ہے کہ روس کے بیابان، آسمانی چہل پہل سے فروزاں ہو جائیں۔

آخری اقتصادی سبب صنعت ہے اور اس کی تاریخ اتنی مختصر ہے کہ اس کے اثرات کا صحیح اندازہ لگانا آسان نہیں۔ صنعت، دولت بہم پہنچاتی ہے۔ اور ایک مختصر سی جگہ میں ایک کثیر آبادی کو یکجا کرتی ہے۔ استعماری تشدد کو سرمایہ دیتی ہے اور سیاسی استیلا کا باعث بنتی ہے۔ لیکن کیا یہ تہذیب کی پرورش بھی کرتی ہے؟ صنعت مقدار کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اور صنعت، فن کاری، اور انفرادیت کو نظر انداز کرتی ہے۔ کبھی ہر صنعت فن بھی، اب ہر فن صنعت ہے۔ کبھی انسان، جو کارخانوں میں کام کرتے تھے، دست کار تھے، اب وہ محض مزدور ہیں۔ کیا مشینیں انسان کو بھی ایک کل میں تبدیل کر دیں گی اور روح، روحانی لطافت اور نشوونما سے محروم ہو جائے گی؟ صنعتی انگلستان میں، الزبتھ کے عہد کا سا ادب، یا نیوٹن کے زمانہ کی سی سائنس، یا وہ روشن اور درخشاں مصوری، جو ریلنڈز سے شروع ہو کر ٹرنر پر ختم ہوئی تھی، اب معدوم ہے۔ جرمنی کا عظیم زمانہ، فریڈرک، کانٹ، گوئٹے اور بیتھوون کے ساتھ شروع ہوا اور بسمارک اور فان مولٹکے، یعنی، خون، فولاد اور کوئلے پر ختم ہوا۔ فرانس میں انگلستان یا جرمنی سے کہیں کم صنعت، اور کہیں زیادہ تہذیب تھی۔ اور اگرچہ فرانسیسی اطوار اور آداب میں، والٹیئر کے عہد کی سی زندہ دلی نہیں رہی، لیکن فرانسیسی ذہن، مولٹیئر کے بعد سے روز افزوں ترقی کرتا رہا ہے۔ اب، جب کہ فرانس کے پاس ایلیس لورین ہے، وہ بھی ادب کو صنعت پر قربان کر سکتا ہے۔

نہیں، یہ صنعت نہیں، تجارت ہے جس نے زندگی اور فکر کو نشوونما کی تحریک بخشی ہے اور یورپی تہذیب کا اعلیٰ زمانے تخلیق کیے ہیں۔ پھر بھی، صنعت جوان ہے اور ماضی کو دیکھ کر مستقبل کا تصور قائم نہیں ہو گا۔ ممکن ہے کہ صنعت اتنی دولت جمع کر لے کہ ہمیں

فکر کے لئے فرصت اور فراغت کے لمحے مل جائیں اور ہم زندگی کے فن کو پھر زندہ کر سکیں۔

۴۔ حیاتیات اور تہذیب

صحیح ماحول اور فضا موجود ہو تو تہذیب کے مقاصد کے لئے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے جو توانائی اور جرات کی دولت سے مالا مال ہو اور صحراؤں کو سمن زاروں اور ماحول کو اپنے مقاصد کے سانچے میں ڈھال لے۔ یہ حقیقت تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہمارے سامنے آئی ہے۔ پروفیسر پیٹری کے نظریہ کی رو سے، جب بہت سے لوگ ایک ماحول کی تسخیر میں مصروف ہوں تو ایک نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔ پیٹری کہتا ہے، کہ تقریباً آٹھ صدیوں کے بعد اعلیٰ قابلیت کا دور آتا ہے اور چار پانچ سو سال تک قائم رہتا ہے۔ مثلاً گال، فرینک، اور کلوویز اور شارلیمین کے عہد کے دوسرے قبائل کے اشتراک کے آٹھ سو سال بعد، ربیلیز اور مونٹین کا زریں فرانسیسی عہد آیا۔ اسی طرح، اینگلو، سیکسن اور جیوٹس کے اشتراک کے آٹھ سو سال بعد شیکسپئر اور بیکن کے انگلستان نے جنم لیا۔

دوسری اقوام کی تاریخ شاید اس نظریہ کے عین مطابق نہ ہو، لیکن ہم اتنا کہہ سکتے ہیں، کہ نسلی اختلاط، ہنگامی طور پر مفید نہیں ہوتا لیکن تہذیب کے نقطہ نظر سے، اس کے نتائج اہم اور مفید ہوتے ہیں۔ مختلف نسلوں کے اختلاط، غالباً کچھ مدت کے لئے شخصیت کی رنگینیاں ختم ہو جاتی ہیں، لیکن یہ اختلاط ذہن اور جسم کی بنیادی اور قدیم صفات کو مستحکم کر دیتا ہے۔ اور احیا کا یہ عمل نئی فضاؤں میں جاری رہتا ہے، کیونکہ ہجرت انہیں افراد کو منتخب کرتی ہے، جو اساسی طور پر روحانی دولت سے مزین ہوتے ہیں اور جن میں تہذیب کم ہوتی ہے اور توانائی زیادہ۔ امریکہ اس بات سے سبق سیکھ لیتا ہے۔ ہمارا انتشار خون، ایک نئی قوم، نئے استحکام روح اور نئی تہذیب کا پیش خیمہ ہے۔

لیکن گوبینو، لیطشے، چیمبرلین اور گرانٹ کے نظریہ کے متعلق آخر ہم کیا کہیں۔ اس نظریے کے مطابق نسلوں کا اختلاط شخصیت اور تہذیب کے انحطاط کا سبب بنتا ہے۔ ان معروف مفکروں نے بات کو الٹا سمجھا ہے اس لئے کہ تاریخ شاہد ہے کہ انحطاط کی وجہ سے اختلاط عمل میں آیا۔ روما کا زوال وحشیوں کے حملہ سے کہیں پہلے شروع ہو چکا تھا۔ یہ زوال پہلے تعیش پسندی اور بعد میں رومن نسل کے خاتمہ سے شروع ہوا۔ جرمنوں سے اختلاط، نسلی زوال کا سبب نہیں، نتیجہ تھا۔

Scanned with CamScanner

پیٹری کے نظریہ کا ناخوشگوار پہلو یہ ہے کہ ایک نسل ایک فرد کی مانند، جسمانی توانائی کی ایک معینہ مقدار کی اہل ہوتی ہے اور اسے طفولیت، پختگی اور زوال کی منازل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پروفیسر نے، اس نظام فکر کے ساتھ، جو ہر عالم کو بھلا لگتا ہے، یہ کہا کہ یہ زندگی اور موت کے چکر کی مدت تقریباً ہر جگہ ایک ہی سی ہوتی ہے۔ لیکن زندگی تمام عظیم کلیوں سے برتر ہے، وہ نسلیں یا قومیں جو کاشت کاری کرتی ہیں، صنعتی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک زندہ رہ سکتی ہیں۔

شاید یہی راز ہے اس انحطاط کا جو روما کی نسل پر آیا، جب اس نے زمین سے اپنا رستہ منقطع کر لیا اور مردانہ جنگجوئی کے باعث، بداخلاق اور بیکار مزدوروں کا ایک شہر بسا لیا تو اس کی صحت اور تندرستی زائل ہو گئی۔ تمدن تہذیب کے لئے لازمی ہے، لیکن اس میں نسلی انحطاط کے بیج بھی موجود ہیں۔ ذہنی کام، دھوئیں سے بھرے ہوئے گھر اور لوگوں سے بھرے ہوئے بازار، حسین لباس اور مرغن غذائیں، تندرستی کو خراب کرتی ہیں۔ شہری صحت اور ادویہ کے ذریعہ بچوں کی شرح اموات میں کمی ہو گئی ہے اور زندگی کی میعاد بڑھ گئی ہے۔ وباؤں نے رومی سلطنت کی نصف آبادی کو اینٹونا ئینس کے عہد میں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا اور روما کو کثیرالتعداد جرمنوں کے جال میں پھنسا دیا۔ کالی وبا نے انگلستان کو اس طرح پامال کر دیا کہ وہاں جاگیرداری ختم ہو گئی۔ ممکن ہے کہ جراثیم ہم پر پھر حملہ آور ہوں۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن صرف خوردبین کے ذریعہ ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

لیکن ان سے کہیں زیادہ اہم سبب، قوموں کی تقدیر پر شہری زندگی کے اثر سے پیدا ہوتا ہے اور وہ ہے ولدیت پر ارادی ضبط۔ جوں جوں شہر بڑے ہوتے جاتے ہیں، کنبے چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ شہروں کی آبادی تناسل سے نہیں بڑھتی، بلکہ لوگ یہاں غیر ملکوں اور دیہاتوں سے ہجرت کر کے آتے ہیں۔ پرانی نسلیں ختم ہو جاتی ہیں اور نئی نسلیں اپنا تسلط قائم کر لیتی ہیں۔ اس طرح رومیوں کی نسل قلیل تر ہوتی گئی۔ اس نے جرمن سپاہیوں سے نہیں، بلکہ جرمن ماؤں سے شکست کھائی۔ یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ سیزر نے ان رومنوں کو انعام دیئے، جن کے کنبے بڑے تھے اور بانجھ عورتوں کو زیورات پہننے کی ممانعت کر دی۔ آگسٹس نے غیر شادی شدہ لوگوں پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اور ہر بچے کے لئے ماں کو ایک معقول رقم کا معاوضہ دینا مقرر کیا۔ اور کانسٹنٹین نے ان تمام بچوں کی پرورش حکومت کے سپرد کر دی جن کے والدین ان کی نگہداشت کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے۔ نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ شرح پیدائش ہر اس جگہ کم ہو گی جہاں تھوڑے بچوں والے کنبوں کو زیادہ

Scanned with CamScanner

بچوں والے کنبوں پر اقتصادی تفوق حاصل ہے یہ باتیں فلسفہ کی دست برد سے باہر ہیں۔
کیا شرح پیدائش میں یہ کمی، ہماری تہذیب کے انحطاط کا باعث نہیں بنے گی؟
ہر شخص جانتا ہے کہ امریکہ کے تعلیم یافتہ حلقوں میں شرح پیدائش بہت کم ہے۔
ماہرین حیاتیات اس اعتراض سے بخوبی واقف ہیں کہ طب اور سخاوت نے "فطری انتخاب کو ختم کر دیا ہے۔" عام لوگ یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ نسل نچلی سطح سے ابھر رہی ہے اور تقریباً ساری اگلی نسل نااہل لوگوں کے ذریعہ بڑھ رہی ہے، اور تعلیم قابل لوگوں لا ولدیت کی وجہ سے زبوں حالت میں ہے۔

اس بات میں کسی قدر صداقت ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ مدرس کا کام اس حقیقت کی وجہ سے دوچند مشکل ہو گیا ہے کہ آئندہ نسل آج کے احمقوں کے ہاتھوں تربیت پا رہی ہے۔ تعصب اور واہمہ صوبہ پرستی اور رجعت پسندی، کو جہلا کی زرخیزی سے نئی زندگی حاصل ہو رہی ہے۔ لیکن حیاتیاتی نقطہ نظر سے، یہ اتنا عظیم حادثہ نہیں، جتنا کہ معلم سمجھتا ہے۔ علمی کارنامے میراث میں نہیں ملتے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے بچوں کو بھی پڑھنا لکھنا پڑتا ہے اور وہ بھی تعصب اور توہم پرستی کے دور میں سے گذرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مفلس لوگوں کے ہراساں اور اپاہج بچوں میں کتنی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ حیاتیاتی نقطہ نظرے، جسمانی طاقت، علمی میراث کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔ اجتماعی نقطہ نظر سے، شخصیت کا استحکام علم یا طاقت کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابل قدر ہے۔ فلسفی، بالعموم نسلی بقا کے لئے بہترین مواد ثابت نہیں ہوتے۔ نیطشے کا خیال تھا کہ جرمنی کا بہترین خون، دہقانیوں کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ ہمارا بھی یہی حال ہے۔ ممکن ہے یہ حالت امید افزا ہو کہ اب جو طلباء مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں، ان گھروں سے آتے ہیں، جہاں توانائی اور طاقت زیادہ ہے۔ اور گمان غالب ہے کہ ان کی جہالت بہت جلدی تعلیم کے ذریعہ ختم ہو سکتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اس مسئلہ کا حل، امرا میں شرح پیدائش کو بڑھانا نہیں بلکہ مفلسوں میں اسے کم کرنا ہے۔ ہمیں ضبط تولید کی طبی امداد کو آئینی حیثیت دینی چاہئے۔ ہمیں کمزوروں کی کثرت تولید کو کم کرنا چاہئے اور محبت کی کم نظری کو ختم کر کے ہمیں لوگوں میں تندرستی کی اہمیت کی تبلیغ کرنی چاہئے۔ ہمیں تعلیم یافتہ لوگوں میں قلت تولید کی حقیقت کو تسلیم کر کے ماحول اور تعلیم پر یہ اعتماد رکھنا چاہئے کہ ان کی مدد سے تہذیب پھلے پھولے گی۔ وراثت، نسل کی معراج کا ایک حقیر سبب ہے۔ ارتقا اب حیاتیاتی نہیں، اجتماعی نوعیت رکھتا ہے۔ ہمیں ایک تندرست نسل دے دو، بہتر مدرسے تہذیب کو محفوظ اور قائم رکھنے کا

کام خود کر لیں گے۔

۵۔ اجتماعات اور تہذیب

ترقی کا انحصار اتنا قدیم اداروں کی نوعیت پر نہیں' جتنا انتخاب کے طریقوں پر ہے۔ اس کا دار و مدار تعلیم اور حکومت پر ہے۔ نہ کہ طاقتور کے ناتواں کو نیست و نابود کرنے پر۔ اور مستقبل کے متعلق ہمارے شکوک' خاندانوں کے شجروں پر نہیں' بلکہ ان اجتماعی اداروں کی موجودہ حیثیت سے متعلق ہیں' جنہوں نے کئی صدیوں سے انسان کے ارتقا کو منظم کیا ہے۔ کلیسا' خاندان' مدرسہ' ریاست' تہذیب کی تبلیغ کہاں تک کر سکتے ہیں؟

کلیسا نے یورپ میں' جہاں وہ کبھی حاوی تھا' اپنا تسلط کھو دیا ہے جو تقسیم ہو جانے کے بعد بھی تعلیم اور اخلاق کے نقطہ نظر سے ایک اہم ادارہ تھا اور کسی مستحکم ریاست سے بھی ٹکر لے سکتا تھا۔ اب ہمارے یہاں مذہبی مصلحین نہیں رہے۔ کوئی شخص بھی' جو اپنے آپ کو قومی ضمیر کی آواز بنانا چاہے' ریاستی صدروں اور بادشاہوں کے برابر اختیار اور قوت حاصل نہیں کر سکتا۔ جب سے مارٹن لوتھر نے اصلاح مذہب کا بیڑا اٹھایا اور اس ضمن میں جرمن نوابوں کی معاونت حاصل کی' ریاست نے آہستہ آہستہ کلیسا کی جائداد اور قوت پر قبضہ کر لیا اور پادریوں کی اخلاقی قیادت واضح طور پر زوال پذیر نظر آ رہی ہے۔

تاریخ کے طالب علم کے لئے مذہبوں کا انحطاط اور اخلاق کے دینیاتی مفروضوں کا انتشار حال کو سمجھنے اور مستقبل کے بارے میں پیشگوئی کرنے کے سلسلے میں نہایت اہم چیزیں ہیں۔ کبھی بھی مذہبی یقین اتنا مضمحل نہیں ہوا اور شاید ہی کبھی کوئی اخلاقی نظام اتنے نشیب و فراز میں سے گزرا ہو جتنا کہ مسیحی نظام آج کل گزر رہا ہے۔ کیا ریاست کلیسا کی امداد کے بغیر اجتماعی نظام کو قائم رکھ سکتی ہے؟ کیا اخلاق الہیاتی عقائد سے علیحدہ ہو کر باقی رہ سکتا ہے؟ کیا آج کل کے مدرسے کلیسا اور گھر کا صحیح نعم البدل ہیں؟ کیا یہ مدرسے حکمت کے بغیر سائنس' ذہانت کے بغیر علم اور ضمیر کے بغیر چالاکی نہیں سکھاتے؟ کیا یہ مدرسے ماحول سے ایک ایسی میکانکی مطابقت پیدا کرنے کی تعلیم نہیں دیتے' جس میں جمالیاتی شعور اور تخلیقی مقصد کی کمی ہوتی ہے؟

مذہب کا مطالعہ ہم بعد میں کریں گے۔ آیئے' پہلے خاندان کا مطالعہ کریں۔ جہاں تک خاندان کا تعلق ہے' وہ انحطاط پذیر ہے۔ خاندان ہمیشہ تاریخ کی ہر تہذیب کی اساس رہا ہے۔ خاندان معاشرے اور اجتماعی زندگی کی اقتصادی اور تخلیقی وحدت رہا ہے' جس میں

والدین کا اقتدار قائم تھا۔ اس کی حیثیت ایک تمدنی وحدت کی سی تھی، جو ادب اور فن کی تبلیغ کرتا تھا۔ بچوں کی پرورش اور تعلیم کا ذمہ دار تھا۔ وہ ایک ایسی اخلاقی وحدت بھی تھا، جو اشتراک باہمی اور تنظیم کے ذریعہ ان اجتماعی رجحانات کی ترتیب کرتا تھا، جو مہذب سماج کے اتحاد کی نفسیاتی بنیاد سمجھے جاتے ہیں۔ وہ ریاست سے زیادہ اہم تھا۔ حکومتیں ٹوٹ جاتی تھیں، لیکن اگر خاندان باقی رہتے تھے تو نظم و ضبط قائم رہتا اور ماہرین اجتماعیات ہمیشہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر خاندان مٹ گیا تو تہذیب ختم ہو جائے گی۔

لیکن آج جب کہ ریاست مستحکم سے مستحکم تر ہوتی جا رہی ہے خاندان گھرانوں سے مکانوں اور بچوں سے کتوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ مرد اور عورتیں اب بھی اختلاط کرتے ہیں اور کبھی کبھی بچے بھی پیدا کرتے ہیں، لیکن یہ اختلاط اکثر شادی کی شکل اختیار نہیں کرتا اور شادی اکثر ولدیت نہیں ہوتی اور ولدیت اکثر تعلیم نہیں ہوتی۔ آزاد محبت اور طلاق شادی کی حکومت کو مختصر کر دیتے ہیں۔ ایجاد، ولدیت کو ختم کر دیتی ہے۔ مدرسہ، بچہ کو ماں سے جدا کر دیتا ہے اور ریاست، باپ سے اس کے اختیارات چھین لیتی ہے۔ اس کے بجائے استاد اور پولیس کے سپاہی، پرانے گھرانوں کا سا نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ صنعت، زراعت کی جگہ لیتی ہے۔ اور فرد کا کام، اجتماعی زراعت میں سما جاتا ہے۔ رائے دہندہ، پنچائیت، ان اجتماعی اداروں کی جگہ لیتا ہے جن میں کنبوں کی نمائندگی ان کے بزرگ کیا کرتے تھے۔ اس قدیم ادارہ کے آثار اب وہ مکان رہ گئے ہیں، جہاں وہ اکٹھے رہتے ہیں اور یہاں صرف وہ ناقابل اعتماد احساس باقی ہے، جو مرد کو عورت سے اور بیٹوں اور بیٹیوں کو والدین سے وابستہ کرتا ہے۔ اجتماعی نظام میں مرکزیت پیدا ہو گئی ہے اور ریاست نے ساری ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔

لیکن ریاست۔ کیا یہ اتنا مستحکم ادارہ ہے (جو اقتصادی اور اخلاقی حقائق پر استوار ہے)، کہ یہ علم، اخلاق اور فن کی میراث کے قیام، اضافہ اور تبلیغ کی ذمہ داری صرف اپنے کندھوں پر لے لے، یا کیا اپنے موجودہ سیاسی نظام کی وجہ سے یہ ان جہلا کے ہاتھوں میں چلا جائے گا، جن کے لئے علم اور فن دونوں نفرت انگیز ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ امریکہ کی اکثر ریاستوں پر کمتر درجے کے انسانوں کی حکومت ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اعلیٰ عہدوں کی شاہراہ وہ تنظیم ہے، جس میں وطن پرستی، مدبر اور ضمیر کا گزر نہیں؟ کیا وجہ ہے کہ بداخلاقی، اور سیاسی فریب اتنے عام ہونے پر بھی عوام کو غیض و غضب یا کسی عملی اقدام کی طرف مائل نہیں کرتے؟ کیا وجہ ہے کہ حکومت کا اہم ترین فریضہ آج جرائم کی پردہ پوشی، اور امن

کے معاہدوں کے دوران میں جنگیں لڑنا بن گیا ہے؟ کیا اسی ادارے کو کلیسا اور خاندان تہذیب کی قیادت سپرد کر رہے ہیں؟

زیادہ دولت کسی قوم کے لئے مفید بھی ہے اور خطرناک بھی۔ چونکہ صلاحیتیں مختلف ہیں، جوں جوں ایجادات جرات مند ذہنوں کی قوت میں اضافہ کرتی جاتی ہیں، دولت کی تقسیم غیر مساوی ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح طبقوں کا باہمی فصل بڑھتا جاتا ہے اور اس سے سیاسی نظام میں ایک تناؤ پیدا ہو جاتا ہے، اور جوں جوں دولت بڑھتی ہے، تعیش، نسل کی جسمانی اور ذہنی توانائی کو مٹانا شروع کر دیتا ہے۔ لوگ، اپنی تکمیل، اپنے کام میں نہیں، بلکہ جسمانی لذتوں میں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ تفریح کی مسرت، تخلیق کے نشاط کی جگہ لے لیتی ہے۔ مردانگی کم ہو جاتی ہے اور ذہنی امراض بڑھنے لگتے ہیں۔ شخصیت کمزور ہو جاتی ہے اور ممکن ہے کہ مصیبت کے وقت قوم شکست کھا جائے۔ ایک جوان ادیب نے کئی سال ہوئے کہا تھا۔

"تاریخ، بربریت کا اعادہ کا نام ہے۔ ایک قوم، جو مادی حالات کی ناماسعدت کی وجہ سے مضبوط ہو جاتی ہے اپنی بقا کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی اور کمزور قوم کو فتح کر لیتی ہے۔ عزم اور عمل کی عادتیں، جو ناماسعد حالات میں بنی تھیں، اقتصادی خوشحالی پیدا کرتی ہیں۔ خوسحالی سے ایک ایسا طبقہ وجود میں آ جاتا ہے، جو جسمانی عقل کو بنظر تحقیر دیکھتا ہے اور تعیش کے فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ فرصت سے تفکر پیدا ہوتا ہے۔ تفکر، عقائد اور رسوم کو مٹاتا ہے، مشاہدہ کی نزاکت پیدا کرتا ہے، اور عزم عمل کو ختم کر دیتا ہے۔ فکر، تجزیہ کی مہم میں، اجتماع کے پیچھے فرد کی دریافت کرتا ہے۔ اپنے صحت مند وظیفہ سے محروم ہو کہ وہ اپنے باطن کو دیکھتا اور اس طرح انا، دریافت کرتا ہے۔ مشترک مفاد کا احساس کم ہو جاتا ہے اور شہری نہیں، فقط افراد رہ جاتے ہیں۔

دور دراز سے، ناماسعد حالات کا مقابلہ کرتی ہوئی کوئی قوم جب کٹے ہوئے جنگل، آزاد راہیں، ہرے بھرے کھیت اور آرام کا تعیش دیکھتی ہے تو سوچنے اور آرزو کرنے لگتی ہے اور متحد ہو کر حملہ کر دیتی ہے اور پھر وہی چکر شروع ہو جاتا ہے۔"

۶۔ تہذیب کی بقائے دوام

یہ ہیں اس پیچیدہ مسئلہ کے اجزاء اور یہ ہیں ہماری تقدیر کے متعلق ہمارے شکوک۔ ہم تاریخ کے بنیادی مسئلہ سے اب آخر کس طرح دوچار ہوں؟

آیئے ہم اپنے مسئلہ کی حدود قائم کریں۔ ہم یہ نہیں جاننا چاہتے کہ یہ کرہ ارض فنا ہو جائے گا یا نہیں۔ غالباً یہ فنا ہو جائے گا۔ ہم یہ نہیں پوچھتے کہ کوئی خاص قوم یا نسل ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی یا نہیں۔ غالباً وہ قائم نہیں رہے گی۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی خاص تہذیب ایک غیر معینہ مدت تک قائم رہ سکتی ہے یا اس کی تقدیر میں یہی لکھا ہے' کہ وہ بار بار تباہ ہوتی رہے؟ تہذیب کوئی مادی چیز تو ہے نہیں جو اس کرۂ ارض کے کسی خاص مقام سے ہمیشہ کے لئے وابستہ رہے۔ تہذیب فنی خصوصیات اور تمدنی تخلیقات کا ایک غیر مرئی مرکب ہے۔ اگر یہ صفات' مادی قوت کے کسی اور مرکز پر منتقل ہو جائیں تو تہذیب باقی رہتی ہے۔ اور جب ریاست' افواج' سیاست دان اور پولیس کا وجود باقی نہیں رہتا اس وقت بھی یہ قائم رہتی ہے۔

ان معنوں میں یہ کہنا غلط ہے کہ تہذیبیں تباہ ہو جاتی ہیں اور قومیں مر جاتی ہیں۔ یونانی تہذیب مری نہیں' فقط وہ سرزمین' جس نے کبھی ہومر اور سکندر کو پروان چڑھایا تھا' اب ایسے سپوت پیدا نہیں کرتی۔ یونانی تہذیب آج نظر نہیں آتی' لیکن ایک اور قلمرو میں' انسانی حافظہ کی مملکت میں یونانی تہذیب زندہ ہے۔ ہومر اب بھی اکیلیز کے غیض و غضب کے گیت گاتا ہے اور سکندر' لنگا کے ساحل پر یورش کرتا ہے۔ ہیسائیڈ اب بھی دیہاتی نغمے گنگناتا ہے۔ اور پنڈار کھلاڑیوں کے کارناموں کو شعر و سخن کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ سولن قانون بناتا ہے اور تعلیم پاتا ہے اور کلائیتھنیتر' جمہوریت کی آبیاری کرتا ہے۔ پیریکلیس انیگزاگورس کی باتیں سنتا ہے اور سقراط کے ساتھ اسپیشیا کی بارگاہ میں جاتا ہے۔ ائیسکلیس' پرومیتھیئس کی للکار کو فضاؤں میں بکھیر دیتا ہے اور یوروپیڈیس فاتحین کو مفتوح ٹروجن قوم کے ساتھ رلاتا ہے۔ افلاطون اپنے غیر محدود جامعہ میں خاموشی سے خراماں ہے' جہاں آج بھی لاکھوں طلبا اس سے درس حاصل کرنے آتے ہیں۔ دیوجانس اب بھی استقامت سے اپنے شمع علم روشن رکھتا ہے اور ارسطو' کائنات کی تحلیل میں مصروف ہے۔ زینو' صدیوں کے فاصلہ سے اور ہیئس سے ہم کلام ہے اور ایپی کیورس' لیوکریٹس کے دوش بدوش چلتا ہے۔ سیفو' انیکریون کے ساتھ مل کر شعر کہتی ہے۔ اور سکندریہ کا اقلیدس' ارشمیدس کو ریاضی کے مسائل حل کرتے دیکھتا ہے یہ موت نہیں' یہ تو نسل کی روح رواں ہے۔

حافظہ اس قسم کی موت پر غالب ہے' اور انسانیت کا حافظہ' پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم اور متحول ہے۔ محض قلم کی وجہ سے نسلی حافظہ اس قدر بھرپور نہیں تھا' لیکن طباعت نے

اسے بے حد قوی بنا دیا ہے۔ مدرسے، اسے ہر شخص کی دسترس میں لے آتے ہیں۔ ہر روز کوئی نئی کل اس کی اعانت کرتی، اور قبرستان سے کسی آواز کو زندہ کرتی ہے، جو صدیوں تک راگ الاپتی ہے۔ اور ان مناظر الفاظ اور اذکار کو ان کی جنم بھومی سے اٹھا کر دوسرے براعظموں میں لے جاتی ہے، تاکہ لوگوں کے حافظہ کی دولت میں اضافہ ہوتا رہے۔

ہاں، قومیں مرجاتی ہیں، پرانے خطے، بنجر ہو جاتے ہیں اور انسان اپنے آلات اور اپنے فنون اٹھا کر کہیں اور چلا جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے حافظے کو قائم رکھتا ہے۔ اگر تعلیم نے اس کے حافظہ میں عمق اور وسعت پیدا کی ہے، تو تہذیب اس کے ساتھ منتقل ہوتی ہے۔ وہ نقل مکانی کرتی ہے۔ نئی سرزمین میں یہ لازمی نہیں کہ تہذیب اپنی بنیاد ازسرنو رکھے، یا دوسروں کے تعاون اور دوستی کے بغیر زندگی بسر کرے۔ ذرائع نقل و حرکت اور وسائل بیان و اظہار سے اس سرزمین سے وابستہ رکھتے ہیں، جو اس کی جنم بھومی ہے اور مادر وطن، کی امداد جو نوآبادیوں کو میسر ہوتی ہے، نوجوان ملکوں کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے، جو والدین کی شفقت جوانوں کے لئے وہ حفاظت کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں، اخلاق، حکمت اور فن کے اسرار کو نئی نسلوں تک منتقل کرتے ہیں تہذیبیں، انسانیت کی روح کی تخلیق ہیں۔ جب ہم لکھتے اور پڑھتے ہیں، اشاعت اور تجارت میں مصروف ہوتے ہیں، تار اور برقی لہریں، قوموں اور تمدنوں میں ربط باہمی پیدا کر رہی ہوتی ہیں اور ساری دنیا کو وحدت کے رشتہ میں منسلک کرتی ہیں۔

اب یہ لازمی نہیں رہا کہ تہذیب مرجائے۔ ممکن ہے یہ انسان کے بعد بھی زندہ رہے، اور کسی اعلیٰ تر مخلوق کی ملکیت بن جائے۔

۷۔ امریکا کا مستقبل

اس ضمن میں مزید بحث کے لئے یہ لازمی ہے، کہ ہم یورپ ایشیا اور امریکہ کو علیحدہ علیحدہ زیر مطالعہ لائیں اس لئے کہ خود یورپ ہی کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں مختلف ملکوں میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً قدرت نے انگلستان اور یورپی ممالک مثلاً روس اور دوسرے مغربی ممالک کو مختلف امتیازی صفات عطا کی ہیں۔ انہیں صفات کی بنا پر ترکیہ کا شباب نو اور اطالیہ کا عہد جدید انہیں امتیازی حیثیت دیتا ہے۔ اس عہد نو میں ممکن ہے کہ ایبی نائٹر کے شوریدہ سر دھارے اطالیہ کو پھر احیائے علوم کی دولت سے مالا مال کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ روس اپنے متعدد کسانوں کو صنعتی تعلیم دے کر انہیں زمین کے معدنی

خزانے نکالنے پر مامور کرے اور اس طرح ایک مستحکم صنعتی نظام قائم کر لے اور اس کا شمار دنیا کی بڑی "طاقتوں" میں ہونے لگے۔ اسی طرح جرمنی کی انفرادی اور اجتماعی صحت اسے اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ دوبارہ تجارتی دنیا کی قیادت حاصل کر لے۔ اور اگر انگلستان کے عدیم المثال ارباب سیاست نے اقتصادی قوانین کے کسی پر فریب حربہ سے اس کی مدافعت نہ کی، تو وہ آہستہ آہستہ اپنی خارجی تجارت کھو بیٹھے۔ اور پھر اسے اندرونی افلاس اور بیکاری سے دوچار ہونا پڑے اور فرقہ وارانہ تنازعوں میں اپنی قوت زائل کر کے اسے مشرق میں اپنا اقتدار کھونا پڑے۔

نہیں، قوموں کی تقدیر کو ایک ہی لپٹ میں موضوع بحث نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر قوم کے لئے مستقبل ایک علیحدہ روپ دھارے گا، لیکن اگر ہمیں تقدیروں کی تقسیم کرنی ہے، تو ہم یہ کہیں گے کہ انگلستان اور فرانس خسارہ کی طرف جا رہے ہیں اور جرمنی اور روس منافع کی طرف بڑھ رہے ہیں اور یہ کہ یورپ پیچھے ہٹ رہا ہے اور ایشیا آگے بڑھ رہا ہے اور امریکہ بلوغت حاصل کر رہا ہے۔ تبدیلیاں آہستہ آہستہ ہو رہی ہیں۔ اس صدی کے خاتمہ پر چین، یورپ کے کسی ملک کے برابر صنعتی ترقی کر چکا ہو گا اور امریکہ کاروباری ذہنیت سے ثقافت، دولت سے فن، اور سیاست دانی سے نظم و نسق کی طرف بڑھ چکا ہو گا۔

سپنگلر غلط کہتا تھا کہ کاروباری دور، انحطاط کا پیش خیمہ ہے۔ یہ صرف زراعتی رئیسیت کے لئے انحطاط کا باعث ہے جس کی جگہ کاروبار لیتا ہے۔ عبوری دور ایک زراعتی عہد کو پیر یکلیز کے ایتھنز، آگسٹس کے روما اور میڈیسی کے فلورنس کے فعال تمدن میں تبدیل کرتا ہے۔ ان شہروں میں کاروبار اور صنعت کی گرم بازاری تھی اور یہ جاگیرداروں کے تصرف سے آزاد ہو چکے تھے۔ انفرادی کوشش، تجارت اور ثقافت، ایک پھلتی پھولتی تہذیب کی منزلیں ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے کہ ہر منزل لازمی ہے۔ اس سے پہلے کہ لوگ نظمیں لکھیں، صنم تراشیں اور موسیقی یا فلسفہ تخلیق کریں، یہ لازمی ہے، کہ وہ ہر میدانوں کو صاف کریں، بیج بوئیں، معدنیات نکالیں، گھر بنائیں اور سڑکیں تعمیر کریں۔ ہزاروں مشینیں چلائیں، تاکہ دولت پیدا ہو اور تخلیقی مساعی کے لئے فرصت عام ہو۔ زندگی فریضہ اولین ہے۔ یہ اچھی علامت ہے کہ ہم اس تمول پر شرمسار ہیں، جسے ابھی فن نے آنچ نہیں دی۔ ہماری شرمساری وہ ایک چبھتا ہوا محرک ہے، جو ممکن ہے ہمیں دولت سے تہذیب تعمیر کرنے پر مجبور کر دے، لیکن ثقافتی کم تری کا احساس کہیں ہمارا مرض ہی نہ بن جائے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہم یورپ کے کلیساؤں اور عجائب خانوں کی ستائش کرتے

Scanned with CamScanner

کرتے، اس کے ظلم و ستم اس کے مذہبی اور نسلی امتیازات، اس کی عسکریت اور اس کی جبری بھرتی پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہم محض امریکہ کی دولت ہی کی طرف نہیں دیکھتے جس پر یورپ کا ہر شہری رشک آمیز نظریں ڈالتا ہے (اور ہر ادیب اس کا کچھ حصہ حاصل کرنے کا خواہاں ہے) بلکہ اس کے دولتمندوں کی تعلیمی فیاضی، اس کے باشندوں کے لاثانی تجسس، علم اور ادب کے شوق کی طرف بھی ہماری نظر ہے۔

سپینگلر، کبھی امریکہ نہیں آیا۔ وہ ایک ایسی سر زمین کے پس منظر میں لکھ رہا تھا، جو جنگ سے شدید طور پر مجروح ہو چکی تھی۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ امریکہ میں شباب کی علامتیں اور خامیاں، انحطاط کے نشانوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہم ابھی تک قومی عنفوان شباب کے دور سے گزر رہے ہیں۔ کوئی تین سو برس گزرے کہ زائرین یہاں آئے تھے، اور کوئی ڈیڑھ سو سال ہوئے کہ یہاں پہلی حکومت قائم ہوئی تھی۔ ایک ناپختہ ملک سے فن یا ذوق کی توقع رکھنا اسی قدر مضحکہ خیز ہے، جس قدر جوانوں سے مابعد الطبیعاتی یا سیاسی صحت مندی کی۔ شباب کے نشوونما میں خامیاں بھی ہوتی ہیں، اور گناہوں کی نمائش بھی۔ اس سے پہلے کبھی تاریخ میں، کسی تہذیب کو اتنی وسیع اقتصادی بنیاد میسر نہیں آئی۔ ایک صحت مند آب و ہوا، جس میں ہر تندرست نشیب و فراز ملتا ہے۔ ایک زرخیز زمین، جو نہری اور فنی آبپاشی کے بعد سو گنی زرخیز ہو جائے گی۔ زمین کی تہوں میں ہر قسم کی معدنیات اور تیل، ریل گاڑیاں، جن کی سرعت دنیا کے لئے مثال ہے، روز افزوں ترقی کر رہی ہیں۔ آبی راہیں، ابھی تک ریل گاڑیوں کی وجہ سے بے کار ہیں، لیکن ممکنات سے لبریز ہیں۔ مسلح اور آراستہ کارخانے، موجدین، جن کی تنظیم اور مساعی کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ سیاح اور ہوا باز جو فضائی زبان میں۔ رزمئے اور غزلیں کہتے ہیں۔ سرمایہ دار جو صنعت کو اپنا سرمایہ بخشتے ہیں۔ حکومت، جو سائنس کی نام لیوا ہے اور بصیرت میں ترقی کر رہی ہے۔ ہم اس دولت بے پایاں کو کس طرح صاف کریں گے؟

کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہمیں تباہ و برباد کر دے۔ ہمیں اپنی روحوں کو صحت کی خاطر اپنے آپ سے بار بار یہ کہنا چاہئے کہ فقط دولت ہی کسی قوم کو افضل نہیں بناتی، یہ گھر بنانے کی بجائے خاندان کو مٹا سکتی ہے۔ یہ فن کی سرپرستی کرنے کی بجائے حکومت کو بداخلاق بنا سکتی ہے۔ یہ حکمت کی بجائے طاقت، خوش خلقی کی بجائے بدتہذیبی، ذوق کی بجائے تعیش پرستی کی جستجو کر سکتی ہے۔ یہ ہمیں تخلیقی یونان کی جگہ زوال پذیر روما بنا سکتی ہے۔ امریکہ ان دونوں میں سے کیا بننا چاہے گا؟

Scanned with CamScanner

ہمارے اس مختلف نسلوں کے گھر کا کیا انجام ہو گا؟

میڈیسن گرانٹ نے صحیح کہا تھا کہ یورپی حکومتوں نے اپنے قید خانوں اور پاگل خانوں کے باسیوں کو بے پروا، دولت مند اور مہمان نواز امریکہ کے سپرد کر دیا۔ اس قسم کے عالی شان اعلان اکثر نصف حقیقت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمارے بعض مہاجرین رئیس تھے اور کچھ مجرم تھے۔ دونوں طبقے اتنے ممتاز تھے اور ممکن ہے کہ اب دونوں نے ایک دوسرے کا پیشہ اپنا لیا ہو۔ ماحول اور فضا، وراثت کے ساتھ طرح طرح کے فریب کھیلتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ چوروں یا رئیسوں میں سے کس نے بہتر نسل چھوڑی ہے یا کس نے ہماری ترقی کے لئے زیادہ کوشش کی ہے۔

اینگلو، سیکسن یہاں میدان ہار رہا ہے۔ شہری سیاست اور اخلاق اور ادبی تحریکوں میں اس کا تسلط ختم ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے رقیبوں کے مقابلے میں زیادہ بچے پیدا نہیں کیے۔ اس نے سمجھا کہ اس کی صفات، اس کی طاقت اور اقتدار قائم رکھنے کے لئے کافی ہوں گے، لیکن وقت نے اسے شکست دی۔ نسلی پاکیزگی، جس نے ہمیں نیوانگلینڈ کا عہد عطا کیا تھا، ختم ہوئی۔ کئی سال کے بعد شاید ہمارے مہاجر، ایمرسن کا سا انداز یا نیو انگلینڈ کے گھرانوں کی سی تہذیب حاصل کر سکیں۔ ابھرتی ہوئی نسلوں کی پختگی سے پہلے ایک ناپختہ انداز اور دیہاتی زبانوں کا عہد آئے گا، لیکن آخر میں ایک نئی نسل پیدا ہو گی اور غالباً ایک نئی زبان ظہور میں آئے گی اور یقیناً ایک نیا ادب تعمیر ہو گا۔ بحیرہ روم کا جذباتی اور فن کارانہ مزاج جب بے کیف پارساؤں سے خلط ملط ہو گا تو شخصیت اور احساس کا وہ امتزاج پیدا ہو گا، جس کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔ سینکڑوں اور قومیں اس ندی میں اپنا پانی بہائیں گی۔ اور ہماری نسل، ہماری سرزمین کی طرح متمول ہو گی۔ وہ نسل جو اس طرح بوقلمی میں ربط پائے گی۔ جو تہذیب عالم کا وارث بننے کے لئے لازمی ہے۔

جس طرح یورپ جنگ اور انقلاب سے بربریت کی طرف لوٹ آیا ہے، اسی طرح امریکہ ہجرت اور جمہوریت کی وجہ سے وحشت کی طرف جا رہا ہے، لیکن ہمارے یہاں ایک نئی نسل اور ایک نئی ثقافت جنم لیتی نظر آ رہی ہے۔ ہماری تقدیر، اقتصادی حالات کے ہاتھوں میں، بلکہ صنعت، حکومت اور فکر کے قائدین کے ہاتھوں میں ہے۔ انہیں نظر انتخاب سے کام لینا ہے۔

صحت مند آئین ہمیں وہ ذہنی اور لسانی حریت عطا کر سکتے ہیں، جو ہمیں بربریت پسند لوگوں کے دور سے محفوظ کر سکتی ہے۔ حکیمانہ قیادت کارخانہ داری کے امراض کو دور کر سکتی

ہے، اوقات کار کو کم کر سکتی ہے، برقی طاقت کوئلے اور غلاظت کی جگہ دے سکتی ہے، صنعت کو شہروں کے باہر لے جا سکتی ہے اور عمارتوں کو ظاہری حسن کے ساتھ داخلی روشنی اور تعاون بخش سکتی ہے۔ شہری منصوبہ بندی میں دانش، غالباً طیاروں کی امداد سے ہمارے ان گنت شہریوں کو میدانوں اور ساحلوں پر بسا سکتی ہے۔ گھروں کے اخلاقی اختیار کو بحال کر سکتی ہے اور ان ذہنوں اور جسموں کو پھر صحت عطا کر سکتی ہے، جو شہروں کے شور و غوغا سے مریض بن چکے ہیں۔ حکیمانہ فیاضی ہمیں ثقافتی اقدار کی بقا در تبلیغ کے لئے سہولتیں بہم پہنچا سکتی ہے۔ ہمارے مدرسوں اور جامعوں کی ضرورتیں پوری ہونی چاہئیں۔ ہر حقیر اور اعلیٰ تعلیمی ادارے کے مدرسوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہونا چاہئے۔ تعلیمی تجربات کے راستہ میں کسی طرح کے خوف اور اندیشے کو دخل نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں ہزاروں مقابلے اور انعامات، اور لاکھوں وظیفوں سے طلباء میں، تقابل، مطالعہ اور تخلیق کی محرکات پیدا کرنی چاہئیں۔ تحقیق میں سائنس سے پوری آزادی سے کام لینا چاہئے، لیکن اس کے فوجی اور صنعتی استعمال پر پابندیاں عائد کر دینی چاہئیں۔ ان فن کاروں کو پوری آزادی دینی چاہئے جو ہماری تجارتی اور تعلیمی عمارتیں بناتے ہیں، اور ہمارے عظیم محسنین کو یہ چاہئے، کہ لوگوں کو تعلیم دیں اور ہر شام مہذب موسیقی نشر کر کے لوگوں کی روحوں کو برگزیدگی کی دولت سے آشنا کر دیں۔

میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور نچلی منزل سے اعلیٰ موسیقی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ یہ بیتھوون کی موسیقی ہے۔ یہ کتنا بڑا معجزہ ہے کہ ایک ایسے شخص کے دل کی آواز، جو مدت ہوئی، مر چکا ہے، زمان و مکان کی حدود کو عبور کر کے لاکھوں روحوں کو صحت اور زندگی بخش رہی ہے۔ یہ عظیم الشان موسیقی ہے۔ اس میں ایک مکمل عہد کا اندوہ، آرزو اور نرم دلی پنہاں ہے۔

موسیقی ختم ہو گئی۔ ابھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ہے۔ ایک دوست، اس روحانی حسن کا، جو آسمانوں سے اس کے گھر میں نازل ہوا ہے اور ایک مردہ شخص کے اس پر اسرار سفر شب کا ذکر کرنا چاہتا ہے۔ جس میں اس نے ہزاروں بے نور، آنکھوں کو روشنی بخشی ہے۔ اور اب بھی کمرہ تالیوں کی ان آوازوں سے گونج رہا ہے جو اس عظیم فن کار کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے بجائی گئی تھیں۔

آئیے ہم بھی اپنے دلوں کا احساس تشکر اور جذبہ تحسین اس گونج میں شامل کر دیں۔

Scanned with CamScanner

حصہ ہفتم: فلسفہ سیاست

باب ہفدہم

آزادی کے محاسن

ا۔ شراب اور آزادی

یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ دنیا کی سیاست اور اقتصادیات میں قدامت پرستی کو فتح اور مذہب، اخلاق، سائنس، فلسفہ، ادب اور فن کے میدانوں میں آزادی کی جیت ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ہم نے اپنی حکومت کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے دی ہے، جو قدیم خداوندان صنعت کے پرستار ہیں، اور ہم نے کچھ عرصہ کے لئے آقا اور مزدور کے تعلقات میں کسی نئے تجربہ کے تصور کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے۔ ہم نے ان سرکاری افسروں کے گرد مقبولیت کا ہالہ کھینچا ہے، جن کی ممتاز ترین صفت۔ بزدلی اور کم ہمتی ہے۔ ہم باغیوں اور مصلحوں کو اس قدر تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں، کہ اب ان پر ظلم و تشدد بھی روا نہیں رکھتے۔ دنیا کی حکومتیں حزم و احتیاط کی پابند بن کر بے بس ہو کر رہ گئی ہیں۔ زندگی میں اگر کوئی تبدیلی ہوتی ہے، تو وہ ارادی نہیں ہوتی، بس اچانک ہو جاتی ہے۔

لیکن مقام حیرت ہے کہ سرکاری دنیا میں ندرت سے اس قدر اجتناب کے باوجود ہمارے شہروں میں اخلاقی اور ادبی جدت کی بھرمار ہے۔ ہر طرف قدیم عقیدے اور اخلاقی اقدار کی اس قدر تضحیک اور تردید ہو رہی ہے کہ ہر پیرانہ سال بزرگ کو اس میں قیامت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ سائنس سمجھتی ہے کہ اس نے قدامت پرستی پر فتح پا لی ہے، اور اپنی فتح کے نشہ میں اس میکانکی عقیدہ کو بڑے جوش اور سرشاری کے ساتھ اپنا رہی ہے، جو زندگی کے علاوہ، ہر چیز کی توجیہہ کر سکتا ہے۔ جو ان خود اعتمادی کے نشے سے سرمست ہیں، کیونکہ ان کے پاس دولت ہے، اور ان کے ہاتھوں میں وہ قلم ہے، جس کی طراوش اخباروں کے صفحات کو زینت بخشتی ہے۔ ادب ہر مستند اصول کی خلاف ورزی کرتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ اور ہر مستند نقاد ہر بیباک تجربہ کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ کوئی شخص کلاسیکی کتابوں کی تعریف کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ شاعری اور مصوری میں انقلاب آفرینی اسی طرح متداول ہے، جس طرح سیاست میں رجعت پسندی اور رواج پرستی۔ اسٹیج نے نسوانی جسم کی کبریائی صفات دریافت کر لی ہیں۔ کپڑے جمالیاتی احساس کے زیر اثر فن کارانہ برہنگی، کا مظہر ہیں۔ اور شراب جو کبھی رسوائے عالم تھی، اب ہر مذاکرہ کا موضوع، اور ہر مہذب گھرانے کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہ سب کچھ ریاست کی قوت مطلق اور فرد کی آزادی کا ایک عجیب امتزاج ہے۔

ہم اس مضحکہ خیز تضاد کی توجیہہ کیوں کر کر سکتے ہیں؟ اس کا ایک سبب ہماری دولت ہے، وہی دولت، جو ہمیں سیاسیات میں قدامت پرست بناتی ہے اور اخلاق میں انقلاب کی بیباکی عطا کرتی ہے جب کیسے دولت سے پر ہوں تو رہبانیت اسی قدر ناممکن اور دشوار بن جاتی ہے، جتنی انقلاب پرستی۔ پارسائی، شراب کے نشہ میں بدمست ہلاک نہیں ہوئی تھی، اس کی جان سونے چاندی کی زہر نے لی تھی۔

یہ حالت کسی حد تک ہمارے دلوں کی متضاد کیفیتوں سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک ہی روح آزادی کی سرمستی بھی چاہتی ہے اور ضبط و نظم کے تحفظ کی بھی خواہاں ہے۔ ایک ہی ذہن بہ یک وقت توانائی، اور خوف کی دھوپ چھاؤں میں مبتلا ہے۔ فرد اپنی آزادی پر ناز کرتا ہے۔ اور پولیس کا سہارا لیتا ہے۔ کبھی ہم ذاتیت کے پرستار بن جاتے ہیں۔ اور کبھی آمریت کے ثنا خواں۔ امریکہ میں بالخصوص، ہم آزادی سے خائف دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے آباو اجداد گو اخلاق کے معاملے میں سختی سے روایتی انداز کے پابند تھے، لیکن سیاست میں آزاد رو تھے۔ وہ اخلاق کا احترام کرتے تھے، لیکن ریاست سے دست و گریبان ہو جاتے تھے۔ اور ہم ریاست کو خدا سمجھتے ہیں، لیکن اخلاق کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہم اخلاق کے معاملے میں لذت پرست ہیں، لیکن ریاست کے لاکھوں قوانین کی متابعت کرتے ہیں۔ گو ہم سیاست کے غلام ہیں لیکن اخلاقی نقطہ نظر سے ہمیں رطل گراں کی آزادی حاصل ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ جب کوئی امریکی آزادی کا ذکر کرتا ہے تو اس کا اشارہ ذہن کی طرف نہیں، پیٹ کی طرف ہوتا ہے۔ امریکہ کی فیڈریشن آف لیبر نے کئی برس ہوئے انقلاب کی دھمکی دی تھی۔ اس دھمکی کی بنا آزاد تجارت نہیں، بلکہ ممانعت شراب تھی۔ آج امریکی شہری کا آزادی کا تصور یہ چاہتا ہے کہ ہر شریف انسان کو شراب پینے کی آزادی

حاصل ہو اور ہر معزز عورت پوری طرح آزاد خیال ہو- یہ بات ان کے نزدیک اہم نہیں کہ ایک پولستانی مہاجر کے تشکک کی وجہ سے میساچیوسٹس کی ایک عدالت نے اسے سولی پر چڑھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی- یا پنسیلوینیا میں پرامن جلسوں کی ممانعت ہے- قدامت پرستی کے پیرانہ سال نمائندے، جو بڑھاپے کے خوف اور الم کو طفلانہ دین داری کی مدد سے کم کرنا چاہتے ہیں- ہر جگہ یہ قانون پیش کر رہے ہیں کہ حیاتیات کی سائنس کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے اور ڈارون اور اس کے تصورات پر قانونی پابندیاں عائد کر دی جائیں- اگر شراب پینے کی آزادی قائم رہے، آزادی افکار جہنم میں جائے- بادہ نوشی پہلے اور فلسفہ بعد میں- ہماری آزادی قانون نہیں چھین رہا ہے- ہمارے ذہنوں کا بے ضرر تساہل اس کا ذمہ دار ہے- مقرر معیاروں کے مطابق تعلیم، بڑھتے ہوئے ہجوم اور اجتماعی تحریکیں ہمیں شخصیت، کردار اور انفرادی فکر سے محروم کر رہی ہیں- جوں جوں گروہ بڑھ رہے ہیں، فرد مٹتے جاتے ہیں- ذرائع اظہار کی فراوانی نقل اور پیروی کو آسان بنا رہی ہے- بتدریج ہم سب ایک جیسے ہوتے جا رہے ہیں اور ہم سب کو لباس، اطوار و اخلاق، گھر کی آسائش اور ذہنی یکسانی، ایک طرح کا لطف و سرور محسوس ہوتا ہے- اور یہ بات تو خدا ہی بہتر جانتا ہے- کہ ہماری اخلاقی آزادی بھی- کہیں ایک طرح کی نقالی ہی تو نہیں اور شراب بھی سوزاک کی طرح شاید اسی لئے فیشن میں داخل ہو گئی ہے کہ اس کے بغیر انسان کی تکمیل نہیں ہوتی- لیکن تھوڑی بہت بغاوت بھی بہرحال جمود سے بہتر ہے، ممکن ہے کہ آزادی کا یہ نشہ ہمارے ذہنوں پر چھا جائے اور فکر کو اپنا معمول بنا لے یہ اچھی بات ہے کہ ہم جبری تعلیم اخلاق کی مدافعت کرتے ہیں- شراب کی فقط اس لئے ممانعت کرنا کہ چند لوگ بدمست ہو کر بدعنوانیوں پر اتر آتے ہیں، ہماری حکومت کی بے بضاعتی کا اظہار ہے- جب حکومت چند احمقوں پر قابو نہیں پا سکتی، تو سب کو احمق بنانا چاہتی ہے تہذیب شراب کے بغیر ناممکن ہے تہذیب ضبط نفس کے بغیر ناممکن ہے- اور جہاں آزادی نہیں وہاں ضبط نفس دم نہیں مار سکتا- مونٹسکو نے کہا تھا کہ وہ چیزیں، جن کی خودداری ممانعت کرتی ہے- اگر قانون ان کی ممانعت کی تصدیق نہ کرے تو وہ زیادہ حد تک ممنوع رہتی ہیں- اگر ہم اعتدال کی تبلیغ پر اس رقم سے نصف خرچ کرتے، جو ہم نے ممانعت شراب کی پابندی کروانے پر صرف کی ہے تو ہم شاید اس وقت تک اپنی پوری قوم کو نشہ سے نفرت کرنے والی قوم بنا چکے ہوتے- آیئے ذرا ہم ان کی بھی سنیں جو ہر قسم کی آزادی کے نام لیوا ہیں- ممکن ہے ان کی باتیں ہمیں تقویت دے کر کچھ دیر کے لئے اپنے ان گنت قوانین فراموش

Scanned with CamScanner

کرنے کی طرف مائل کر دیں۔ اور ہم کچھ دیر آزادی کے پرستاروں کی معیت میں آزادی سے سیر کر سکیں۔

۲۔ آزادی کا مسلک

اس ضبط و نظم کا بیشتر حصہ جو آج انسانیت پر حاوی ہے۔ قانون کا رہین منت نہیں۔ اس کا سرچشمہ زندگی کے اجتماعی اصول اور انسان کی فطرت ہے۔ یہ سرچشمہ حکومت کے وجود سے پہلے بھی موجود تھا اور آج اگر حکومت ختم کر دی جائے تب بھی باقی رہے گا۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کا محتاج ہونا۔ اور ایک کا دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا انسانی فطرت ہے۔ مہذب گروہوں کا ایک دوسرے سے ربط و رشتہ ہے جو لوگوں کو یکجا رکھتا ہے۔ درحقیقت معاشرہ اپنے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے۔ جسے حکومت سے منسوب کیا جاتا ہے؟

یہ ساری باتیں جو اتنی غیر رسمی بے باکی اور سادگی کے ساتھ کی گئی ہیں، آخر کس کی کہی ہوئی ہیں؟ یہ باتیں بہادر اور ٹام پین کی ہیں۔ جو دو انقلابوں کا مبلغ اور دو براعظموں کا معمار تھا۔ امریکہ کا یہ والٹیر انگریزی زبان میں اس صدی کی ترجمانی کر رہا تھا' جسے احیائے علوم کی صدی کہتے ہیں۔ کیونکہ "عہد خرد" میں جب اقتصادی طاقت بے کار اور بے عمل رئیسوں کے ہاتھوں سے زندہ دل تاجر طبقہ کے قبضے میں آئی' تو ہر روایت متزلزل ہو گئی۔ ہر رسم ٹوٹ گئی۔ ہر واہمہ نے انسان پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور انسان نے اپنے آپ کو پہلی مرتبہ آزاد محسوس کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہنگامی طور پر' ماضی نے حال پر سے اپنا تسلط ہٹا لیا ہے۔ بوربون کا پیرانہ سال خاندان برائے نام حکومت کرتا تھا۔ کلیسا اس سماج میں' جہاں تشکک کا دور دورہ تھا اور جہاں پادری بھی خردمندی کا مذاق اڑاتے تھے دیہات میں قوی' لیکن شہروں میں بے بس تھا۔ ہر قانون کی گرفت میں لچک آ گئی تھی ہر اصول پر تنقید ہوتی تھی۔ کسی خوف یا ترمیم کے بغیر فن اور کردار کے ہر معیار کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ یہ وہ عہد تھا جس میں روسو نے ریاست کو ایک برائی قرار دیا تھا۔ اور جیفرسن نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ حکومت کا بہترین ہے۔ جو کم سے کم حکومت کرتی ہے۔ یہ عہد فرد کا عہد تھا۔

انسانی تاریخ کے آغاز سے انسان نے اجتماعی پابندیوں کے خلاف بغاوت کی ہے۔ اور انسان کی فطری بربریت نے ہر قانون کو اپنا دشمن سمجھا ہے۔ روسو نے کہا تھا۔ "قوانین'

جائداد رکھنے والوں کے حق میں مفید ہیں، لیکن بے زر لوگوں کے لئے مضرت رساں۔ قوانین نے کمزوروں پر نئے بوجھ لاد دیئے اور تواناؤں کو زیادہ توانائی، بخشی، انہوں نے انسان کی فطری آزادی کو ہمیشہ کے لئے سلب کر لیا۔ جائداد اور غیر مساوی تقسیم کے قانون کو ازلی اور ابدی مقام عطا کیا۔ ایک چالاک عمل غصب کو ایک اٹل حق بنا دیا اور تمام نسل کو، مزدوری غلامی، اور اندوہ کے بوجھ تلے دبا دیا۔ سب انسان آزاد پیدا ہوئے تھے۔ اور آج وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔"

یہ امر غور طلب ہے کہ تاجر طبقہ کے نصب العین نے آزادی کی وہ طلب پیدا کی جو فردیت کو ایک دل آویز سیاسی فلسفہ بناتی ہے۔ ایڈم سمتھ نے یہ کہا تھا۔ کہ قوموں کی دولت کا انحصار، فرد کی آزادی پر ہے۔ میرابو اور دوسرے مفکرین کا یہ خیال تھا کہ فطرت کو تجارت اور صنعت کے نظم و نسق کی آزادی دے دینی چاہیئے اور ہربرٹ سپنسر نے بینتھم اور سٹوارٹ مل کی آزاد روایت کی پیروی میں ریاست کو تحلیل کرتے کرتے فقط ایک مرکزی نقطہ بنا دیا تھا، جو اس کی جائداد کی محافظ تھی۔ مفکرین سیاست نے متوسط طبقہ کی اس طلب کو منطقی حد تک پہنچا دیا، کہ ہمیں جاگیرداروں کے ٹیکسوں، خاندانی بادشاہوں اور رئیسی خودپسندی سے نجات مل جانی چاہیئے۔ اگر صنعت اور تجارت کی آزادی مفید ہے تو سیاست اور اخلاق میں بھی آزادی ہونی چاہیئے۔ گوڈون کو یہ یقین تھا کہ انسانی فطرت قانون کے بغیر نظم و نسق قائم کر سکتی ہے۔ سب قوانین منسوخ کر دے جائیں تو انسان ذہن اور کردار میں وہ ترقی کرے گا جو اس سے پہلے ممکن نہیں تھی شیلے نے ان خیالات کو اس وقت شعر کا جامہ پہنایا، جب ان کے مصنف نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔ اور اس نے گوڈون کی بیٹی کے ساتھ ان خیالات پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ وطن پرست فکٹے نے فرد کو کائنات کی جڑ اور پھول قرار دیا اور حقیقت کو ایک ایسے ذہن کی تخلیق سمجھا جو خارجی اشیا سے بے تعلق ہے۔ سٹرنر نے جو ایک لڑکیوں کے جامعہ میں پڑھاتا تھا۔ اس فوق البشر کے تصور میں سکون قلب محسوس کیا جو ریاست کے بندھنوں سے آزاد ہو گا!" ریاست کا فقط ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے فرد کی آزادی پر حدیں قائم کرنا۔ اسے مطیع کرنا اور ایک عمومی حیثیت پر لے آنا۔ ریاست اسی حالت میں قائم رہتی ہے کہ فرد کو اس کے اختیارات حاصل نہ ہو۔ "اپنے آپ کو سربلند کرو۔ تو ریاست تمہارا پیچھا چھوڑ دے گی۔" نیطشے نے یہ احتجاج کرتے ہوئے کہ میں نے کبھی سٹرنر کی تحریرات نہیں پڑھیں سٹرنر کے عقائد کی تبلیغ کی۔ زرتشت کہتا ہے "دنیا میں کہیں کہیں ابھی تک انسان موجود ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں

Scanned with CamScanner

فقط ریاستیں ہیں- دنیا میں جتنی بلائیں ہیں ریاست ان سب میں زیادہ سرد مہر ہے- وہ سرد مہری سے جھوٹ بولتی ہے اور یہ جھوٹ مسلسل اس کے ذہن سے نکلتا رہتا ہے-" ریاست کہتی ہے "میں عوام ہوں" یہ بات سفید جھوٹ ہے؟ خالق اور تعمیر کرنے والے وہ تھے جنہوں نے عوام کی تخلیق کی اور انہیں ایک عقیدہ اور ایک محبت کے رشتے میں منسلک کیا- یہ خالق زندگی کے خدمت گزار تھے- ان کے مقابلے میں وہ لوگ تخریب کے بانی ہیں- جو لوگوں کے لئے دام بچھاتے ہیں اور اس دام کو ریاست کا نام دیتے ہیں- لیکن ریاست ہر نیک و بد کی زبان میں دروغ گو ہے- جو کچھ وہ کہتی ہے، جھوٹ ہے جو کچھ اس کے پاس ہے، چرایا ہوا مال ہے- جہاں ریاست ختم ہوتی ہے- وہی حقیقی انسان کی ابتدا ہے- میرے دوستو! جہاں ریاست ختم ہوتی ہے ذرا اس نقطہ پر نظر ڈالو کیا تمہیں وہاں فوق البشر کی قوس قزح اور پل کا جلوہ نہیں دکھائی دیتا؟"

آزادی مطلق کی یہ آرزو عالم گیر ہے- سقراط کے تلامذہ میں سے کلبی فطری زندگی کو آئینی حکومت پر ترجیح دیتے تھے اور ارسٹپس کی طرح یہ چاہتے تھے کہ وہ کسی اور انسان کے آقا یا غلام بن کر نہ رہیں- رواقیوں میں سے چند مفکر اس جنت الارض کے متمنی تھے، جہاں ہر چیز مشترکہ ملکیت ہو اور آئینی علائق کم ہوں- ابتدائی مسیحیوں میں طاقت کا استعمال ممنوع تھا- اور جب تک دولت کا دور دورہ نہیں تھا، لوگ امن اور دوستی کے رشتوں میں منسلک تھے- "اصلاح مذہب" کے عہد کا مسیحی آزادی کے گیت گاتا تھا اور شادی کی تنسیخ کو جنت حاصل کرنے طرف پہلا قدم سمجھتا تھا- انقلاب فرانس میں مرات اور ہبوف نے صبح آزادی اور شام ریاست کا اعلان کیا- پروڈھون نے لکھا ہے کہ "انسان کی انسان پر حکومت خواہ اس کی صورت کچھ بھی ہو، غلامی ہے- سماج کا کمال، ضبط و نظم اور آزادی کے امتزاج سے حاصل ہو سکتا ہے- کسی سماج میں انسان پر انسان کا اختیار اسی نسبت سے کم یا زیادہ ہوتا ہے، جس نسبت سے اس نے ذہنی ارتقا کی منزلیں طے کی ہوں" انقلابی روس میں ٹالسٹائے نے حکومت کی تعریف یہ کہہ کر کی تھی کہ "حکومت صاحب جائداد لوگوں کا ایک اجتماعی ادارہ ہے، جو جائداد کے تحفظ کے لئے وجود میں آتا ہے-" باکونین نے اپنی دولت اور جائداد ترک کر کے یہ پیش گوئی کہ کہ ۱۹۰۰ء میں تعلیم اتنی عام ہو جائے گی کہ ریاست ایک غیر ضروری ادارہ ہو کر رہ جائے گی اور لوگ فقط فطرت کے قوانین کی پابندی کیا کریں گے- کروپٹکن نے جو ایک شریف اور آزادی پسند رئیس تھا یہ تصور پیش کیا کہ جنت الارض میں مردوں اور عورتوں کو فقط ایک گھنٹہ روزانہ کام کرنے کی

Scanned with CamScanner

ضرورت ہو گی اور کسی حد تک یہ بات ثابت کر کے دکھا دی کہ انسان سے انسان کی فطرتی معاونت ہر جامع اجتماعی نظام کی بنیاد رہی ہے اور جو ہر طرح کی ریاستی مجبوریوں سے کہیں زیادہ صحت مند اور موثر ہے۔ انگلستان میں ولیم مورس نے حکومت کی تعریف یوں کی کہ وہ ایک خوش گوار عدم ہے۔ جہاں پارلیامنٹ کے ایوان بہشت کی کھاد کا ذخیرہ جمع کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ امریکہ میں ایمرسن نے کہا کہ "میرے لئے اپنی فطرت کے قانون کے علاوہ اور کوئی قانون مقدس نہیں اور میری نظر میں صرف وہ حق محترم ہے جو مجھے فطرت نے عطا کیا ہے" و ہٹمین نے کہا کہ "حکومت اس وقت کی تیاری کا نام ہے، جب انسان اپنے آپ پر خود حکومت کریں گے۔" اور تھورد نے اپنی خوبصورت پنسلیں بناتے ہوئے کہا۔ "میں خوشی سے اس اصول کو قبول کرتا ہوں کہ وہ حکومت بہترین ہے۔ جو حکومت نہیں کرتی۔ اور جب لوگ اس طرح کی حکومت کے لئے تیار ہوں گے تو انھیں اسی قسم کی حکومت مل جائے گی۔"

۳۔ مزاجیت

آزادی کے اس دلیرانہ مسلک کے متعلق آخر ہم کیا کہیں؟ اجتماعی نظام کہاں تک فطری ہے اور کتنی مدت تک وہ قانون کے سہارے کے بغیر چل سکتا ہے؟ انسان کو کس حد تک آزادی مل سکتی ہے؟

انسانی معاملات میں ہر مصنوعی چیز کا ایک فطری ماخذ ہے اور اس طرح کی ہر فطری چیز کی نشوونما مصنوعی ہوتی ہے۔ اظہار فطری ہے، لیکن زبان مصنوعی۔ مذہب فطری ہے اور کلیسا مصنوعی۔ سماج فطری ہے اور ریاست مصنوعی۔ زبان اور دین کی طرح قانون کی اطاعت بھی اجتماعی تعلیم اور تدریس کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ یہ انسانی جبلتوں سے پیدا نہیں ہوتی اسی لئے ہر شخصیت میں ہمیشہ دل کی آرزو اور قانون کے خوف کے درمیان ایک پیہم کش مکش جاری رہتی ہے، اسی لئے باغی اجتماعی مقبولیت کے سہارے کسی مصنوعی اور تکلیف دہ پابندی کی خلاف ورزی کرنے میں ایک خاص لذت حاصل کرتے ہیں۔ ہم فطرتاً بدنظمی کو پسند کرتے ہیں، لیکن تعلیم ہمیں نظم و ضبط سکھا کر شہری بناتی ہے۔

اگرچہ حریم روح میں ہماری حیثیت انتشار پسند وحشیوں کی سی ہے، لیکن کسی حد تک ہم میں فطرتاً یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ نظم اور نفاست کو پسند کریں۔ اجتماعی زندگی انسان کے مقابلے میں قدیم تر ہے۔ اور حیوانوں کے مقابلے میں بھی قدیم تر ہے۔ ادنیٰ حیوانوں

Scanned with CamScanner

میں بھی اتباع کی صلاحیت موجود ہے اور اس میں تقسیم کار کا رواج بھی ہے۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی زندگی فطرت کے اس تقسیم کار کی بہترین مظہر ہیں۔ فطرت اجتماعی زندگی میں اسی تقسیم کار کے اصول کے ماتحت مخلوق کی جسمانی ساخت میں بھی فرق پیدا کرتی رہتی ہے۔ اور ضرورت کے مطابق اس میں مشنیات سے بھی کام لیتی ہے۔ چنانچہ کتا اسی طرح کے مشنیات میں سے ایک ہے جو گوشت خور جانوروں کے زمرے میں شامل ہو کر بھی اس قدر سلیم الطبع ہے کہ اسے پالتو جانوروں میں سب سے پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈارون کہتا ہے کہ ہمادریاس بندر کیڑوں کی جستجو میں پتھروں کو الٹتے پلٹتے ہیں۔ اور جب انہیں کوئی بڑا کیڑا نظر آتا ہے تو سب اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور لوٹ میں شرکت کرتے ہیں .... خطرہ کے وقت بھینسے، بھینسوں اور بچھڑوں کو ریوڑ کے اندر دھکیل دیتے ہیں اور باہر رہ کر حملہ کی مدافعت کرتے ہیں۔ خطرہ کی حالت میں گھوڑے سر جوڑ کر اور ٹانگیں باہر رکھ کر ایک دائرہ بنا لیتے ہیں۔ جس طرح گال قوم کے لوگ جنگ کے وقت عورتوں کو درمیان میں رکھا کرتے تھے (یقیناً نپولین کے ذہن میں بھی بے بسوں کا تحفظ تھا جب اس نے اہرام مصر کی جنگ میں کہا کہ "گدھوں اور پروفیسروں کو درمیان میں رکھو)۔ غالباً مدافعت کے اس اتحاد میں حیوانی اجتماع نے جنم لیا تھا۔ اور اس کے ذریعہ انسانیت میں ایک اجتماعی جبلت پیدا ہو گئی۔

اس فطری بزم پسندی کے ساتھ خاندانی تعاون کو شامل کر لیجئے تو ایک فطری اجتماعی نظام کا تصور زیادہ قابل قبول ہو جاتا ہے۔ ڈارون کہتا ہے کہ "اجتماعی جبلت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب بچے خاصی مدت تک والدین کے پاس رہیں۔" انسانیت کی برادری تاریخ کی طرح قدیم ہے۔ یہ ہزاروں خفیہ جماعتوں اور گروہوں کو زندگی بخشتی ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا وحشی موجود ہو، جس نے کبھی بھی انسانیت کے ساتھ ایک جسمانی تعلق اور ربط محسوس نہ کیا ہو۔ فطری دوست داری کے ساتھ والدین کی نگہداشت ہمیں امداد باہمی پر مائل کرتی ہے اور دوسروں سے ہمدردی محبت کی طرح فطری اور والدینی تحفظ کی طرح عالمگیر ہے۔ کانٹ حیران تھا کہ دنیا میں جس قدر رحم دلی ہے اسی قدر انصاف کی کمی ہے۔ یہ غالباً اس لئے کہ رحم دلی۔ فطری ہمدردی ایک شکل ہے اور انصاف شعور اور خرد سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کم عدل پسند اور نسبتاً زیادہ رحم دل ہیں۔

اجتماع، ان فطری اور اقتصادی بنیادوں پر استوار ہو کر فرد میں وہ اجتماعی عادتیں راسخ

Scanned with CamScanner

کرتا ہے، جو بالآخر فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں اور یہ فطرت ہر قانون سے زیادہ نظم و نسق کی ضامن بنتی ہے۔ ہم جتنے زیادہ زندہ رہیں اتنے ہی زیادہ بزم پسند ہوتے جاتے ہیں اور ہمسایوں کے لئے ہماری رواداری اسی حد تک بڑھتی جاتی ہے۔ ہم زیادہ نقال اور رسم و رواج کے زیادہ پابند ہو جاتے ہیں اور ان پابندیوں کے زیادہ خوگر جو تہذیب کو طاقت کی نہیں، عادت کا محتاج بنا دیتی ہیں۔ ہر منظم نفسیاتی طاقت فرد کو اجتماعی رشتوں میں جوڑنا چاہتی ہے۔ کلیسا نے اپنی ابتدا ہی سے ان اخلاقی مواعظ کی بوچھاڑ کر دی، جن کا تھوڑا سا اثر۔ اس کی دینیاتی اساس اکھڑ جانے کے بعد بھی باقی ہے۔ جوں جوں والدانہ اور کلیسائی اختیارات کم ہوتے گئے، مدرسہ ان کی جگہ لیتا گیا۔ یہ بظاہر فرد کو اقتصادی اور فنی فتوحات کے لئے تیار کرتا رہا۔ لیکن خاموشی سے یہ اس کے اخلاق پر یوں اثر انداز ہوتا رہا کہ وہ اس حکومت کو راس آ جائے جس کے ماتحت وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ مدرسہ اس کی ساخت میں اجتماع کی مخصوص عادتیں اور اخلاق پیدا کرتا ہے اور بڑے انکسار کے ساتھ تاریخ کی عریاں صداقتوں کو اس طرح چھپاتا ہے کہ اپنی قوم کا ماضی اس قدر درخشاں اور پر اجلال نظر آتا ہے کہ انسان اپنی قوم کے جاہ و جلال میں اضافہ کرنے کی خاطر ہر ممکن قربانی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگر مدرسہ یہ کام نہ کر سکے یا فرد ہجرت کر کے اس سے فرار کرے تو اخبار اس کام کو جاری رکھیں گے۔ ایجادات، شہری اجتماع سے اس امر میں تعاون کرتی ہیں کہ ہر ذہن تک "خبریں" پہنچ جائیں اور ان کے بین السطور جو عقائد ہوتے ہیں، وہ لوگوں میں رس بس جائیں۔

جب ہم ان اثرات پر نظر ڈالتے ہیں تو اچھے کردار کی طرف رجحانات اس قدر اٹل ہیں کہ انسان یہ سوال پوچھ سکتا ہے کہ اخلاق پھیلانے کے لئے قوانین کی کیا ضرورت ہے؟ سماج، فرد سے زیادہ اصلیت رکھتا ہے گمپلووکز کہتا ہے "انسان وہ اجتماع سوچتا ہے۔ جس کا وہ ایک حصہ ہے" اس کا ضمیر بھی اس کے اجتماع کی آواز ہے۔ نپولین نے کہا تھا کہ "انسان اخلاقی اور مادی حالات کی پیداوار ہے" حیاتیاتی وراثت کی بنا پر ہم اپنے حیوانی ماضی سے وابستہ ہیں۔ اجتماعی وراثت کی بنا پر اور اپنے گروہ کے اخلاق اور روایات کو اپنا لینے کی عادت کی بنا پر ہم اپنے انسانی ماضی سے وابستہ ہیں۔ اور استحکام کی قوتیں ہماری جبلتوں میں اس قدر رچی ہوئی ہیں کہ ہمیں ریاست کے مصنوعی اخلاق کی ضرورت ہی نہیں۔

چونکہ یہ اثرات ہمارے حساس ترین عہد یعنی بچپن میں کام کرتے ہیں، ہم ان پر ایک کش مکش کے بعد ہی قابو پا سکتے ہیں، جس سے ہمارا ذہنی توازن معرض خطر میں آ جاتا ہے۔

جب ہم اپنے زمانہ اور اپنے ملک کے اخلاقی اصولوں کو خیرباد کہتے ہیں، تو ہم پر ایک غریب الوطنی کی سی اندوہ ناک کیفیت چھا جاتی ہے اور جب ہم کوئی محفوظ قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ انہیں راہوں پر ہوتی ہے، جنہیں ماضی نے ہمارے لئے تراشا ہے۔ مطمئن لوگ وہ ہیں جو اپنے اجتماع کے اطوار و اخلاق اور اصول و قواعد کو بلا حیل و حجت اختیار کرتے ہیں اور اجتماعی زندگی میں کسی امتیاز کے بغیر جذب ہو جاتے ہیں اور سپردگی کے امن میں جو محبت کی غنودگی میں مانند ہے۔ گم ہو جاتے ہیں۔ اجتماعی زندگی جتنی وسیع اور عظیم ہوگی فرد کو وہ اسی حد تک اس بات پر مجبور کرے گی، کہ وہ ہر معمولی سی بات میں بھی اپنی انفرادیت کو مٹا دے۔ آخر کار ایک وسیع آبادی، ایک غیر متحرک جسم بن جاتی ہے۔ اجتماع کی فطری قدامت پسندی، ریاست کی خودپرستی سے بڑھ جاتی ہے فرد جو اجتماع کا عکس ہوتا ہے تسلیم و رضا کا اتنا خوگر ہو جاتا ہے کہ قانون کی پابندیاں اور سزائیں غیر ضروری معلوم ہونے لگتی ہیں اور ہم وقتی طور پر اس عقیدہ بے نظمی کے حامی بن جاتے ہیں، جس کے اکثر پیروؤں کو ہم جلا وطن کر دیتے ہیں، قید کر دیتے ہیں یا سولی پر چڑھا دیتے ہیں۔

۴۔ آزادی کی مشکلات

ہمیں مطمئن رہنا چاہئے کہ اس فلسفہ آزادی میں بہت سے نقائص ہیں جب فلسفہ طاقتوروں کے تشدد کو کسی حد تک نظر انداز کرتا ہے۔ جو جبری حکومت ریاست کی تشکیل کرتی ہے، وہی حکومت ریاست کی عدم موجودگی میں اعلانیہ اور کھلم کھلا اور زیادہ الم اور ابتری کے ساتھ لوگوں پر جبر کرے گی۔ تہذیب کسی حد تک ظالم کے ظلم پر پابندیاں عاید کر کے ضبط و نظم پیدا کرتی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کی نزاکت، طاقتوروں کے درمیان پیکار کے ممکنات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس نظام میں صرف چھوٹی ریاستیں نیک ہیں۔ سقراط نے ارسیٹپس سے کہا کہ اگر انسانوں میں زندگی بسر کرتے ہوئے تم یہ سوچو کہ حاکم اور محکوم کے تعلقات ختم ہو جائیں تو تم یہ دیکھو گے کہ طاقتور کس طرح کمزوروں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ ہر نئی ایجاد طاقتور کے ہاتھ مضبوط کرتی ہے اور سنگ دل زیرک بے وقوفوں نیک اور کمزور لوگوں پر اس ایجاد کی مدد سے زیادہ تصرف حاصل کر لیتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں ہر نشوونما ظالم اور مظلوم کے باہمی فصل میں اور اضافہ کرتی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے لیکن اجتماع، اعلیٰ قدروں پر استوار نہیں ہوا، بلکہ اس کی بنیاد انسانی فطرت پر رکھی گئی ہے اس کی قدریں اپنی فطرت پر پردہ پوشی کی ایک کوشش ہیں۔

Scanned with CamScanner

پھر وہ اجتماعی محرکات، جن پر فطری نظام کھڑا ہے۔ ان انفرادی جبلتوں سے کہیں زیادہ کمزور ہیں۔ جو حصول دولت، پیکار اور غلبہ سے متعلق ہیں، جو ہمارے اقتصادی نظام کی تہ میں کارفرما نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ آزادی کی پکار بھی اس دل سے اٹھتی ہے، جو طاقت کا بھوکا ہے۔ انسانی صیاد کی اسی بھوک کی وجہ سے آزادی پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ جو لوگ کسی حد تک کمزور ہیں وہ اکثریت کے خیالات کے زیر اثر فرد کی آزادی کو کم کرنا چاہتے ہیں کہ کہیں یہ ظالم و مظلوم کی باہمی کشاکش انقلاب کی صورت اختیار نہ کر لے۔ آزادی کی پہلی شرط اس کی پابندی ہے۔ زندگی متضاد قوتوں کے درمیان ایک توازن ہے۔ انسان اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں۔ کہ پابندیوں کے بغیر ان کے قدرتی اختلافات اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ انسانیت ایک غیر متحرک تقسیم کی نذر ہو جائے گی۔ اہل فرانس نپولین سے محبت کرتے تھے کیونکہ آمریت کا پابند اور پیر ہونے کے باوجود وہ ہر صورت میں ذاتی صلاحیت اور ثقافت کی قدر کرتا تھا۔ اور اس نے ایک عدیم المثال خوش حالی کی بدولت لوگوں کو وہ مساوات بہم پہنچائی جسے بزدل لوگ آزادی سے بھی زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اس لئے آزادی کے عہد، عبوری دور ہوتے ہیں۔ اور پابندی رواج اور تنظیم کے دوروں کے درمیان محض وقفے بن جاتے ہیں۔ وہ اسی وقت تک قائم رہتے ہیں، جب تک غلبہ کے لئے دو نظاموں کی کش مکش شروع نہ ہو جائے۔ جب ایک نظام دوسرے پر غالب آجاتا ہے تو آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز بھی آزادی کے لئے اتنی مہلک نہیں، جتنا کہ انقلاب۔ ایک عینی بشر کا عظیم ترین المیہ اس کے نصب العین کی تکمیل ہے۔

کیا یہ وجہ ہے کہ تاریخ میں جہاں کہیں بھی کوئی ایسا نظام رونما ہوا جو انسان کی فطری دولت داری پر استوار تھا، وہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہی ریاست کے مصنوعی اور جبری سانچہ میں ڈھل گیا؟ یہ ایک وسیع مسئلہ ہے اور اس کا ایک جواب نہیں ہو سکتا۔ لیکن یقیناً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خاندان کی جگہ فرد، سماج اور پیداوار کی اکائی بن گیا۔ بظاہر خاندان، بچہ کی نگہداشت اور پرورش کے معاملہ میں بھی اپنے حقوق کھو رہا ہے۔ فرزندانہ ادب اور برادرانہ وفا کی جگہ جدید روح نے فقط وطن پرستی کو اپنا اعلیٰ اخلاق بنا لیا ہے۔ اپنے وظائف سے محروم ہو کر، خاندان گل سڑ رہا ہے۔ بقا فقط خود پسند افراد کے حصے میں آئی ہے، جو ایک مشترکہ غلامی میں خودمختار ہیں۔ جب آقا غیر مرئی ہو تو غلامی بھی آزادی معلوم ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

اس کے ساتھ ساتھ شہروں میں لوگوں کا اجتماع' ہمسائیگی کے آداب کو ختم کر رہا ہے۔ خودپسندی کا ہر محرک اجتماع کی گمنامی میں آزاد ہے۔ سادہ دیہاتی زندگی کی طرح جہاں فطری نظام قائم ہے' قانون کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جہاں فطری نظام کمزور ہے' وہاں آئین سازی کی افراط ہے۔ ریاست' فطری نظام کی جگہ لے رہی ہے۔ جس طرح' بڑی بڑی کمپنیاں' چھوٹے تاجر کی اور ریلیں گھوڑا گاڑیوں کی جگہ لے رہی ہیں زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی نے ہمیں ایک پیچیدہ کل کا جزو بنا دیا ہے۔ اور ہم سے اجزا کی وہ خود اختیاری چھین لی ہے۔ جو ہمیں اس وقت میسر تھی جب خاندان اقتصادی طور پر ایک خود مختار اکائی تھا۔ سیاسی اور صنعتی آزادی ختم ہو رہی ہے اور اخلاقی ابتری بڑھ رہی ہے۔ خاندان اور مذہب اب سماجی نظام کی بنیاد نہیں رہے' اس لئے انسان میں فطری ضبط و نظم کی طرف سے جو انحراف روز افزوں ہے' صرف قانونی تشدد کی مدد سے کم ہو سکتا ہے۔ صنعت اور ریاست کی آزادی ختم ہو گئی ہے۔ آزادی اب صرف جنسی غدودوں میں باقی رہ گئی ہے۔

اگر پیداوار کے آلات وہی رہتے جو ہماری بربری سادگی کے زمانہ میں تھے تو ریاست اس قدر مہیب اور فرد شکن کبھی نہ بنتی۔ اس وقت ہر شخص کے پاس اپنے آلات ہوتے اور وہ اپنے حالات پر قابو پا سکتا۔ اس کی آزادی کی اقتصادی پناہ قائم رہتی اور سیاسی آزادی' سیاسی مساوات کی طرح ایک بے معنی لفظ بن کر نہ رہ جاتی۔ لیکن ایجادوں نے آلات کو زیادہ پیچیدہ اور زیادہ قیمتی بنا دیا۔ اس نے انسانوں کی قدر کو مشینوں کو استعمال کرنے کی اہلیت سے جانچنا شروع کر دیا اور بالاخر آلات کی ملکیت چند لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ خود کفایتی ختم ہو گئی اور آزادی۔ محض سیاست دان کا ایک قول بن کر رہ گئی۔ جس کے مزار پر ہم اکثر پھول چڑھاتے ہیں۔

ہر طرف سے ہم نشوونما کی ان موجوں کی زد میں آ گئے ہیں جو قدیم اور فطری آزادی کو بہا کر لے گئیں۔ ہمارے صنعتی تعلقات اتنے اہم ہیں۔ کہ انہیں انفرادی اختیار کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ بعض وظائف' مثلاً نقل و حرکت مالیات اور ذرائع اظہار اتنے قوی ہیں کہ آئینی پابندیوں کے بغیر وہ کسی وحشی درندہ کی طرح ساری صنعت کو تباہ کر سکتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ بات غنیمت ہے' کہ یہ وظائف ریاست کے اختیار میں ہیں۔ اگرچہ ہمارے عہد میں ہر ریاست کو نااہل جانب دار اور بداخلاق ہونا پڑتا ہے۔ غالباً اقتصادی زندگی کا ہر اہم شعبہ قومی اختیار میں ہونا چاہئے اور صانع اور خریدار کے درمیان ہر رشتہ غیر ذمہ دار افراد کے تسلط سے آزاد ہونا چاہئے۔ پیداوار ہر صورت آزاد رہنی چاہئے۔

Scanned with CamScanner

جب یہ تعلقات اور رشتے انصاف پر مبنی ہوں گے تو صانع اور خریدار کے رشتے انسانی ہوس سے قطع نظر آزاد ہوں گے۔ اقتصادی امراض اور ان دلالوں سے نجات حاصل کر کے جو مبادلے کے رشتوں کو سخت بنا رہے ہیں اور ہمارے عہد دولت میں ہماری صنعت کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری صنعت پھلے پھولے گی۔ انفرادی کوشش زیادہ آزاد ہو گی۔ امداد باہمی کے ادارے ہمارے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے حملوں سے محفوظ رہیں گے۔ اور آزادی اس طرح تربیت حاصل کر کے پہلے سے زیادہ گہری اور متمول ہو جائے گی۔

۵۔ جیفرسن کا تصور ریاست

ہم نے ریاست کی حمایت اور حق میں جو کچھ کہا ہے۔ اس میں ایک طرح کا جبر شامل ہے۔ اس لئے کہ جیفرسن کا وہ تصور حکومت جس میں حکومت کا عمل دخل کم سے کم ہوتا ہے، اپنی سادہ دلکشی کی بنا پر دل میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور ہر نیا قانون روح کی خود اختیاری کی توہین کے مترادف ہے نظم آزادی کا ایک وسیلہ ہے، خود نصب العین نہیں۔ آزادی کی قدر و قیمت بے اندازہ ہے۔ کیونکہ وہ نشوونما کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ جیسا کہ گوئٹے نے کہا تھا۔ جب ہم زندگی میں مختلف چیزوں کی قدر متعین کرنے لگتے ہیں۔ تو بالاخر شخصیت کی اہمیت سب سے مقدم ہوتی ہے ریاست انسان کے لئے بنی تھی۔ انسان ریاست کے لئے نہیں۔ وراثت کا مقصد اختلافات کا تحفظ تھا اور ہر رواج کسی نظیر کی شکست کا نتیجہ ہے۔ ارتقا اختلاف اور انقلاب کے سہارے پھلتا پھولتا ہے۔ اجتماعی ارتقاء ضبط و آئین کے ساتھ ساتھ اختراع اور تجربہ کا طالب ہے۔ تاریخ غیر شخصی قوتوں اور وحشی گروہوں کے علاوہ عظیم ذہنوں اور اختراعوں کے ذریعہ آگے بڑھتی ہے۔

اگر ہم اپنی اقتصادی زندگی کی حد بندی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ذہن کی آزادی کی اور زیادہ حفاظت کرنی چاہئے۔ ذہنی آزادی ہمیں کم از کم اتنی عزیز ہونی چاہئے جتنی جسمانی آزادی ایک حیوان کو ہوتی ہے۔ حیوان کو قید کر دیا جائے تو وہ کبھی اپنی اسیری پر مطمئن نہیں رہتا اور برابر بے چینی کے ساتھ آزادی کی راہیں تلاش کرتا رہتا ہے۔ ان قابل رحم اسیروں کو اور ان کی ان نگاہوں کو جن میں آزادی کی تمنا افسردگی بن کر چھائی ہوئی ہے، ہم بغیر رنج و غم کے کسی احساس کے دیکھتے اور خاموش رہتے ہیں۔ غالباً اسی بے حسی کی سزا ہے کہ قدرت نے ہم سے وہ آزادی چھین لی جو ہمارے آباؤ اجداد کو میسر تھی۔ وہ آباؤ

Scanned with CamScanner

اجداد جو حیوانوں سے باقاعدہ جنگ کر کے انہیں مارتے تھے، لیکن انہیں قید کر کے اپنی نظر کے لئے سامان تفریح بنانے کے خیال سے اجتناب کرتے تھے۔ لیکن جب ہم خود بھی اسیر ہیں اور شکوہ نہیں کرتے تو ان مقید حیوانوں کی آرزوؤں کا اندازہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

ایک چینی ضرب المثل ہے کہ جب کوئی قوم بہت سے قوانین بنانے شروع کر دے تو یہ سمجھ لو کہ اس پر بڑھاپا آ رہا ہے۔ قدیم تھورین ہر نئے قانون کے ناکام مجوز کو سزا دیتے تھے، کیونکہ وہ آزادی پر غیر ضروری پابندیاں عائد کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ امریکہ کے آئین ساز سال میں کوئی سولہ ہزار قانون بناتے ہیں اگر یہ صحیح ہے تو ہم ایک چوروں کی قوم ہیں، جسے قانون کی نہیں تعلیم کی ضرورت ہے۔ کانگرس کے اجلاس امیروں اور غریبوں دونوں کے لئے خوف کا سرچشمہ ہیں اور غالباً اس خاموش احترام کی جو ہمارے دلوں میں صدر کولج کے لئے تھا، وجہ یہ تھی کہ وہ بادشاہ انگلستان کی طرح فقط اپنا مشاہرہ وصول کرتا تھا۔ جب وہ کسی قانون پر خط تنسیخ کھینچتا تو لوگ ممنون ہوتے۔ ممکن ہے کہ یہ قانون اچھے رہے ہوں، لیکن ایک اچھا قانون بھی قانون ہے اور اس کی میت پر کوئی ماتم نہیں کرتا۔

اگر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری اخلاقی لاآئینی میں بھی اتنی بڑی برائی نہیں جتنی کہ وہ لوگ سمجھتے ہیں جو دوسروں کو نیکی کی تلقین کر کے اپنے ضمیر کو آسودہ کر لیتے ہیں، تو یہ مفروضہ ہے کہ ہماری بہت سی بداخلاقی دیانت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہم بوڑھے بھی اپنی مفلس جوانی میں بدعنوانیاں کرتے تھے۔ ہم تخلیہ میں گناہ کرتے تھے اور بزم میں پارسا شکلیں لے کے جاتے تھے۔ آج کل کے جوان پردہ داری کے اتنے ماہر نہیں اور اپنے گناہوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ ان کے گناہ سطحی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ڈھلتے جائیں گے۔ تجربہ انسانوں کو اتنا پختہ بنا دے گا کہ وہ توازن اور حیا کو بحال کر سکیں۔ ہم لوگوں کو شراب نوشی کی عادت سے اسی طرح روک سکتے ہیں، کہ انہیں اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر برہنگی آج منظر عام پر نظر آتی ہے اور جنسی تحریک نے جنسی خوابوں کی جگہ لے لی ہے تو کیا ہوا؟ عادت آہستہ آہستہ، مناسبت کو بے کیف کر دے گی اور لباس کو آرزو کے التباسات پیدا کرنے کے لئے بحال کرنا پڑے گا۔

جوانوں کی اس عظیم الشان بغاوت کے برعکس بڈھے صرف قوانین کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ ہر بزدل اور حاسد آواز امریکہ کے آئین سازوں کو پکارتی ہے کہ اخلاق کی حفاظت کرو، کیونکہ چند ہوسناکوں نے اسٹیج کو جلب منفعت کی خاطر ناپاک کر دیا ہے۔ تھکے ہوئے لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہر فلم اور ڈرامہ عام نمائش سے پہلے قانون کی نظروں

کے سامنے پیش کیا جائے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ پہلے ہی پولیس کو یہ اختیار تھا کہ وہ ناپاکی کو دور کرنے کی خدمت انجام دے۔ نئی پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رائے عامہ افراط تفریط کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور کسی قانون سے زیادہ موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ عین اس وقت جب امریکہ نے حقیقی معنی میں اپنا ادب، اپنا فن اور اپنا ڈرامہ پیدا کرنا شروع کیا ہے، ہم نے پارسائی کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی تو ہمیشہ کے لئے اپنے نام پر طفلانہ حماقت اور تعصب کا داغ ثبت کر دیں گے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے لئے چارلز ودم، کرامویل سے بہتر ثابت ہو گا۔

خوش قسمتی سے زندگی جوانوں کا ساتھ دے رہی ہے اور جوانی زندگی کا ممکن ہے ہماری اولاد خودکشی کو اپنا شعار بنا لے اور کھیلوں کو فلسفہ علم پر ترجیح دینے لگے اور شراب پینے سے پہلے دعا مانگنا ضروری نہ سمجھے۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے۔ کہ ہمارے زمانہ کے نوجوان کس قدر صحت مند اور خوش ذوق ہیں۔ جوانوں کو خوش رہنا چاہئے۔ بہت جلدی وہ بوڑھے ہو جائیں گے اور جسم کی علالت انہیں نیک بنا دے گی۔ اگر اخلاق ہنگامی طور پر ضعیف ہو جائیں تو علم و حکمت کے اضافہ سے ان میں خود بخود توانائی آ جائے گی۔ جیسا کہ سقراط نے کہا تھا، ہمیں منع کرنے کی بجائے تعلیم دینی چاہئے۔ اگر ہمیں دوسروں کے اخلاق کی اصلاح منظور ہے تو پہلے اپنا کردار بہتر بنائیں۔ مثال، درس اخلاق سے کہیں بہتر ہے۔ مثال کی آواز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ اس کے آگے درس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اجتماع کے لئے ہم بہترین چیز یہ کر سکتے ہیں کہ اسے قوانین سے پابہ زنجیر نہ کریں بلکہ اپنی زندگیوں کو برداشت تحمل اور خودداری سے آراستہ کریں۔ ایک شریف انسان کا صرف اپنا اخلاق ہوتا ہے۔ وہ وقت ضرور آئے گا جب لوگ یہ سمجھنے لگیں گے کہ حکومت کا اہم ترین فریضہ آئین سازی نہیں بلکہ تعلیم دینا ہے۔ قانون نہیں مدرسے بنانا ہے۔ ایک زیرک استاد کی طرح ایک عظیم سیاست دان، معلومات کے ذریعہ راہبری کرتا ہے اور ممنوعات اور فرامین کے ذریعہ تشدد طلب نہیں کرتا۔ اس کا اصول ہو گا۔ تعلیم پر کروڑوں خرچ کرو، جبر پر ایک دمڑی نہیں۔ ریاست جو امن پسند کسانوں پر ظالم گڈریوں کے حملوں اور ٹیکسوں سے پیدا ہوئی تھی، شاید پھر ایک سربلند قوم کی عظیم قیادت کا ذمہ لے لے جس طرح کہ اس نے کچھ مدت کے لئے اینٹونائنیس کے عہد میں کیا تھا۔ ہمیں اپنی نسل کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہئے کہ ہماری حکومت ہمیشہ سیاست دانوں کے ہاتھوں میں رہے گی۔ ہر روز علم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر روز ثقافت کا سرمایہ بڑھ رہا ہے اور ساری انسانیت پر چھا رہا

Scanned with CamScanner

ہے۔ بہت جلدی انسان ان کم علم انسانوں کو برداشت نہیں کریں گے، جنہیں ہم نے اپنے
صبر و تحمل کے ساتھ اتنی مدت تک برداشت کیا ہے۔ ہمارے بچوں کے بچے ہماری آغوش
پرورش میں پروان چڑھ کر اپنے اپنے حکام کا انتخاب ہم سے زیادہ بہتر طریقہ پر کریں گے
وہ آئین سازوں کا نہیں اچھے استادوں کا مطالبہ کریں گے۔ وہ تنظیم نہیں علم مانگیں گے
وہ تشدد اور جبر کے ذریعہ نہیں، بلکہ ذہانت کے عمومیت اور توسیع کے ذریعہ، امن اور نظم و
نسق حاصل کریں گے۔"

Scanned with CamScanner

باب ہشدہم

کیا جمہوریت ناکام رہی ہے؟

۱۔ جمہوریت کے ماخذ

جمہوریت جس کا، بقول موںٹسکو کے بنیادی اصول نیکی ہے، دولت اور بارود سے پیدا ہوئی۔ توپوں اور بندوقوں نے جاگیرداری نظام کو پارہ پارہ کر دیا۔ جاگیردار شہسواروں کو پیادہ فوج کا شکار بنایا اور جنگ میں آقا اور غلام کو مساوی درجہ عطا کیا اور فیثا غورث کے بعد تعداد کو پہلی بار ایک بلند مقام دیا۔ سکے اور قرض نے تجارت اور اجتماع دولت کی راہیں آسان کر دیں۔ اس نے تجارت کے مرکزوں کے قریب بھرے شہر آباد کئے اور بندرگاہوں پر ایسی آبادیاں قائم کیں، جو جاگیرداری کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اس نے ایک بے کار رئیسیت کے مقابلے میں ایک توانا اور قوی تجارتی طبقہ پیدا کیا، جو اپنی اقتصادی قوت کے مطابق سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔

والٹیر اور روسو اس انقلاب کے رہبر تھے اور انہوں نے آزادی اور مساوات کے نعروں کو قبول عام بخشا اور ان کی لے پر متوسط طبقہ سیاسی غلبہ کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ابتدا میں آزادی کا مفہوم جاگیرداری ظلم سے نجات حاصل کرنا تھا۔ اور مساوات کا مفہوم رئیسوں اور پادریوں کی لوٹ کھسوٹ میں تجارتی طبقہ کی شرکت تھی۔ گمان غالب ہے کہ شروع میں برادرانہ سلوک کا مفہوم بھی یہی ہو گا کہ رئیسوں اور پادریوں کے محلوں تک سرمایہ داروں، تاجروں، قصابوں، نان بائیوں اور مشعل سازوں کی آسانی سے رسائی ہو جائے۔ ان لفظوں کے ساتھ ہر مفہوم وابستہ کرنے والوں کو شبہ بھی نہیں تھا کہ سب بالغوں کو اپنے احاطے میں لے لیں گے۔ عورتیں تو بالخصوص ان کے دائرہ مفہوم میں شامل نہیں تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ عورتیں اور مزدور ہرگز یہ نہیں سمجھیں گے کہ ان اصطلاحوں کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے۔ جمہوری نظریہ کے خالق، روسو کا خیال تھا کہ عورتوں اور جائداد نہ رکھنے والے لوگوں کو سیاسی قوت اور اقتدار حاصل نہ ہو۔ یہ دونوں طبقے روسو کے نزدیک عوام کے زمرہ میں شامل نہیں تھے۔ انقلاب فرانس کی اسمبلی کے قانون کی رو سے بالغ

Scanned with CamScanner

مردوں کے ۳/۴ حصہ کو رائے دہندگی کی اجازت نہیں تھی۔ پہلے ہماری ریاستوں میں سے بعض میں رائے دہندہ کے لئے تھوڑی بہت جائداد کا مالک ہونا لازمی تھا' لیکن اینڈریو جیکسن کے عہد میں یہ حالات بدل گئے۔ ابتدا میں اور اب بھی جمہوریت کا مفہوم متوسط طبقہ کی حکومت ہے۔

چند اور اسباب نے بھی اقتصادی اسباب کی معاونت کی۔ اصلاح مذہب کی تحریک نے اس باغیانہ انفرادیت کے لئے راستہ صاف کیا جو اخوت انسانی کے جمہوری تصور میں مضمر ہے۔ تعصب اور وہم پرستی کے خلاف۔ سائنس دانوں اور مفکروں کے حملوں کی جتنی زیادہ اشاعت ہوئی لوگوں نے جنت پر کورانہ عقیدہ رکھنے کی جگہ اس ارضی جنگ پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا جس میں دانا اور احمق دونوں مسرت اور طاقت میں برابر کے شریک ہیں۔ صنعتی انقلاب نے لوگوں کو جانچنے کے لئے حسب نسب نہیں بلکہ تخلیقی قوت کو معیار بنایا۔ حکومت کے اخراجات نے بادشاہوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ تجارت پیشہ لوگوں کی طرف رخ کریں اور ادنیٰ مجالس آئین ساز کو زیادہ سے زیادہ طاقت دیں۔ طاقتور گروہوں کی باہمی رقابت نے رائے دہندوں کی تعداد میں اضافہ کیا' تاکہ غالب گروہ کا غلبہ قائم رہے۔ جب آقاؤں میں پھوٹ پڑی تو عوام ابھرے۔ جب مردوں میں پھوٹ پڑی تو عورتوں کی قوت اور اثر میں اضافہ ہوا۔ اب ہم سب اس دلدل میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور سوال یہ ہے 'کہ کون ہمیں اس دلدل سے باہر نکالے' جب کہ سب کے سب اسی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں؟

جب یہ اسباب یورپ میں برسرعمل تھے اور انہوں نے انگلستان فرانس اور جرمنی میں ۱۶۸۸ء۔ اور ۱۷۸۹ء اور ۱۹۱۸ء میں انقلاب پیدا کئے اور ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کا پہلا دور جاری کیا۔ امریکہ کی جمہوری نشوونما نے ان کی تحریک کو سہارا دیا۔ ہمارا ۱۷۷۶ء کا انقلاب جو اب دور کے ڈھولوں کی طرح سہانا معلوم ہوتا ہے' انگلستان کے خلاف محض نوآبادیوں کی جنگ نہیں تھی۔ یہ غالباً باہر سے آنے والی رئیسیت کے خلاف متوسط طبقہ کی جنگ تھی۔ یہ ان سیاسی زلزلوں کے سلسلے کی ایک کڑی تھی' جنھوں نے مغربی دنیا کی اجتماعی سطح کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا اور جاگیردارانہ رئیسیت کو پارہ پارہ کر کے ہر جگہ عوامی حکومتوں کی داغ بیل ڈالی تھی۔

جس طرح کسانوں کی بغاوتوں نے یورپ میں نوابوں پر سرمایہ داروں کی فتح کو آسان تر بنا دیا' اسی طرح ہمارے ملک میں آزاد زمین کی فراوانی سے متوسط طبقہ کا عروج آسان ہو

گیا تھا۔ جمہوریت، امریک کو راس آئی کیونکہ امریکہ نے ابتدا ہی مساوات اور آزادی سے کی۔ اشتمالیت کی طرح جمہوریت، تہذیب کے ابتدائی مراحل میں زیادہ واضح ہوتی ہے اور بعد کی پیچیدہ اور تعیش پسند، منازل میں نظر نہیں آتی۔ ڈی ٹوک ول، ۱۸۳۰ء میں یہاں کی اقتصادی مساوات کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ کانگرس سے مطالعہ کرو تو زمین مل جاتی تھی۔ جمہوریت اسی وقت حقیقی تھی کیونکہ سیاسی مساوات، کسی حد تک اقتصادی مساوات پر مبنی تھی۔ جو لوگ اپنی زمین پر رہتے تھے اور اپنی زندگی کے حالات کو بدل سکتے تھے، شخصیت اور اخلاق کے مالک تھے۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں جمہوریت پسند تھے۔ ان کی جمہوریت محض رائے دہندگی کی آزادی تک محدود نہیں تھی۔ ان لوگوں جیفرسن کو صدر بنایا۔

وہ جیفرسن، جو ٹام پین کی طرح کٹر تھا اور اس آدمی کی طرح قدامت پسند، جو ہر انیسویں سال ایک انقلاب چاہتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ایمرسن کی خود اعتماد فردیت اور ٹیمین کی مدح عوام کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے یورپ میں امریکی کے متعلق یہ تصور عام کیا تھا، کہ وہ ایک زیرک، منفرد اور مختار شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہ تصور آج کے سیاسی حالات میں اس قدر ناممکن ہے، جتنا کہ کسی جیفرسن کا صدارتی عہدہ کے لئے انتخاب۔

پھر ثانوی اسباب اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔ تقابل کی آزادی نے ہماری ریاست کے ابتدائی ایام میں، خود اختیاری اور شخصیت کے پھلنے پھولنے کے سامان پیدا کئے۔ اس وقت پیشہ ور مزدوروں کی تعداد آج کل سے زیادہ تھی، کیونکہ آج کل تو یورپ کے غیر پیشہ ور کسانوں نے ہمارے ملک میں آکر ہمارے شہروں کی بے بس پرولتاریت کی بنیاد رکھی ہے۔ اس زمانے میں لوگ فقط مزدور نہیں تھے۔ کسی خاص شعبہ میں کسی پیشہ کی مہارت کی بدولت انہیں انفرادی شخصیت حاصل ہوئی تھی، اور انفرادیت کو وہ خوشگوار آزادی نصیب ہوئی تھی۔ جو آج کل ہم معیاری تعلیم اور اخباروں کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ پھر کسی حد تک دیہات میں رہنے والوں کو اپنی انتہائی اور علیحدگی کی زندگی میں انفرادی آزادی بھی زیادہ میسر آئی تھی اور جمہوریت سے بہرہ ور ہونے کا بھی زیادہ موقع حاصل ہوتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے ہماری قومی تنہائی، ان عظیم اور محافظ سمندوں کے درمیان ہمیں آزادی اور تحفظ بہم پہنچاتی ہے۔ یہ اور صدہا دوسرے اسباب تھے جنھوں نے مل کر امریکی جمہوریت کو حقیقی بنایا۔

۲۔ جمہوریت کا زوال

Scanned with CamScanner

لیکن اب یہ سارے حالات ناپید ہیں۔ قومی علیحدگی، تجارت، وسائل نقل و حمل کی کثرت اور تخریبی مشینوں کی ایجاد سے ختم ہو گئی ہے۔ صانع، قاسم اور خریدار کی باہمی اور مشترکہ احتیاج نے مخصی علیحدگی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب جب کہ کلیں، کلوں کو چلاتی ہیں۔ فنی مہارت محض استثناء کی حیثیت رکھتی ہے اور سائنٹیفک تنظیم نے ہنر کو محض غیر انسانی تواتر کا درجہ دے دیا ہے۔ آزاد زمین ختم ہو گئی، فقط کرایہ داری باقی رہ گئی ہے۔

آزاد تقابل انحطاط پذیر ہے۔ کچھ عرصہ تک۔ شاید یہ نئی تجارتوں، مثلاً موٹروں کی تجارت کی شکل میں زندہ رہے، لیکن تقابل ہر جگہ اجارہ داری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ دوکاندار، جو کبھی آزاد تھا، آج ہر جگہ قاسم کے شکنجہ میں گرفتار ہے۔ اب وہ دوکانوں کے سلسلوں کے آگے بے بس ہے، حتیٰ کہ کوئی ایسا مدیر، جو اخبار کا مالک بھی ہے، اب ناپید ہے، کیونکہ ہر جگہ ہزاروں اخبار بہتر طریقہ پر ایک ہی جھوٹ کی اشاعت کرتے ہیں۔ کاروباری سرمایہ داروں، بنکروں اور ڈائریکٹروں کی تعداد کم ہو رہی ہے، لیکن لوگوں پر ان کا اختیار بڑھ رہا ہے۔ باغی متوسط طبقہ میں سے ایک نئی رئیسیت پیدا ہو رہی ہے۔ مساوات آزادی اور اخوت اب سرمایہ داروں کے نصب العین نہیں رہے۔ متوسط طبقہ میں بھی اقتصادی آزادی سال بہ سال محدود ہوتی جا رہی ہے۔ جب آزادی تقابل، مساوات، اور اجتماعی اخوت ختم ہونے لگے، سیاسی آزادی ایک فریب نظر ہے، اور جمہوریت محض ایک خواب۔

یہ سب کچھ انسانوں کی بدعنوانیوں کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ اقتصادی نشوونما کی غیر مخصی قوتوں کی بدولت معروض وجود میں آیا ہے۔ انسان اسی وقت آزاد ہو سکتے ہیں، جب وہ صلاحیت اور طاقت میں برابر ہوں، لیکن اس صورت میں بھی ان کی مساوات، ان کی آزادی سے تباہ ہو جاتی ہے۔ طاقت اور صلاحیت میں لازمی وراثتی اختلافات، اجتماعی اور مصنوعی اختلافات پیدا کر دیتے ہیں اور ہر نئی ایجاد اور انکشاف سے طاقت زیادہ مضبوط اور ناتوانی زیادہ ناتواں ہوتی ہے۔ مساوات ایک غیر متوازن رشتہ ہے، ترازو کے دو پلڑوں کی طرح، جنہیں ایک مصنوعی توازن نے ایک دوسرے کے برابر بنا دیا ہے۔ جوں جوں تنظیم اور پیچیدگی بڑھتی رہتی ہے، مساوات کم ہوتی جاتی ہے۔ عدم مساوات اجتماعی ارتقا کی نوعیت میں مضمر ہے، کیونکہ اس سے وظائف میں اختصاص اور صلاحیتوں میں امتیاز پیدا ہوتا ہے اور لوگوں کو اجتماع کے نقطہ نظر سے غیر مساوی طور پر قدر و اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ "مساوات" دو نظاموں کے درمیان عبوری دور کی ایک منزل ہے، جس طرح آزادی دو

ضابطوں کے درمیان ایک راستہ ہے" غور کیجئے کہ امریکہ کی ابتدائی مساوات کس طرح ہزاروں اقتصادی اور سیاسی امتیازات کے نیچے دب کر رہ گئی ہے۔ اور آج کل امیر اور مفلس کی درمیانی خلیج اتنی وسیع ہے کہ روما کی تہذیب کے بعد تاریخ کے کسی دور میں نظر نہیں آتی۔ رائے دہندگی کی مساوات سے کیا فائدہ' جب کہ طاقت ہی غیر مساوی طور پر منقسم ہوتی ہو اور سیاسی فیصلے' لوگوں کی اکثریت سے نہیں بلکہ ڈالروں کی اکثریت کی بنا پر کئے جاتے ہیں۔

اقتصادی مساوات کا عدم وجود ہماری سیاسی منافقت اور انحطاط کی بنیاد ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور اسباب بھی ہیں۔ ہم اگر انہیں نظر انداز کر دیں' تو مسئلہ کی نوعیت پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس لئے ایسے ذرا اختیار کے ساتھ اس کا جائزہ لیں۔

ان اسباب میں سے ایک سبب امریکہ کی استعماری توسیع ہے' یا سیاسی وجود کے حجم کی ضخامت۔ ریاست جتنی زیادہ وسیع ہو گی' اس میں شخصیت اور جمہوریت کو قائم رکھنا اتنا ہی زیادہ مشکل ہو گا۔ وسیع آبادیوں پر حکومت کرنا زیادہ آسان ہے کیونکہ ان میں تساہل زیادہ ہوتا ہے اور ان کے لئے اپنے مصائب کے متعلق متفق ہونا یا عمل میں متحد ہونا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ پیر یکلس اور کلیون' اگرچہ وہ اور باتوں میں اختلاف رائے رکھتے تھے لیکن اس بات پر متفق تھے کہ جمہوریت' سلطنتوں کے لئے مفید نہیں ہے۔

پھر غور کیجئے' کہ حکومت پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ کبھی حکومت' بادشاہ' اس کے درباریوں اور اس کے حرم پر مشتمل تھی اور آج وہ ہزاروں برسرپیکار گروہوں کے ایک ساتھ زندگی ممکن بنانے کی کل ہے۔ اس کے کردار میں جو لوگ سب سے کم اہم حصہ لیتے ہیں' انہیں بھی اپنا پورا وقت دینا پڑتا ہے۔ آج منصفوں کے عارضی اور عوامی انتخاب یا ایتھنز کی طرح بے خبر لوگوں کے اجتماع کے فوری فیصلوں سے یہ حکومت نہیں چل سکتی۔ قدرتی طور پر ہر جماعت ہر ادارے اور ہر پالیمنٹ میں "کلیں" پیدا ہوتی ہیں۔ جمہوریت ان جتھے بندیوں کی اساس بہم پہنچاتی ہے۔ رائے دہندہ نون' تیل' لکڑی کے معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ان ہزاروں مسائل سے کیونکر باخبر رکھ سکتا ہے' جو اس کی جماعت' انجمن یا ادارہ کو درپیش ہیں۔ وہ اپنی جماعت کے متعلق سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتا' کیونکہ وہ تو بے خبر ہے۔ جمہوریت بے خبر لوگوں کی حکومت کا نام ہے۔

اسی لئے جنگ میں جمہوریت سب سے پہلے مجروح ہوتی ہے۔ ڈی ٹوکسول نے پیش گوئی کی تھی کہ امریکہ کو اس وقت جمہوریت سے کنارہ کشی کرنی پڑے گی جب وہ اپنے

Scanned with CamScanner

آپ کو یورپ کی سیاست اور جنگوں میں الجھا دے گا۔ میکالے نے کہا تھا کہ "بہت سی فوجوں نے برے کمانداروں کے ماتحت خوش حالی کی زندگی بسر کی ہے، لیکن کسی اچھی مجلس مباحثہ کے ماتحت نہیں کی۔" مزدور انجمنیں اسی لئے آمریت کی طرف مائل ہوتی ہیں کہ ان کا کام دفاع اور جنگ ہوتا ہے۔ رجعت پسند یہ بات جانتے ہیں، اور ضبط تولید کی جگہ، کبھی کبھی جنگ شروع کر دیتے ہیں، تاکہ قومی اتحاد میں انتشار نہ پیدا ہونے پائے۔ جمہوریت جنگ کا علاج نہیں، بلکہ جنگ، جمہوریت کا علاج ہے۔ غالبًا جب ہمارے سیاسی رہنما ایک اور بین الاقوامی جنگ شروع کریں تو یہ علاج پائدار ثابت ہو۔

ہماری جمہوریت کی ناکامی کا آخری سبب، دنیا میں تعلیم کی کمی ہے۔ ایمرسن نے کسی موقع پر کہا تھا کہ "عوام کی نادانی ہمیشہ طاقت کو بے باکی کی ترغیب دلاتی ہے۔" ذہنی آزمائشوں کی بنا پر جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں ان سے ان لوگوں کے تصورات کی تائید ہوتی ہے، جنہوں نے پچھلے بیس برس کے انتخابات دیکھ کر بعض نتائج مرتب کئے ہیں۔ نظریہ جمہوریت نے یہ فرض کر لیا تھا کہ انسان ایک باشعور حیوان ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یہ بات منطق کی کسی کتاب میں پڑھ لی تھی، لیکن انسان ایک جذباتی حیوان ہے، جو کبھی کبھی باشعور بھی بن جاتا ہے اور اپنے جذبات کے ذریعہ وہ ہزاروں فریب کھا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ لنکن کا یہ قول صحیح ہو کہ آپ لوگوں کو ہر وقت بے وقوف نہیں بنا سکتے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ آپ ان میں سے اکثر کو بے وقوف بنا کر ایک بڑے ملک پر حکومت کر سکتے ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کرہ ارض پر ہر منٹ میں دو سونئے احمق پیدا ہوتے ہیں اور یہ جمہوریت کے لئے برا شگون ہے۔

ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صرف جمہوریت ہی ناکام نہیں رہی، بلکہ ہم خود بھی ناکام رہے ہیں۔ ہم نے طاقت حاصل کرنے کے بعد شعور اور آگہی کو پختہ کرنے کی طرف سے غفلت برتی۔ ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ کثرت مقدار اور طاقت کا راز ہے حالانکہ ہمیں زندگی کی ایک پست سطح کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ رائے دہندوں کی تعداد میں جتنا زیادہ اضافہ ہو گا اسی حد تک ان آدمیوں کا معیار جنہیں ہم اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں۔ اور ان صفات کا معیار جن کی بنا پر یہ انتخاب کیا جاتا ہے پست ہوتا جائے گا۔ ہم اپنے چنے ہوئے حکام سے کسی قسم کی عظمت اور دور اندیشی کا مطالبہ نہیں کرتے، ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ اچھے خطیب ہوں اور ہمیں فاقوں نہ مرنے دیں۔ بیکن نے کہا تھا کہ قدیم مفکر یہ کہا کرتے تھے کہ جمہوریت کی حیثیت ایک سمندر کی سی ہے اور مقرر کی ہوا کی سی۔ درحقیقت

Scanned with CamScanner

ہیں اس بات کی پروا نہیں کہ ہم پر کون حکومت کرتا ہے۔ ہم اس بات کا بہت کم شعور رکھتے ہیں کہ ہم پر حکومت کی جا رہی ہے۔ جس طرح پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ ہم جاگیرداروں کے ذریعہ مالیہ ادا کرتے ہیں اس لئے ہم کوئی ٹیکس نہیں دیتے۔

والٹیئر ملوکیت کو جمہوریت پر ترجیح دیتا تھا کیونکہ ملوکیت کے لئے ہمیں ایک شخص کو تعلیم دینا ہوتی ہے اور جمہوریت کے لئے کروڑوں کو۔ اور اس سے پہلے کہ ہم دس فی صدی کو تعلیم دیں، موت ان سب کو آن لیتی ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ شرح پیدائش، ہمارے نظریوں اور ہمارے منصوبوں کو الٹ پلٹ دیتی ہے جو "کم لوگ" تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کے کنبے چھوٹے ہوتے ہیں اور جن "زیادہ لوگوں" کے پاس تعلیم کے لئے وقت نہیں ان کے کنبے بڑے ہوتے ہیں۔ ہر نسل کے تقریباً سب گھروں میں علم کا حصول ان کی ہی اہلیت کے بس میں نہیں ہوتا اس لئے سیاسی آزادی فکری ہمیشہ کے لئے بے سود ثابت ہوتی ہے۔ ذہانت کی تبلیغ جہلا کی شرح پیدائش کے دوش بدوش نہیں چل سکتی۔ یہی پروٹسٹنٹ مذہب کی خامی ہے۔ مذہب کو بھی قوموں کی طرح، جنگوں سے محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ بقا اولاد یا آئندہ نسل کی نوعیت سے حاصل ہوتی ہے۔

اسی لئے جمہوریتیں، قدامت پسند ہوتی ہیں۔ اناطول فرانس اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ گروہ نئی چیزوں سے ڈرتے ہیں۔ بسمارک جانتا تھا کہ عوام، بادشاہی نقطہ نظر کی حمایت کریں گے۔ اس بوڑھے کلبی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ میرے نزدیک براہ راست انتخاب اور ہمہ گیرا رائے دہندگی کا حق، کسی مصنوعی انتخابی قانون سے زیادہ قادامت پسندانہ اقدام کی ضمانت ہے۔ عورت نے آسانی سے حق رائے دہی حاصل کر لیا کیونکہ مختلف جماعتوں کے قائد یہ سمجھتے تھے کہ عورتیں قدامت پرستی کی حمایت کرین گی۔ سوئزرلینڈ کے آزاد منش لوگوں نے کچھ اصلاحیں نافذ کیں، جس میں عوام کی رائے شماری بھی شامل تھی۔ قدامت پسندوں نے یہ اصلاحیں عوام کے استصواب رائے کے لئے ان تک پہنچائیں لیکن انہوں نے سب اصلاحیں، مع استصواب رائے کے اصول کے مسترد کر دیں۔ ۱۹۱۸ء میں انگلستان میں رائے دہی کے حق کی توسیع سے وہاں ایک نہایت رجعت پسند حکومت قائم ہو گئی۔ آسٹریلیا میں جبری رائے دہی کے قانون کی وجہ سے ممکن رائے دہندگان کی تعداد جہاں ۱۹۱۲ء میں ساٹھ فیصدی تھی ۱۹۲۵ء میں نوے فیصدی ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پسندوں نے بہت بڑی اکثریت کے ساتھ حکومت جیت لی۔ امریکہ میں حق رائے دہی کی توسیع کے متعلق سرہنری مین نے پیشگوئی کی تھی کہ "یہ نہایت بیہودہ خیال

ہے کہ توسیع حق رائے دہی سے ترقی میں اضافہ ہو گا۔ نئے افکار، نئے انکشافات، نئی ایجادیں اور زندگی کے نئے فنون پھلیں پھولیں گے۔ گمان غالب ہے کہ اس سے ایک مضرت رساں قسم کی قدامت پرستی پھیلے گی" ہمیں اس متعصب انگریز کے ساتھ اتفاق کرنا پڑے گا کہ جمہوریت عظیم اذہان کی دشمن اور فن سے بے تعلق ہے یہ ان چیزوں کی قدر کرتی ہے جو اوسط ذہن کی سمجھ میں آ جائیں۔ وہ فلمی محلات تعمیر کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس نے پار تھینون بنا لیا ہے۔ اگر ایتھنز کی اسمبلی کی بات مانی جاتی تو پار تھینون کبھی نہ بنتا۔

اکثریت کا ذہنی تشدد، ملوکیت کے سیاسی ظلم و ستم کی طرح نہایت مہیب ہو سکتا ہے۔ بعض امریکی ریاستوں میں، تھوڑے علم سے کچھ زیادہ علم رکھنا خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ انفرادیت کے یہ جمہوری شکوک، نظریہ مساوات کا نتیجہ ہیں اور چونکہ سب انسان برابر ہیں، رائے شماری سے کوئی حقیقت بھی ثابت کی جا سکتی ہے اور کوئی رسم مقدس بن سکتی ہے۔ جمہوریت محض مشینی عہد، کا نتیجہ نہیں نہ یہ محض مشینوں کی بدولت حکومت کرتی ہے، بلکہ یہ اپنے اندر خود ایک خطرناک مشین رکھتی ہے۔ جاہلانہ جبر کا وہ بے پناہ بوجھ، جو اختلاف کو ختم کرتا ہے۔ غیر معمولی ذہن کو دباتا ہے اور غیر روائتی کمال کی دل شکنی کرتا ہے۔ امریکہ کی طرح اور کہیں بھی تعلیم کو اتنی مالی امداد میسر نہیں، لیکن کسی اور ملک میں اس کا اتنا کم احترام اور اتنا کم استعمال نہیں ہوتا جتنا امریکہ میں۔ ہم نے فیاضی سے مدرسے، کالج اور جامعے بنائے ہیں، لیکن آج جب کہ وہ بن گئے ہیں اور بھرے بھرے نظر آتے ہیں، ہم نے تعلیم کو انتظامی عہدوں کے لئے نااہلیت کا معیار سمجھ لیا ہے۔

۳۔ جمہوریت کے طریقہ ہائے عمل

اس ملک میں جہاں حکمران اقلیت عوامی حمایت کا لباس اوڑھتی ہے، ایک خاص طبقہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس کا وظیفہ حکومت کرنا نہیں بلکہ اس منصوبہ کے لئے لوگوں کی منظوری حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جو حکمران اقلیت کو پسند ہو ہم اس خاص طبقہ کو سیاستدان کہتے ہیں۔ ہم ان کا ذکر نہ کریں تو بہتر ہے۔

سیاست دان، جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں اور لوگوں کو ایسے گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں جو ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں، انسانیت کی فطری جماعت پسندی ان جماعتوں کو کامیاب بنا دیتی ہے۔ یہ قبائلی وفاداری کے آثار ہیں۔ آسٹریلیا کے وحشی اپنے

دبیج براعظم کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر فقط اس لئے جاتے ہیں کہ جنگ میں ان لوگوں کا ساتھ دیں جو انہی کا سا ٹوٹم (قبیلہ کا نشان) پہنتے ہیں۔ ٹوٹم، آج بھی تنظیم میں مدد دیتا ہے اور وہ جماعیں، جو ہاتھی یا گدھے کو اپنا نشان بناتی تھیں، ہماری جماعتوں سے زیادہ یک جہتی سے کام کرتی تھیں۔

جماعتی تنظیم مہنگی ہوتی ہے اور اسے فرشتوں کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی وہ حقیقت پسند بینی، جو کلبوں، سیرو تفریح اور مہموں کے اخراجات برداشت کرتے ہیں، اس کے عوض وہ نمائندوں کا انتخاب کرنے، بعض عہدے اور معاہدے حاصل کرنے تکلیف دہ قوانین سے تحفظ حاصل کرنے اور آئین سازی کے مشکل کام میں خاموشی سے دخل اندازی کرنے پر مطمئن ہیں۔ "جو لوگ نمائیندے نامزد کرتے ہیں، وہی حکومت کرتے ہیں" عوام کسی کو نامزد نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ بد نظمی اور جہالت میں مبتلا ہیں۔ ان پر فقط اتنا بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی نوازشوں کو عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کریں گے۔ ایک مختصر اور منظم اقلیت ایک طرف سارے ووٹ ڈال کر کسی انتخاب میں فیصلہ کن طاقت حاصل کر سکتی ہے۔ مشین، اس لئے فتح پاتی ہے کہ وہ ایک بٹی ہوئی اکثریت کے خلاف ایک متحدہ اقلیت ہے۔ غالباً کارلائل کا یہی مطلب تھا، جب اس نے کہا تھا کہ "جمہوریت اپنی نوعیت ہی میں متناقض بالذات ہے۔ اس کا نتیجہ صفر ہے۔" اس جوشیلے جمہوریت پسند، روسو نے کہا۔ صحیح جمہوریت نہ کبھی وجود میں آئی ہے نہ آئے گی، کیونکہ یہ بات فطری نظام کے خلاف ہے کہ اکثریت، اقلیت پر حکومت کرے، تمام سیاست منظم اقلیتوں کی باہمی رقابت پر مشتمل ہے۔ عوام محض تماش بین ہیں۔ جو فاتح کی حوصلہ افزائی اور شکست خوردہ کی تضحیک کرتے ہیں۔ اس پیکار کے فیصلے اور انجام میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔

ان حالات میں رائے دہی بے معنی چیز ہے اور یہ فقط اس لئے جاری رہتی ہے کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھی رہے کہ وہی قانون بناتے ہیں اور اس طرح اجتماعی نظام کی چولیں ڈھیلی نہ ہونے پائیں۔ موشکو نے کہا ہے کہ جمہوری نظام میں، یہ ممکن ہے کہ لیکس۔ دوسرے ملکوں سے زیادہ ہوں، لیکن لوگ ان کی مدافعت نہیں کرتے، کیونکہ ہر شہری انہیں اپنی خدمت میں ایک نذر عقیدت سمجھتا ہے۔ شہری ریاست ہے اور صدر عوام کا غلام ہے۔ اس طرح لوگوں کی نخوت کی تسکین کرو، تو وہ سب کچھ ماننے کے لئے تیار ہیں۔

ان حالات میں انتخاب سے فقط ایک ہی فائدہ ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کی بیدار توجہ کے تعلیمی مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بسااوقات اصلی مسائل کی چالاک پردہ پوشی سے یہ

Scanned with CamScanner

مواقع بے کار جاتے ہیں۔ اس سیاست دان کی کوئی حیثیت نہیں جو لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا دینے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

۱۹۱۷ء میں کینیڈا کے انتخاب میں جبری بھرتی کے مسئلہ کو اس لئے چھپایا گیا تھا کہ جبری بھرتی کی تجویز کی شکست سے کینیڈا میں فرانسیسی طبقہ تسلط حاصل کرے گا۔ انگریز طبقہ بیک آواز انگریز تسلط کے حق میں اٹھا اور جبری بھرتی کی تجویز کامیاب ہو گئی۔ ایک اچھی نمائش کسی قسم کی سیاسی بیہودگی کو قابل قبول بنا سکتی ہے۔ انتخابات فریب اور شور و غوغا کا مقابلہ بن جاتے ہیں۔ اور جس طرح اچھے دلائل میں شور و غوغا کم ہوتا ہے حقیقت انتشار میں کھو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر غور کرو کہ اضلاع یہ چاہتے ہیں کہ طاقت دیہاتی قدامت پسندوں کے ہاتھوں میں رہے۔ وہ متحرک مخلوق' جو خانہ بدوشی کی وجہ سے حق رائے دہی سے محروم ہو جاتی ہے' انتخابات میں بددیانتی اور تشدد سے کام لیتی ہے۔ بس یہ ہے جمہوریت۔ ان حالات میں ایک ووٹ اسی قدر قیمت رکھتا ہے' جتنا کہ ایک ریلوے ٹکٹ اس وقت جب لائن مستقل طور پر مسدود ہو۔ اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ ۱۸۸۵ء میں اسی فیصدی رائے دہندگان نے ووٹ دیئے اور ۱۹۲۴ء میں صرف پچاس فیصدی نے؟ یا یہ کہ ذہین انسان ایک گھنٹہ رجسٹر ہونے اور ایک گھنٹہ ووٹ دینے پر ضائع نہیں کر سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دونوں نمائندے اس کے نمائندے نہیں ہیں؟

پھر بھی فرض کیجئے کہ ہم ووٹ دے چکے ہیں۔ انتخابات ختم ہو گئے اور منتخب لوگ واشنگٹن پہنچ گئے' تاکہ ہماری کانگرس کو زینت بخشیں۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچتے ہیں تو انہیں کئی ذہنی صدموں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ لوگ' اکثر و بیشتر اوسط قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں ندرت فکر کی صلاحیت سرے سے مفقود ہوتی ہے۔

لیکن اب ہمارے نمائندہ کو ان مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے' جو اسے اب تک پیش نہیں آئے تھے۔ اسے الیکشن میں کامیاب ہونے کے لئے اپنے حلقہ' علاقہ اور ضلع کے ارباب اقتدار سے وفاداری پوشیدہ اثرات اور خفیہ معاہدے کر سکنے کی صلاحیت کی ضرورت تھی۔ اسے تقریریں کرنے الزام لگانے اور دوسروں کے لگائے ہوئے الزامات کی تردید کرنے اور خود نمائی میں ماہر ہونے کی ضرورت تھی۔ اور پھر اسے بے طلب چندہ مانگنے طاقت وروں پر مہربانیاں کرنے اور ہر ایک سے عہد و پیمان کرنے میں مہارت کی ضرورت تھی' لیکن اب جو مسائل اسے واشنگٹن میں درپیش ہیں' وہ اقتصادی مسائل ہیں۔ یہ مسائل زمین کی ملکیت' خام مواد' کوئلے کی کانوں' تیل کے کنوؤں' آبی طاقت' پیداوار' تقابل نقل و

حرکت، رسل و رسائل، جہاز رانی، ہوابازی، پنچائت، تقسیم، منڈیوں اور مالیات کے مسائل ہیں۔ ان مسائل کی تفاصیل صرف ماہرین ہی کو معلوم ہوتی ہیں اور اس شخص کے لئے نہایت تکلیف دہ ہوتی ہیں جس نے فقط ریشہ دوانیوں میں مہارت حاصل کی ہو۔ ہمارا نمائندہ اخباروں کے پیچھے پناہ لیتا ہے۔ اور اس سے جس طرح ووٹ دینے کو کہا جاتا ہے، ووٹ دیتا ہے۔

جوں جوں حکومت زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے، منتخب نمائندے کم سے کم اہم اور ماہرین زیادہ اہم ہوتے جاتے ہیں۔ منتظمین، آئین سازوں کے معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں کیونکہ منتظمین، ماہرین کی مجالس سے امداد حاصل کرتے ہیں پریذیڈنٹ ہارڈنگ کے عہد حکومت میں کانگرس کے اراکین کو یہ دیکھ کر سخت صدمہ پہنچا کہ ایک پریڈ میں انہیں چند ماہرین کے پیچھے بیٹھنے کی جگہ ملی۔ سینٹ نے اس معاملہ پر باقاعدہ احتجاج کیا اور مسٹر ہارڈنگ نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا جواب دیا، لیکن اس واقعہ نے یہ ظاہر کر دیا کہ حالات کا رخ بدل رہا ہے۔ "نمائندہ حکومت" ختم ہو چکی تھی۔ جمہوریت نے اپنے عہدوں پر ذہین آدمیوں کو متعین کرنے کی کوئی راہ نہیں پائی تھی۔ اور جب جمہوریت اخبار پڑھ رہی تھی یا تقریریں کر رہی تھی، ذہین لوگ طاقت حاصل کر رہے تھے۔

کیا یہی وجہ تھی کہ ہم اتنے اصرار سے اپنے اعدا کو جمہوریت اختیار کرنے کی شہ دے رہے تھے؟ نیطشے اس رجحان کا ذکر کرتا ہے "جو ہمسایہ حکومت کی جمہوریت کی پشت پناہی کرتا ہے کیونکہ یہ طرز حکومت قوم کو ناتواں بنا دیتی ہے اور اس سے جنگ کرنے کی اہلیت چھین لیتا ہے۔" غالباً چونکہ جمہوریت نااہل، بداخلاق، کند ذہن لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت دے دیتی ہے، اسی لئے اطالیہ، ہسپانیہ، یونان، روس، پولینڈ اور پرتگال میں جمہوریت آمریت میں تبدیل ہو گئی ہے، اور شاید فرانس میں بھی یہی حالات پیدا ہو جائیں۔ ہماری حالت دیکھئے، سیاسی اصلاح کی تحریکیں شکست کھا گئی ہیں اور جہاں کہیں انہیں فتح ہوئی ہے، وہ اس طرح کہ اصلاح، حکمران اقلیت کے ایما کے عین مطابق تھی۔ اوسط ذہن کامیاب ہو چکا ہے۔ ہر جگہ ذہانت، جمہوریت سے پناہ مانگ رہی ہے۔ احمق لوگ، انسانیت کے گھوڑے پر سواری کر رہے ہیں۔

ہاں یہ ایک جانب دار نظریہ ہے، یہ ایک مکمل تجزیہ نہیں ہے۔ جمہوریت کی خوبیاں اکثر بار مدح و ستائش کا خراج حاصل کر چکی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اکثریت کا اقلیتوں پر ستم، اقلیتوں کے اکثریت پر ظلم سے بہتر ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی جمہوری بے

بی، قابلیت کی اس موت سے بہتر ہے، جو دور ریئسیت میں خاندانی اقتدار کے تشدد سے ظہور میں آتی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جمہوریت نے عام انسان کی خودداری میں اضافہ کیا ہے، جس طرح کہ اس نے غیر معمولی ذہن کو کچل کے رکھ دیا ہے۔ آج رائے دہندہ کو وہ آزادی حاصل ہے کہ اس میں کسی قدر جرات اور انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہم میں سے کسی کو اب غلامی کا شعور نہیں ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ اس ملک کا صدر بن سکتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اشکال حکومت، جمہوریت سے بدتر ہوں، لیکن ہم جتنا زیادہ تجزیہ کرتے ہیں اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس شکل حکومت میں کم سے کم اہلیت اور خلوص ہے۔ چونکہ سیاسی طاقت بے معنی ہے، جب تک کہ اقتصادی اور فوجی طاقت اس کی پشت پناہی نہ کرے۔ ہمہ گیر حق رائے دہی محض ایک قیمتی نمائش ہے۔

آمریت میں ایک خوبی ہے اور وہ یہ کہ وہ زیادہ دیانتدار ہے۔ نپولین نے کہا تھا کہ "طاقت مطلق کو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ عمل کرتی ہے اور زبان بند رکھتی ہے" تعلیم کے بغیر جمہوریت حدود کے بغیر منافقت ہے۔ اس کا مطلب انتظامی صلاحیت کا سیاست میں انحطاط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی حاکم طبقہ کے علاوہ خاصے خرچ پر سیاست دانوں کے طبقہ کو قائم رکھا جائے، جو حکام کی مدد کرتے ہیں، اور محکوموں کو فریب دیتے ہیں۔

آخری سبب، غنڈوں کی حکومت ہے۔ ہمارے بڑے شہروں میں مجرم آزادی اور مسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، کیونکہ قانون ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر وہ کسی طاقتور گروہ سے وابستہ ہیں تو انہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ کوئی جرم کریں گے تو انہیں گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اگر گرفتار ہو گئے، تو انہیں عدالت سزا نہیں دے گی۔ اگر سزا مل گئی تو انہیں قید خانہ میں نہیں بھیجا جائے گا۔ اگر بھیجا بھی گیا تو انہیں وہاں سے فرار کی اجازت ہو گی، اگر اپنے پیشہ کے عمل میں وہ قتل کر دیئے جائیں، تو انہیں تزک و احتشام سے دفن کیا جائے گا یہ ہے جمہوریت کا انجام!

اگر ہم اس بدی کو برداشت کرتے رہیں گے تو ہم پرلے درجہ کے بزدل ہوں گے۔ اگر ہم جمہوریت کی ترمیم نہیں کر سکتے اور اسے اس کے مصائب سے پاک نہیں کر سکتے تو ہمیں چاہیئے کہ اپنا آئینی نظام کسی چھوٹی قوم کے سپرد کر دیں اور کسی بادشاہ کو درآمد کر لیں۔

۴۔ عطائی نسخہ

آخر ہم کیا کریں؟

مصلح کو بھی یہ جاننا پڑے گا کہ بہت کم اصلاح ہو سکتی ہے اور اس میں بھی خاصی دیر لگ جائے گی۔ بہترین منصوبہ کا مطلب یہ ہو گا کہ تعلیم، ایجاد اور سائنسی تحقیق سے ذہن کی تربیت کی جائے، تعداد کم کی جائے، جسم کو میکانکی طاقت سے گراں تر بنایا جائے، پرولتاریت کو ختم کیا جائے اور انسانیت کو عہد نو، کے لئے آزاد کیا جائے۔ درحقیقت تعلیم کے علاوہ ان مسائل کا اور کوئی حل نہیں ہے۔ جب تک لوگ تعلیم یافتہ نہیں ہوں گے شہروں میں برائی ختم نہیں ہو گی۔ لیکن اگر لوگوں نے یہ سب کچھ افلاطون کے لئے نہیں کیا، تو ہمارے لئے کیوں کریں گے۔ اور ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ شرح پیدائش تعلیم کے ساتھ کیا کیا فریب کھیلتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ذہین اور تعلیم یافتہ لوگوں کو یکجا کیا جائے۔ یہ لوگ ہر شعبہ سے منتخب کئے جائیں، تاکہ وہ ہمارے آئینی نظام کو دوبارہ زندہ کریں۔ کانگرس اور ریاستوں میں نئی ترمیمیں تجویز کریں اور ان ترمیموں کی اپنے پیشہ کے اقتدار اور دولت مندوں کی دولت سے پشت پناہی کریں۔

تیسرا بہترین منصوبہ یہ ہے :۔

جدید جمہوریت کے مصائب کی وجہ ہمارے سیاستدان ہیں۔ آیئے ہم سیاست دانوں، اور نام زدگی کے اصول کو ختم کر دیں۔

ابتدا میں ہر شخص اپنا طبیب خود تھا۔ اور ہر گھر میں اپنی ضرورت کی دوائیں موجود ہوتی تھیں، لیکن جوں جوں طبی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا، ایک عام انسان کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ تمام فہرست ادویہ کو حفظ کر لے۔ لوگوں کا ایک خاص گروہ اٹھا اور انہوں نے اپنا وقت طب کے مطالعہ پر صرف کیا اور ماہر طبیب وجود میں آئے۔ لوگوں کو عطائیوں سے محفوظ کرنے کے لئے طب کے ماہرین کو اعلیٰ خطاب اور سندیں دی گئیں۔ اب حالات یہ ہیں کہ جب تک کسی نے یہ سند حاصل نہ کی ہو، قانون اسے طبابت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم اب عطائیوں کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ ہمارے امراض کا کھوج کریں، یا ہماری زندگی کو خطرہ میں ڈالیں۔ ہم معالج سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کا قیمتی حصہ طب کے مطالعہ پر قربان کر چکا ہو گا۔

لیکن جو لوگ، ہمارے اجتماعی امراض کا علاج کرتے ہیں اور کروڑوں جانوں کو جنگ اور امن میں خطرہ میں ڈالتے ہیں اور جن کے اختیار میں ہماری جائداد اور ہماری آزادی ہے۔ انہیں کسی مہارت یا مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ یہ کافی ہے کہ وہ صدر کے دوست ہوں

جماعت کے وفادار ہوں، خوبرو اور خوش اخلاق ہوں، گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوں، کندھوں پر ہاتھ مارتے ہوں، بچوں کو چومتے ہوں، اور خاموشی سے احکام کی بجا آوری کرتے ہوں اور موسمی پیمانہ کی طرح خوش آئند وعدوں سے معمور ہوں۔ اور چاہے وہ کچھ ہوں، قصاب یا حجام، دیہاتی وکیل یا اخبار نویس، سور کے گوشت کو ڈبوں میں بند کرنے، شراب بیچنے والے، اس سے ہمیں غرض نہیں۔

آیئے، اب ہم ایک خوشگوار نقشہ تیار کریں۔ فرض کر لیں کہ ہمارے بڑے جامعے، سیاسی نظم و نسق کا ایک شعبہ کھول دیتے ہیں۔ ایک شعبہ جو نظریات تک محدود نہیں، بلکہ سیاسی عمل اور عملی تفاصیل سے متعلق ہے۔ وہ شعبہ نہیں، جو تاریخ سیاست، یا فلسفہ ریاست، یا ملوکیت، رئیسیت، جمہوریت، اشتراکیت یا ذاتیت پر بحث و تمحیص یا ان کا موازنہ کرتا ہو، بلکہ وہ شعبہ، جو اپنے طلبا کے ساتھ شہری نظام کو عمل میں دیکھنے جائے۔ وہ شعبہ، جو شہری مسائل کو ایک سیاسی مقرر، یا ایک وفادار ہاتھی یا گدھے کی طرح نہ دیکھے، بلکہ ایک سائنس دان کی طرح یا اس منتظم کی طرح دیکھے جس کی تربیت اور اہلیت اسے فن تنظیم سے آگاہ رکھتی ہے۔ اگر اس قسم کا نصاب اسی باقاعدگی اور تکمیل سے بنایا جائے، جس طرح کہ طبی اداروں کے نصاب مکمل ہوتے ہیں، تو یقیناً سنجیدہ مزاج لوگ اس کی طرف کھنچیں گے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کو میدان سے بھگا دے گا، جو اب محض خود نمائی اور تقریروں کے ذریعہ طاقت حاصل کرتے ہیں۔ ابتدا میں اس نصاب کے لئے فقط چند لوگ ہوں گے، کیونکہ انہیں اس نصاب کی تکمیل کے بعد کوئی سیاسی عہدہ حاصل کرنے کا یقین نہیں ہو گا، لیکن شہری منتظمین کے منصوبہ کی تبلیغ سے راہیں نکلیں گی۔ یہ مدرسے طبی مدرسوں کی طرح تعداد میں بڑھیں گے اور کامیاب شہری منتظمین کو یہ دعوت دی جائے گی کہ وہ معلمین کی قیادت سنبھالیں۔

یہ سب کچھ ممکن ہے۔ اب بھی ہمارے بڑے جامعوں میں اس قسم کے نصاب موجود ہیں، جو ان انتظامی مدرسوں کی سنگ بنیاد بن سکتے ہیں لیکن جمہوریت کی ترمیم میں دوسرا قدم زیادہ تخیلی قوت کا طالب ہے۔ فرض کیجئے کہ جہاں یہ مدرسے انسانوں کو حکومت کے لئے آراستہ کر رہے ہیں، بعض دوسرے ادارے تحریر و تقریر سے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے آقاؤں سے علم و فضل طلب کریں اور انہیں ان کی صلاحیت کے مطابق مشاہرہ دیں۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس خیال پر متفق ہو جائیں، کہ کوئی سیاسی جماعت کسی ایسے شخص کو نامزد نہ کرے، جو انتظامی تربیت سے معرا ہو۔ یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا

Scanned with CamScanner

کہ نامزدگی کا اصول بالکل ختم ہو جائے اور تربیت یافتہ منتظمین اپنے آپ کو انتخاب کے لئے پیش کریں۔ لوگوں کا انتخاب صرف انہیں لوگوں تک محدود ہو اور اس طبقہ کے اندر غیر محدود۔ یہ انتخاب آج کل کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہو گا اور منتخب لوگ یقیناً اپنے عہدہ کے اہل ہوں گے۔ یہ صحیح معنوں میں جمہوریت ہو گی اور اسی قسم کی جمہوریت اس حقیقت پسند دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے۔

کیا اس قسم کی ترمیم سے جمہوریت کی روح مٹ جائے گی؟ نہیں جمہوریت کے لئے یہ بات لازمی ہے کہ ہر بالغ اپنے بڑے افسروں کے انتخاب میں شریک ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بالغ سیاسی عہدوں کا متمنی اور اہل ہو۔ پیدائش، عمر اور رہائش کی پابندیاں اب بھی ہیں، ان کے ساتھ خاص تعلیم کی پابندی، حکومت کی پیچیدگی کے نقطہ نظر سے لازمی ہے۔ یہ تجویز نمائندوں کی تعداد میں اضافہ کر کے جمہوریت کی توسیع کرے گی اور ان پر چند خصوصیات کی شرط لگا کر جمہوریت کو محدود بنا دے گی، ہمارا موجودہ نظام غیر جمہوری ہے کیونکہ وہ دو امیدواروں میں سے انتخاب پر مبنی ہے۔ اور یہ بات بنیادی جمہوریت کے اصولوں کے خلاف ہے، کیونکہ یہ تعلیم اور اقتصادی مواقع کی مساوات کو نظر انداز کرتی ہے۔ اگر ہر تعلیم یافتہ شخص کو جو ایک خاص معیار کمال حاصل کر چکا ہو، مدرسے، کالج اور یونیورسٹی میں ریاست کی طرف سے وظیفہ ملا کرے، تو ہر شخص کے لئے اعلیٰ عہدوں کی راہ کھلی ہو۔ مواقع کی مساوات، جمہوریت کی جان ہے ہم نے جمہوریت کے ڈھانچہ کو اپنا لیا ہے، لیکن اس کی روح سے محروم ہیں۔ ہمیں ہر جگہ قابلیت کے لئے تمام راہیں کھول دینی چاہئیں، اور اشکال کی حکومت کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہئے۔

یقیناً اس نسخہ میں خامیاں ہیں، جنہیں ہمیں نصب العین کے نہیں بلکہ موجودہ حالات کے مقابلہ میں رکھنا ہے۔ ہوٹلوں اور شراب خانوں کی جگہ یونیورسٹیوں کو ذریعہ نامزدگی بنا کر ہم نے یہ فراموش نہیں کیا کہ یونیورسٹیوں میں بھی ریشہ دوانیاں ہو سکتی ہیں اور گریجویٹوں کو بھی خریدا جا سکتا ہے، لیکن یہ مسئلہ درجات کا ہے۔ غالباً ایک شخص جسے سائنسی تربیت حاصل ہو یا وہ شخص جو ایک ایسا نصاب چنتا ہے جس کے لئے اسے طویل مدت تک محنت شاقہ کرنی پڑتی ہے، اپنی خودداری اور دیانت کا زیادہ پاس رکھے گا۔ سیاست دانوں کے مقابلے میں سائنس دانوں کا اخلاق زیادہ اچھا ہوتا ہے اور اگرچہ شعبہ طب میں بھی چور اور عطائی ہوتے ہیں، یہ ان چند شعبوں میں سے ایک ہے، جن میں "دیانت" آمدنی پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

جہاں تک یونیورسٹیوں کا تعلق ہے، سوال یہ نہیں کہ وہ جدت پسندی یا قدامت پرستی کی تعلیم دیں گی یا نہیں؟ علم الفرام کو ان بلند بانگ تقسیموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یقیناً طاقت اس وقت بھی اسی زور کے ساتھ حکومت کرے گی۔ لیکن اس کا انداز حکومت بہتر ہو گا، جس میں حماقت، بدمعاشی اور بے حرمتی کا کوئی دخل نہیں ہو گا۔ ہم یہاں اجتماعی مسئلہ کا کوئی حل پیش نہیں کر رہے جس کی بدولت کمزور، طاقتوروں پر حکومت کرنے لگیں گے۔ غالباً ایک ہوشیار اقلیت، ایک کم ہوشیار اکثریت پر حکومت کرتی رہے گی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا نسخہ نہیں جس کے ذریعہ جمہوریت، قدرت کے اس غیر منصفانہ فرمان کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ ہمارا مقصد جنت کی تخلیق نہیں ہم تو صرف اس کے خواہش مند ہیں کہ جو حکومت بھی ہو اسے انسانی شخصیت کی حدود کے مطابق بہتر اور قابل تر بنایا جائے۔ یہ سیاست کا مسئلہ ہے اور یہاں ہم اسی سے دوچار ہیں۔

آج کل ہم یہ سمجھتے ہیں، کہ بداخلاقی اور جہالت، منتخب لوگوں کے فطری حقوق ہیں۔ ہم اس روایت کو بدلنے کی ہر تجویز کو مضحکہ خیز سمجھتے ہیں، لیکن حکومت ہمیشہ نااہل نہیں رہی۔ انگریز اب بھی اپنے سیاست دانوں کو تربیت دینے اور منصفوں میں انصاف پسندی پیدا کرنے کے لئے مشہور ہیں اور جرمن حکام شہر اپنے شہروں کو دنیا کے بہترین مقام بنا دیتے ہیں۔ کوئی چیز ناممکن نہیں ہم صرف یہ سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں، کہ یہ ناممکن ہے۔

ہم نے جو کچھ تجویز کیا ہے، یہ ایک پرانا خیال ہے۔ یہ سقراط، افلاطون، بیکن، کارلائل، والٹیر، اور رینان کا خواب تھا۔ غالباً اس کی خواب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں، یا غالباً جب ہم سب خواب و خیال ہو جائیں تو یہی حقیقت بن جائے۔ ایک طویل مدت تک اس کی حقیقت فقط خواب ہی کی رہے گی۔ تعلیم و تربیت کے کئی عہدوں کے بعد لوگوں کے انداز فکر میں تبدیلی پیدا ہو گی۔ لیکن اگر ہم نے قابل لوگوں کو سیاسی عہدوں پر مامور کرنے کی پوری کوشش نہ کی اور جمہوریت کی علم دشمنی کو ختم کرنے کی طرف توجہ نہ کی۔ اور ان صلاحیتوں کو، جو آج جلب منفعت میں مصروف ہیں، اجتماعی بہبود پر مامور نہ کیا اور اپنے دفتروں، سیاسی عہدوں، آئین ساز مجلسوں میں ان لوگوں کو لانے کے منصوبے نہ بنائے، جو کم سے کم اتنی انتظامی تربیت حاصل کر چکے ہوں، جتنی کہ ہم غیر اہم پیشوں کے لئے حاصل کرتے ہیں۔ تو جمہوریت یقیناً ناکام ہے اور یہ دنیا کے لئے بہتر ہوتا اگر امریکہ نے لوگوں کی امیدوں کو ابھارا نہ ہوتا۔

باب نوزدہم

رئیسیت 1

ا۔ رئیسیت کا احیاء

۱۷۷۶ء اور ۱۷۸۹ء میں یورپ میں جو واقعات پیش آئے انہیں رئیسیت کے موضوع پر عوام کا آخری فیصلہ سمجھنا چاہئے۔ جارج سوم کے ہوش و حواس اور لوئی ششم کے سر کے ساتھ دنیا سے رئیسیت کا خاتمہ ہو گیا اور آج لوگوں کے دلوں میں اس کا کوئی احترام باقی نہیں۔ رئیسیت کے سارے ظاہری شان و شکوہ اور جلال کے باوجود دنیا اب جمہوریت کی طرف مائل ہے۔ اس لئے رئیسیت کے موضوع پر از سرنو غور کرنے کا نہ کوئی محل ہے اور نہ مجاز۔ یقیناً اس قسم کی ہر تجویز روح عصر کے خلاف سمجھی جائے گی۔ پھر بھی ہم اس موضوع پر جو کچھ کہیں گے وہ اس خیال سے نہیں کہ اس سے حالات میں کوئی تبدیلی پیدا ہونے کی توقع ہے۔ ہمارے لئے تو یہی کافی ہے کہ ذہن کی بین الاقوامی قلم رو میں ہم ان دیکھے دوستوں سے تبادلہ خیال کریں اور پھر امریکہ میں جو دنیا کے اور ملکوں سے کہیں زیادہ، جمہوریت سے واقف ہے، غالباً جمہوریت کی اس فطری آماجگاہ میں ہم چند ایسے مفروضوں کو اپنا سکتے ہیں جو صحت فکر کی راہیں کھول دیں۔

1۔ ARISTOCRACY کے لئے اردو میں اشرافیت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن میں نے رئیسیت کے لفظ کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ مجھے ARISTOCRACY سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ان مفروضوں کو اس طرح تحلیل کیا جا سکتا ہے کہ کم سے کم امریکہ میں، جمہوریت ختم ہو گئی ہے۔ یعنی اس نے ہمیں نہ عوامی حکومت دی ہے نہ برگزیدہ لوگوں کی حکومت۔ اگر کسی سادہ دل ناظر کا یہ خیال ہے کہ امریکہ کے لوگ اپنے ملک پر حکمراں ہیں اور جنگ یا امن، اقتصادی پالیسی یا ٹیکس یا عہدوں کی نامزدگی میں ان کا کوئی ہاتھ ہے تو اس کے لئے یہ بہتر ہو گا کہ وہ ان صفحات کا مطالعہ نہ کرے۔ اور اگر کچھ ناظریہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت نے ہمیں بہترین یا عقلمند ترین لوگوں کی حکومت عطا کی ہے تو وہ بھی ان صفحات کو نہ پڑھیں۔

لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جمہوریت ناکام رہی ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم اسے قطعی حقارت کی نظر سے دیکھ کر مسترد کر رہے ہیں، اس لئے کہ بلاشبہ اس میں بہت سی خوبیاں اور بہت سی اعلیٰ صلاحیتیں مضمر ہیں۔ یقیناً عوامی حکومت نے لوگوں کو حکومت کرنے کے ان طریقوں کے مقابلے میں کہیں کم نقصان پہنچایا ہے جن کی جگہ اس نے لی ہے۔ اوسط قسم کے لوگوں کے ماتحت زندگی بسر کرنا بادشاہوں کا ہدف ستم بننے سے کہیں بہتر ہے۔ غالباً جمہوریت کی ناگزیر ناکامی اس کی آساس میں اس حد تک مضمر نہیں تھی جتنی اس کی ہیئت اور ساخت میں۔ جمہوریت نے اگر قدیم رئیسی نظام کے کچھ پہلو اپنا لئے ہوتے تو شاید یہ ایک ایسا سیاسی نظام تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جاتی جو اس نظام سے بہت بہتر ہوتا، جس میں ہم اب زندگی بسر کرتے اور احمقوں کو برداشت کرتے ہیں۔

یہ ایک ایسا امکان ہے، جس کی کھوج کرنے میں شاید کوئی حرج نہ ہو۔ آخر وہ رئیسیت کیا تھی، جو اعلیٰ ارباب سیاست کی تربیت کرتی تھی، فن کو جلا دیتی تھی اور ان لوگوں کی تخلیق کرتی تھی جنہیں عزت زندگی کے مقابلے میں زیادہ عزیز تھی۔ کیا اس میں ایسی صفات ہیں۔ حکمت جن کی آبیاری کرنا پسند کرے گی۔ کیا اس کے محاسن کو جمہوریت کی خوبیوں میں ملا کر دونوں کے مصائب دور کئے جا سکتے ہیں؟ اور کیا اس سے کسی اچھے نتیجے کی توقع ہو سکتی ہے؟ کیا رائے عامہ کے ذریعہ حکومت کے اعلیٰ افسروں کا تقرر کرنے کے بجائے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ صلاحیتوں اور بہترین اخلاق کے لوگ خود بخود ان کی طرف متوجہ ہوں۔

۲۔ طرز ہائے حکومت

یہ بات ماننی پڑے گی کہ رئیسیت اپنی شکست کے ایام میں بھی فلسفیوں میں مقبول

رہی ہے۔ سقراط، افلاطون ارسطو، سسرو، مونٹسکو، والٹیئر، ڈی ٹوکول، ٹین، رینان، اناطول فرانس، گوئٹے، نیطشے، برک، میکالے، کارلائل، ایمرسن سنتیانا، اس بات سے واقف تھے کہ ایتھنز، روما، پیرس یا واشنگٹن میں جمہوریت کا کیا رنگ رہا تھا، اس کے باوجود ان سب نے باتفاق رائے (صرف سپنیوزا ایک استثنی تھا) خدائے قدوس سے یہ دعا مانگی کہ ہمیں بہترین لوگوں کی حکومت عطا کر! آخر رئیسیت میں وہ کیا بات تھی جو ان لوگوں کو پسند آئی؟

فلسفیوں میں سب سے زیادہ حقیقت پسند فلسفی بونا پارٹ نے ایک جگہ کہا ہے کہ "قوموں اور انقلاب کے زمانوں میں رئیسیت ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اگر جاگیرداروں اور نوابوں کو ختم کر کے اسے مٹانا چاہو، تو یہ متوسط طبقہ کے امرا میں منتقل ہو جاتی ہے اور اگر اسے وہاں سے بھی مٹا دو تو یہ مزدوروں اور عوام کے قائدین کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے"

فٹز جیمز سٹیفن نے کہا ہے! تم قانون خواہ کسی طرح بناؤ تم عوام کی رائے دہندگی کو موزوں سمجھتے ہو تو اسے بھی اختیار کر لو لیکن ہر صورت میں تم مساوات سے دور رہو گے۔ اس لئے کہ سیاسی طاقت فقط شکل بدلتی ہے اپنی فطرت نہیں بدلتی۔ حکومت کو چھوٹے چھوٹے ذروں میں کاٹنے کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ ذروں کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے وہی حکومت کرے۔ حکومت ہمیشہ طاقتور کے ہاتھ میں رہے گی۔ اگر حکومت کی نوعیت فوجی ہے تو اچھا سپاہی حاکم بن جائے گا، اگر حکومت ملوکیت ہے تو وہ صفات جو بادشاہ اپنے مشیروں، سپہ سالاروں اور منتظموں میں پسند کرتے ہیں، طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ بنیں گی۔ خالص جمہوریت میں وہ لوگ حاکم ہوں گے، جو ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔" یہ ایک مختصر تجزیہ ہے جس میں تفصیلات کو نظر انداز کیا گیا ہے لیکن ایک اساسی بیان کی حیثیت سے کافی ہے۔

درحقیقت حکومت کی صرف دو شکلیں ہوتی ہیں: ایک انسان کی حکومت اور چند انسانوں کی حکومت۔ اکثریت کی حکومت ایک عبوری دور میں آتی ہے اور اکثر و بیشتر ایک مفید فریب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقلیتیں تنظیم کر سکتی ہیں، اکثریتیں نہیں کر سکیں۔ حکومت رئیسیت یا ملوکیت ہی ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

نظریاتی طور پر، ملوکیت کی حمایت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ نپولین کی اعلیٰ منتظمانہ اہلیت کے ماتحت ہر چیز (سوائے آزادی کے) مرکوز رہتی ہے اور کامیاب رہتی ہے، لیکن جدید تاریخ میں ملوکیت نادر ہے۔ ایوان، پیٹر، فریڈرک، لوئی چہاردہم اور بونا پارٹ صحیح معنوں میں بادشاہ تھے، لیکن اکثر و بیشتر بادشاہ کسی خاص طبقہ کی حکومت میں محض ایک

Scanned with CamScanner

قیمتی نمائش کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً آخری زار اور قیصر، محض امیر طبقہ کے نمائندے تھے۔ کیا (امریکی انتخابات کو چھوڑ کر) دنیا میں انگلستان کے بادشاہ کے محل کے سامنے سپاہیوں کی آمدورفت سے زیادہ مضحکہ خیز چیز کوئی اور بھی ہے؟

ہم یہاں اس عام عذر یا تاویل سے متاثر نہیں ہوں گے کہ برطانوی ملوکیت سلطنت کو یکجا رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگ اپنے بادشاہ سے محبت کرتے ہیں، لیکن جو چیز، نوآبادیوں کو یکجا کرتی ہے وہ لوگوں کے جذبات نہیں، بلکہ تحفظ اور تجارت کی ضروریات ہیں۔ یہ محض روایت ہے جو ان بادشاہوں کو اپنے تختوں پر متمکن رکھتی ہے فرانس ٹامپسن نے کہا ہے :۔ "یورپ کے تمام ممالک میں، سوائے دو کے، ملوکیت محض ایک بے سود علامت ہے۔"

ہم یہ اصول تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ہر حکومت کے پس پردہ ایک طاقتور طبقہ کار فرما ہوتا ہے۔ اور سیاسی تجزیہ کا پہلا اصول ہے، "طاقتور کو تلاش کرو" یہ طبقہ، عسکری، تجارتی یا رئیسی کسی نوعیت کا ہو سکتا ہے، یعنی حاکم اقلیت سپاہیوں کی ہو سکتی ہے جو سپہ سالاروں کو تخت پر بٹھاتی ہے، یا امیر تجارتی طبقہ جو صدروں اور بادشاہوں کے ذریعہ حکومت کرتا ہے یا قدیم خاندانوں کے اراکین جو زمینوں کے مالک ہونے کی حیثیت سے قیادت اور اقتدار کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لئے رئیس اس طرح استدلال کرتا ہے کہ رئیسیت کابدل زردار یا تشدد کی حکومت ہے۔ رومی رئیسیت کے انحطاط سے جنگجو بادشاہ برسر اقتدار آ گئے۔ فرانس اور انگلستان کی رئیسیت کے انتشار کے بعد وہاں پونڈ، ڈالر اور فرینک کی حکومت قائم ہو گئی۔ جمہوریت ایک عسکری حکومت کی مدافعت کر سکتی ہے لیکن کسی انتخابی نظام دولت کو طاقت حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی۔ فوجی حکومت کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ حکومت ان خاندانوں تک محدود کر دی جائے، جن میں حکومت کرنے کی صفات اور روایات موجود ہیں۔ فقط ایک رئیسیت ہی نئے دولت مند طبقہ کے اقتدار کا توڑ ہے۔ صرف یہی طبقہ ہے جو ایک قوم کے اخلاقی اور ثقافتی "اقدار کو سٹہ بازی" منڈی اور کارخانوں کے معیاروں اور آدرشوں کا محکوم بننے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

۳۔ "سیاست دانی"

یہ سب باتیں ناپسندیدہ نہ سہی لیکن مشتبہ ضرور ہیں۔ رئیسیت کی حمایت میں پہلے ہی یہ کہنا کہ یہ وراثتی حکومت ہے، اس کے خلاف جاتا ہے۔ لیکن آیئے ہم رئیسیت کے

علمبردار کی باتیں کسی روک ٹوک کے بغیر سنتے جائیں۔ اس کی جانبداری کو نظرانداز کر دیں، اس سے اختلاف کرتے ہوئے بھی اس سے کچھ سیکھیں۔

رئیسیت کا علمبردار اہلیت کی وراثت کو ایک اچھی حکومت کے لئے لازمی سمجھتا ہے۔ کوئی شخص پوری طرح سیاست کا اہل نہیں ہوتا، جب تک وہ اس فضا میں رچی ہوئی نہ ہو، جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔ بقول "نیطشے اسے فقط ذہن کی نہیں، بلکہ خون کی ضرورت ہے۔" اور یہی چیز نپولین میں نہیں تھی۔ وہ ایک صوبائی جرنیل کا بیٹا تھا اور باوجود کوشش کے وہ ایک اصلی رئیس کا سا توازن اور تدبر حاصل نہ کر سکا۔

پھر نیطشے کے خیال کی رو سے قیادت کے لئے "عظیم رئیس خاندانوں کی ضرورت ہے جن میں حکومت اور نظم و نسق کی روایات رس بس گئی ہوں۔ پرانے خاندان کئی نسلوں تک صحیح عزم اور صحیح رجحانات کے ضامن ہوتے ہیں" اس لئے رئیس "پیدائش کے اتفاق" کے تصور کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ پیدائش کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں، بلکہ ایک اصول ثانیہ ہے۔ یہ صدیوں کی ترقی کا نتیجہ اور مستقبل کی استعداد اور قابلیت کی ضمانت ہے۔ ہم حیوانوں کی نسل کے معاملے میں بڑی احتیاط سے برتتے ہیں۔ ہم فقط ان کے ماں باپ کا نہیں بلکہ کئی کئی نسلوں کا پتا لگاتے ہیں۔ رئیسیت کا علمبردار اسی طرح انسانوں کی نسل کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہ اسی طرح وراثت کو اہم سمجھتا ہے جس طرح جمہوریت پسند مواقع کو یا اشتراکی ماحول کو اہم جانتے ہیں، اس لئے وہ اپنے رتبہ سے کم لوگوں میں شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ وہ دوسری نسل سے ایک دوسری جنس کی طرح متنفر ہوتا ہے۔ وہ قدرتی طور پر یا جماعتی روایات کے اثر سے یہ جانتا ہے کہ نسلوں کے اختلاط سے شخصیت کمزور ہو جاتی ہے، چاہے بعد میں وہ بتدریج ایک نئی اور بہتر نسل کا باعث بن جائے۔

لیکن اعلیٰ مناصب کے لئے اہلیت کی وراثت اچھے حکام کی تخلیق کے لئے لازمی ہے۔ چند لوگوں کو پیدائش ہی سے الگ کر دیا جائے تاکہ انہیں ذہن اور شخصیت کی نشوونما کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ زندگی، دولت اور تہذیب، دونوں کے حصول کے لئے بہت مختصر ہے۔ زندگی میں ان میں سے صرف ایک ہی چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ انسانیت کا فائدہ اسی میں ہے کہ چند لوگوں کو انفرادی اقتصادی کشمکش سے محفوظ رکھا جائے۔ "مزدوری کے بغیر زندگی بسر کرنے کا امکان ذہنی ترقی کے لئے لازمی ہے" رئیسیت اسی لئے، سیاستدانوں کی تربیت کے لئے بہترین مدرسہ ہے۔

جمہوریت پرست یہ نہیں سمجھتا کہ اہل سیاست کی تربیت کے لئے ایک معمولی ہنرمند کی تعلیم سے زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ حالیہ تبدیلیوں سے پہلے' انگلستان کے قائد' پہلے گھروں میں پھر ایٹن اور ہیرو میں پھر آکسفورڈ اور کیمبرج میں اور پھر معمولی عہدوں کے محنت طلب فرائض میں اعلیٰ عہدوں کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ انگریزی تہذیب کا' اس کے جذبہ حریت کے بعد' بہترین پہلو یہ ہے' کہ اس کی یونیورسٹیاں تجارت اور سرمایہ سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر سلطنت کے حکام پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ ظالم حاکم تھے لیکن لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی ستم گری ان کی حکومت کے لئے کس قدر لازمی تھی۔ اور یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے ننھے انگلستان کو ساری دنیا سے زیادہ بلند کر دیا۔

جمہوریت میں لوگوں کو سیاست کے لئے تیار کرنا بے سود ہے۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ رواج اور انتخابات کے امتحان میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اچھی تربیت انہیں شریف مفکر بنا دے گی' یعنی وہ ایسے لوگ بن جائیں گے' جو انتخاب کے ہما ہمی اور شور و غوغا سے اجتناب کرتے ہیں۔ سینٹ بیوو نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جمہوریت قابلیت کو گوشہ گیری اختیار کرنے پر مجبور کر دے گی۔ رینان نے پیش گوئی کی تھی کہ جمہوریت بدمعاشوں اور عطائیوں کی حکومت سپرد کر دے گی۔ ۱۸۳۰ء میں ڈی ٹوک ول نے امریکہ کے دوسرے سفر کے بعد لکھا تھا۔ "آج امریکہ میں قابل ترین لوگوں کو اعلیٰ عہدے نہیں دیئے جاتے اور یہ ماننا پڑے گا کہ جمہوریت کی ترقی سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے' امریکی سیاستدانوں کی نسل پچھلے پچاس برس میں نمایاں طور پر کمزور ہو گئی ہے" خدا کا ذکر ہے کہ ڈی ٹوک ول مر چکا ہے اور آج ہمیں نہیں دیکھ رہا۔

۴۔ قدامت پسندی

رئیس کے لئے نظم و ضبط' حکمت کی ابتدا ہے اور تبدیلی گناہ کا چکر۔ آزادی ایک قیمتی چیز ہے لیکن ضبط و نظم کے بغیر آزادی کیونکر ممکن ہے؟ اور اگرچہ رئیسیت سیاسی آزادی پر پابندیاں عائد کرتی ہے' یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اس انفرادیت کشی سے بدتر ہے جو بے کیف اکثریت کے مجنونانہ دباؤ سے ظہور میں آتی ہے۔ ضبط و نظم کے ساتھ ایک قوم کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ایک باقاعدہ پالیسی پر قائم رہے۔ رئیسیت کے ذریعہ سیاست انتخاب کے جوئے سے آزاد ہو جاتی ہے اور ان کاموں کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے جن کی تکمیل کے لئے کئی نسلیں درکار ہیں۔ رومی سینٹ یا الزبتھ کے عہد کی پارلیمنٹ کی

طرح ایک رئیس ادارہ ایک اجتماعی تسلسل یا بقا کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے مقاصد، افراد کی موت یا سیاسی مہموں کی منافقت سے فنا نہیں ہو جاتے۔ ڈی ٹوک ول کہتا ہے "تقریباً وہ تمام قومیں جنھوں نے دنیا کی تقدیر کو عظیم منصوبوں کی تخلیق اور تشکیل سے متاثر کیا ہے، سب رئیسی اداروں کے ماتحت زندگی بسر کرتی رہتی ہیں۔"

یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی حکومت، تجربہ یا تبدیلی کے راستہ میں رکاوٹ ہے، لیکن یہ ہے بہت صحت مند۔ ایک آزاد خیال سیاست دان بھی، اگر وہ ماضی سے آگاہ ہے یہ جانتا ہے کہ دس نئے خیالوں میں سے نو ضرور غلط ہوں گے۔ تاریخ کا تلخ ترین مذاق یہ ہے کہ اکثر وہ عقائد جن کے لئے لوگوں نے جانیں دی ہیں بعد میں مضحکہ خیز ثابت ہوئے ہیں۔ تغیر کو روکنا برا، لیکن لازمی ہے۔

ہم یہاں سائنس اور ادب کی مثال سے فریب کھا جاتے ہیں۔ چونکہ تجربہ ان کی جان ہے، ہم اس نتیجہ پر جا پہنچتے ہیں کہ بہترین حکومت وہ ہے جو تغیر کی راہیں کھلی رکھتی ہے۔ لیکن سماج کوئی معمل نہیں اور انسان (سوائے میدان جنگ کے) اپنے آپ کو چیڑپھاڑ کے لئے پیش نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ سائنس میں بھی ہمارا تجربہ بے بس حیوانوں یا بے جان چیزوں تک محدود رہتا ہے۔ لیکن جب سائنس کے انکشافات کے انسانوں پر اطلاق کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ہم قدامت پسندوں کی طرح محتاط ہو جاتے ہیں۔ ہم سیاسیات میں نہیں بلکہ غذا اور ادویہ کے معاملہ میں تغیر کی مدافعت کرتے ہیں۔ خیالات سے کھیلنا اور زندگیوں پر تجربہ کرنا برابر نہیں۔

لیکن جہاں کروڑوں زندگیوں کا سوال ہو، تغیر کی مدافعت ضروری ہے۔ بڑا اجسام آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہیں۔ ان میں بے نظمی پھیلانا، صحت اور تنظیم بحال کرنے سے آسان ہے۔

طب کی طرح سیاست میں ایک مرض کا علاج ایک اور غیر متوقع مرض پیدا کر دیتا ہے۔ سماج کا تانا بانا ہمارے اجسام اور اذہان سے زیادہ پیچیدہ ہے کیونکہ یہ کروڑوں رشتوں اور رابطوں پر مشتمل ہے۔ اگر انہیں الگ چھوڑ دیا جائے تو یہ باہمی رشتے کوئی سازگار صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن جب منتخب حکومت یا مجمع عافیت ان اہم رابطوں کو قانون کی مصنوعی باقاعدگی میں تحلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو نتیجہ وہی ہوتا ہے، جو چلتے وقت ٹانگوں کا تجزیہ کرنے سے ہوتا ہے۔

اگر سماج، ریاضی، علم الاشکال یا کسی اور علم کی طرح جو زندگی سے کوئی تعلق نہیں

رکھتا کوئی منطقی نظام ہوتا تو صورت بالکل مختلف ہوتی۔ لیکن سماج، ہماری شخصیت کی طرح ایک سلسلہ نشوونما ہے، کوئی اصول یا قیاس نہیں۔ ٹین نے کہا تھا کہ سماج کو کسی آئینی مفکر نے کسی گہرے اصول کے مطابق منظم نہیں کیا بلکہ اسے کئی نسلوں نے ضروریات زمانہ کے مطابق ڈھالا ہے۔ یہ منطق کی نہیں تاریخ کی تخلیق ہے۔ اور دنیا مفکر جب اس کی طرف دیکھتا ہے تو اس کی بے ربط اساس، الجھی ہوئی عمارت اور مرمت کے واضح نسان دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ ہر بچہ کو اس تردید کا علم ہے جو برک نے روسو کے خیال کی تھی، کہ "سماج ہمعصروں کے درمیان معاہدہ سے نہیں بنا بلکہ یہ ایک غیر شعوری اور تدریجی عمل ہے اور اس میں اگر کوئی میثاق ہے تو وہ فقط، ماضی، حال اور مستقبل کا باہمی میثاق ہے۔" ماضی سے قطع تعلق کرنے سے وہ عدم تسلسل پیدا ہوتا ہے جو جنون پیدا کرتا ہے اور وہ اجتماعی نسیان جو صدموں اور حادثوں سے پیدا ہوتا ہے۔ فرد کی ذہنی صحت اس کے حافظہ کی بنا پر مبنی ہے اور سماج کی ذہنی صحت اس کی روایات کی بقا پر دونوں حالتوں میں تسلسل کی شکست سے نیوراتی عمل پیدا ہوتا ہے، جو زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ پیٹر نے جب روس کو ایک ہی نسل میں مغرب زدہ بنانا چاہا تو یہی نتیجہ نکلا اور جب لینن نے اسے ایک ہی نسل میں اشتراکی بنانا چاہا تب بھی یہی نتجہ بر آمد ہوا۔

۵۔ حکومت اور تہذیب

اخلاق اور تہذیب کے مسائل پر غور کیجئے۔ جمہوریت نے لوگوں کے دلوں میں ایک خوف پیدا کر دیا ہے جسے ضمیر کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن کیا اس نے وہ آرزوئے احسن بھی پیدا کی ہے جو رئیس میں جذبہ خود داری کی تخلیق کرتی ہے؟ کیا ایک رئیس، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو کبھی لوگوں کو یہ حکم دے گا کہ انہیں شراب نہیں پینی چاہئے؟ کیا رئیسیت میں آج کل کی سی بازاری موسیقی یا رقص پیدا ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی رئیس منافق بھی ہو سکتا ہے جو عوام کی خوشامد کر کے انہیں اپنا گرویدہ بنائے؟ کیا جمہوری گروہوں میں ایک سوقیانہ انداز فکر و عمل نہیں ہوتا جو رئیسیت کے سایہ عاطفت میں کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا؟

پروفیسر روس کہتا ہے۔ "امریکیوں میں تجارتی اقدار، رئیسیت کے زیر اثر نہیں رہتیں۔ پرانی دنیا میں حکمران طبقہ، تاجر کے نقطہ نظر سے نفرت کرتا نظر آتا ہے، اور اس بات پر فخر کرتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو حظ اٹھانے کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ چونکہ

Scanned with CamScanner

یہ رئیسی نقطہ نظر عوام تک پہنچ جاتا ہے اس لئے یورپ میں کاروبار صرف کاروباری طبقہ تک محدود ہے۔" غالباً یہ موازنہ صرف امریکہ کے خلاف نہیں جاتا۔ یورپ بھی جمہوریت کے شکنجہ میں ہے اور وہ بھی اپنا اخلاق ادنیٰ طبقوں سے حاصل کرتا ہے۔ لیکن امریکہ میں تجارت کے قائدین نے ایسی روایات پیدا کرلی ہیں' جو رئیسیت کا شیریں ثمرہ ہوتی ہیں۔

جمہوریت پرست کے دل میں بھی رئیسیت کی مخصوص پسندیدہ صفات مثلاً چال ڈھال کی توانائی اور سہولت' ذوق کی نفاست' مذاق اور بیان کی احتیاط' فطری خودداری اور فیاضی کے لئے ایک رشک آمیز ستائش کے جذبات موجود ہوتے ہیں اور وہ ایک نجیب انسان کی خوش خلقی سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لئے "ہر انگریز نوابوں سے محبت کرتا ہے" اور بقول اناطول فرانس "جمہوریت پسند نجابت سے زیادہ کسی چیز کا احترام نہیں کرتا۔" جمہوریت میں اجتماعی کامیابی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے رئیسوں کے انداز اختیار کرنا۔ امریکہ میں ایک کامیاب مقرر بننے کے لئے فقط ایک ہی شرط ہے اور وہ ہے انگریزوں کا طرز گفتار اختیار کرنا۔

یہ بات قابل عفو اور فطری ہے' کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایک نجیب شخص کی تعمیر میں کئی نسلیں صرف ہوتی ہیں۔ کوئی مفلس شخص جو بچپن ہی سے اقتصادی جنگ کی غلاظتوں میں مبتلا رہا ہو۔ شاید ہی ذہن و جسم کی وہ پاکیزگی اور نفاست' وہ باحیا خودداری اور متانت پیدا کرسکے جو اس شخص میں موجود ہیں' جسے ابتدا ہی سے زندگی کی آسائشیں حاصل رہی ہیں۔ دنیا کو اب یہ طے کرنا ہے کہ دونوں میں سے کسے انتخاب اور اختیار کرے' اس نفاست طبع کو جو اوپر کے طبقہ سے بتدریج نچلے طبقہ کی طرف آتی ہے یا اس سوقیانہ مزاج کو جو نیچے سے اوپر کی طرف ابھرتا ہے۔

ان دونوں مزاجوں کا اختلاف' اس ادب سے واضح ہے جو ان دو طرح کی حکومتوں اور زندگی کے طریقوں میں پیدا ہوتا ہے۔ استثنیٰ کو چھوڑ کر جو زندگی کے متعلق ہر کلیہ میں ہوتی ہے' رئیسیت کا ادب کلاسیکی صورت اختیار کرتا ہے اور جمہوریت کا ادب رومانی صورت۔ کچھ عرصہ کے لئے سائنس اور اشتراکیت کے اثرات نے ہمیں "حقیقت پرستی" کا عہد عطا کیا' جس میں ادب نے طبیعات کی معروضیت کا منہ چڑایا اور زندگی کے معائب اور ناانصافیوں کو بے نقاب کیا' لیکن درحقیقت ادب کی رقابت کلاسیکی ذہن اور رومانی تخیل کے تضاد میں اسی طرح نظر آئی جس طرح سیاست میں موروثی اور اکتسابی دولت کی رقابت نظر آتی ہے۔ ایک جمہوری عہد اپنے صنعتی اور تجارتی وجود کی بے کیفی کو رومانی ادب سے دور

Scanned with CamScanner

کرتا ہے۔ وہ اپنی دوکانوں اور کارخانوں کی بے کیف زندگی سے مجونانہ محبت کے افسانوں میں پناہ لیتا ہے، لیکن رئیس اپنے جذبات کے بے قابو ہونے اور زبان کے بے لگام ہونے پر شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ اس کا تخیل ہمیشہ عقل کے ماتحت رہتا ہے۔ ادب اور زندگی میں ضبط اس کی جان ہے۔ وہ کم گوئی سے کام لے سکتا ہے لیکن مبالغہ نہیں کرتا۔ وہ خاموشی سے بولتا ہے تاکہ لوگ اسے اچھی طرح سن لیں۔ وہ مونٹین کے مضامین یا روح قوانین لکھ سکتا ہے لیکن امیل یا لے مذرابل کبھی نہیں لکھ سکتا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ادب کی تعمیر ہر طرح کی کتابوں اور دنیا کی تعمیر ہر طرح کے آدمیوں کے بغیر ناممکن ہے۔

عموماً رئیسیت فنون اور علوم کی حمایت کرتی ہے اور فیاضی سے غیر معمولی افراد کی سرپرستی کرتی ہے۔ ٹارڈ کہتا ہے کہ رئیسیت نئے خیالات کو اپنانے میں پہل کرتی ہے اور وہ خواہ کہیں جنم لیں، چند تعلیم یافتہ لوگوں میں سب سے پہلے پناہ حاصل کرتے ہیں، جن کے ذریعہ وہ ادنیٰ طبقہ تک پہنچتے ہیں۔ ستیانا کہتا ہے کہ "ابھی تک تہذیب ان خصائل کی تبلیغ اور عمومیت کا نام تھا، جو خاص خاص مرکزوں سے وابستہ رہے ہیں" رینان کہتا ہے کہ "تمام تہذیب رئیسیت کا کرشمہ ہے" اسے یہ اندیشہ تھا کہ "جمہوریت میں سائنس روبہ انحطاط ہو جائے گی، جونہی عوام اس کے مفہوم سے واقف ہو گئے۔" سمز کہتا ہے "جماعتیں، اختلاف پیدا کرتی ہیں عوام روایات کو قائم رکھتے ہیں" لے باں کہتا ہے۔ "تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہم اپنی ترقی کے لئے چند مختص افراد کے رہین منت ہیں، ذہین مخترع تہذیب کی رفتار کو تیز کرتا ہے۔ دیوانے اور پاگل ہی تاریخ کی تخلیق کرتے ہیں۔" یہ حقیقت ہے۔

٦۔ جمہوریت اور انتشار

عوام خود بھی رئیسیت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ سیاسیات اور افکار میں قدامت پرست ہوتے ہیں اور وہ اس حکومت کو اچھا سمجھتے ہیں جو آہستہ آہستہ اپنے استعماری مقاصد کی تکمیل کی کوشش کرتی ہے۔ وہ دباؤ کے زیر اثر انقلاب بپا کرتے ہیں لیکن وہ غیر منتخب قوت کے دائمی پرستار ہوتے ہیں۔ اطالیہ کے لوگ اپنے آمر کا نام فخر و مباہات سے لیتے تھے، بالخصوص جب وہ اس کے ماتحت نہیں رہتے تھے۔ یہ واقعہ کہ اس نے جمہوریت کے تمام علائم کو ختم کر دیا، انہیں بالکل ناگوار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ انگلستان میں وہ اخبار، جنہیں

Scanned with CamScanner

عوام پڑھتے ہیں، رئیسوں کے متعلق خبروں سے بھرے ہوتے ہیں، اور دو میں سے ایک دوکان شاہی نشان کی نمائش کرتی ہے یا اس بات کو فخر سے بیان کرتی ہے کہ اس کی اشیا بادشاہ سلامت خریدتے ہیں۔ سوائے ایک استثنیٰ کہ ۱۹۲۷ء میں امریکہ اخباروں کا مقبول زین فرد ایک انگریز شاہزادہ تھا اور مقبول ترین عورت بلقان کی ایک ملکہ تھی۔

یہ ممکن ہے کہ آج لوگ پہلے سے زیادہ خوش ہوں۔ ایجادات نے ان کی آسائشوں اور ان کی طاقتوں میں اضافہ کر دیا ہے اور دولت نے انہیں سفر اور دلچسپی کے نئے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ لیکن زندگی کے اس تنوع اور ہماہمی کے ساتھ روح کا اضطراب بڑھ رہا ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ وجود ایک ظالمانہ مقابلہ اور عزائم کی پیکار ہے۔ وہ لباس، موٹر اور مکان کے لئے ایک لامتناہی تناؤ ہے۔" "نیا سماج" اناطول فرانس نے کہا "ہر قسم کی امید کو برماتا ہے اور انسان کی تمام قوتوں کو تحریک دیتا ہے۔ زندگی کی کش مکش پہلے سے زیادہ تند و تیز ہے۔ فتح زیادہ غالب اور شکست زیادہ ظالم ہے۔

رئیسیت کے ضبط و نظم کے ساتھ دلوں سے امن اور سکون ختم ہو گیا ہے۔ انقلاب فرانس سے پہلے سماج، مختلف چھتوں کی ایک عمارت ہوتا تھا، جن کے درمیان کوئی زینے نہیں تھے۔ کسان کھیتی باڑی کرتے تھے لیکن اوپر چڑھنے کی آرزو نہیں کرتے تھے اور رئیسیت ان کے حملوں کے بغیر پھل پھول رہی تھی۔ ٹیلیرینڈ نے کہا ہے۔ "جو لوگ ۱۷۸۹ء سے پہلے زندہ نہیں تھے انہوں نے زندگی کی لذتیں نہیں محسوس کیں" لیکن آج ہر شخص ایک شدید بخار میں مبتلا ہے، اسی بخار سے ہماری دولت اور ہمارے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص صدر بن سکتا ہے اور اس کا نتیجہ وہ بیتاب اور مستقل آویزش ہے، جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نظر نہیں آئی۔ امن غیر مساوی لوگوں کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ مساوات، کا دعویٰ جنگ کا باعث بنتا ہے۔ جمہوریت، سیاسیات، اقتصادیات اور روح میں کش مکش پیدا کرتی ہے۔ ہر چہرہ پر فکر اور اضطراب نقش اور کندہ ہے اور ہر گھر میں اسی وجہ سے غم و اندوہ کی فراوانی ہے۔ جب سماج انسانوں کے عزم و ذہانت کے فطری اختلافات کو تسلیم کر لے گا اور مساوات پر مبنی منافقانہ اداروں کو مسمار کر دے گا، تب لوگ امن حاصل کریں گے۔ اس وقت سماج مقابلہ سے خوش خلقی، کمیت سے کیفیت، تخیل سے ذہانت اور دولت سے فن کی طرف ترقی کرے گا۔

۷۔ رئیسیت کی خامیاں

یہ ہے رئیسیت کے حق میں استدلال- اس استدلال میں جمہوری عناصر کو قطعی نظر انداز کیا گیا ہے- آیئے ہم پہلے ان تفصیلات پر نظر ڈالیں جو ہمیں قائل نہیں کر سکیں اور اس کے بعد باقی تفصیلات کو اپنے فلسفہ میں سمونے کی کوشش کریں-

رئیس نے اپنے حق میں سب دلائل بڑی جانب داری کے ساتھ نہیں کئے ہیں اور بہت سے نکتوں کی صراحت نہیں کی- آیئے ہم فرض کر لیں کہ رئیسیت زیرک تر سیاست دان اور زیادہ دور اندیش انسان پیدا کرتی ہے، لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ان کی ہنرمندی عوامی بہبود پر صرف ہو گی، رئیسیت شاذ و نادر ہی عوام کے ساتھ وہ ربط پیدا کرتی ہے جو ذہن کا جسم کے ساتھ ہوتا ہے- وہ اپنا اکثر وقت رقیبوں کو رو سیاہ کرنے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے میں خرچ کرتی ہے اور لوگوں کی طرف قطعی توجہ نہیں کرتی-

اب ذرا رئیسیت کی جنگجوئی پر غور کیجئے- جنگ شکار کی طرح ان کے لئے کھیل تھی- دشمن شکار تھا اور جنگ کرنے والے لوگ محض ان کے شکاری کتے- یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی فیاضی سے جنگ میں قربان کر دیتے تھے- ان کی ہمت اور جرات مسلم ہے- پھر یہ بھی صحیح ہے کہ وہ کبھی کبھی متوسط طبقہ سے کم ظالم اور کینہ پرور بھی ہوتے تھے- لائیڈ جارج کا خیال تھا کہ قیصر کو روشنی کے کھمبے سے باندھ کر پھانسی دے دی جائے لیکن لینڈاؤن نے اسے احتیاط کی تلقین کی- فرانس کے جمہوریت پسند اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ اپنا آخری بچہ بھی قومی مفاد پر قربان کر دیا جائے لیکن شہنشاہ چارلس نے منکسرالمزاجی سے امن کی درخواست کی- لیکن ہمیں "گلاب کی جنگ" بھی یاد ہے- لوئی چہاردہم کے جارحانہ حملے بھی یاد ہیں- فریڈرک کی ہولناکی، پولستان کی تقسیم اور وہ وفاق بھی یاد ہیں، جنہوں نے بیس برس تک بوربون خاندان کو فرانس کے تخت پر متمکن کرنے کے لئے جنگیں لڑیں-

طاقت اپنی غیر ذمہ داری اور احساس کی شدت کے مطابق لوگوں کو خراب کرتی ہے- رئیسیت اکثر ظالم ہوتی ہے- اسپارٹا کے لوگ اپنے غلاموں سے ظلم روا رکھتے تھے- روما کے نواب اپنے قرضداروں پر جبر کرتے تھے- انگریز نواب، اپنے آئرستانی کسانوں پر تشدد کرتے تھے- ایسی رئیسی ثقافت میں کیا شان ہے جو اس بربریت پر اتر آئے جو روی سپارٹکس کے پیرووں سے، یا کلائیو اور ہیسٹنگز ہندوستان کے لوگوں سے روا رکھتے تھے- یہ بات شاید اب صحیح نہ ہو لیکن یہ اصول قابل عمل ہے "کہ کوئی شخص اس قابل نہیں کہ دوسرے کی رضا کے بغیر اس پر حکومت کرے-" جمہوری نصب العین میں اگرچہ ہر بات کی

حیثیت فقط نصب العین کی ہے، لیکن اس میں بہت عمدہ ممکنات پنہاں ہیں۔ یہ نصب العین ہر شخص کو یہ جرات دلاتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط بناتا اور نگاہ کو بلند کرتا ہے۔ منتشر افراد کا ملک جو ضبط و نظم کی راہ پر گامزن ہے، غلاموں کی اس قوم سے بہتر ہے، جس کی پناہ گاہ فقط انقلاب ہے۔

ہاں، ثقافت، اقلیت کا تعیش ہے اور شاید خاصی مدت تک رہے، لیکن جو شخص حقیقت سے آگاہ ہے کبھی رئیسیت کو فن اور علم کے ساتھ وابستہ نہیں کرے گا۔ ترقی چند مخصوص لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن ان چند لوگوں کو ترقی دینے کی یہ صلاحیت لازماً وراثت کی بنا پر نہیں حاصل ہوتی۔ جدید سائنس کی نشوونما، یقیناً صنعت اور رسل و رسائل کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ وہ معاملات ہیں جن میں رئیس کبھی دل چسپی نہیں لیتا۔ کبھی کبھی کاؤنٹ، رمفورڈ کی طرح بعض رئیس بھی سائنس سے کھیلتے ہیں لیکن اگر ہم اس فہرست سے ان لوگوں کے نام خارج کر دیں، جنھوں نے اپنے کارناموں کی بدولت نواب کا خطاب حاصل کیا تو ہم یہ دیکھیں گے کہ سائنس سراسر متوسط طبقہ کی تخلیق ہے۔

اور یہی حال فن کا ہے۔ رئیسیت فن کی تخلیق نہیں کرتی، محض اس کی سرپرستی کرتی ہے۔ تاریخ فن کے زریں عہد رئیسیت کے عہد نہیں، وہ یورپ یا مصر کے جاگیرداری عہد نہیں۔ یہ عہد وہ ہیں جو ایک نئے متوسط طبقہ کے عروج سے وابستہ ہیں اور ان کی شان و شوکت محلوں میں نہیں بلکہ آزاد شہروں اور تجارت کے مرکزوں میں ہے۔ یونانی ڈراما، یونانی تاجروں نے پیدا کیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایسیکس، سوفوکلیس اور یوروپیڈالیس کے ڈرامے دولت مندوں نے اس لئے سٹیج کیے تھے کہ وہ اس طرح اپنی ریاست کا اعزاز بڑھانا چاہتے تھے۔ گوتھک کلیسا کسی نواب نے نہیں بلکہ تاجروں کی انجمنوں نے تعمیر کئے تھے۔ وہ نزاکت ماب نواب نہیں بلکہ دنیا دار تاجر تھے جنھوں نے یوکریٹس، ہوریس اور ورجل کی امداد کی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ انگریز رئیسوں نے شیکسپئر کی مالی امداد کی تھی، لیکن احیائے علوم کے اخراجات میڈیکی کے مہاجنی خاندان نے برداشت کئے تھے۔ رئیسوں نے جانسن پر نزیا چیٹرٹن کو مدد دینے سے انکار کر دیا اور اپنے بائرن اور شیلے کو ملک بدر کر دیا، لیکن کاروبار اور صنعت کی بڑھتی ہوئی دولت نے انیسویں صدی کے انگلستان اور فرانس کے پرزور ادب کی پرورش کی۔ صرف جرمنی میں فریڈرک اعظم، وائیمر کے ڈیوک کارل آگسٹ اور بویریا کے بادشاہ لڈوگ کی مثالوں سے رئیسیت اپنی حمایت میں کوئی معقول بات کہہ سکتی ہے۔

درحقیقت، رئیس، فنکاروں کو مزدوروں کا درجہ دیتے ہیں، جیسا کہ مصری رئیسیت انہیں سمجھتی تھی۔ رئیس زندگی کے فن کو فن کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور وہ کبھی اس فن کارانہ جانفشانی کے لئے تیار نہیں ہوتا جو عظمت ذہن کا طغرائے امتیاز ہے۔ وہ ادب تخلیق نہیں کرتا کیونکہ وہ ایسے ادب کو جس کا مقصد اشاعت ہو، خود نمائی سمجھتا ہے۔ کوئی رئیس اپنی تحریروں میں ریبلیز کی طرح آزادی سے بیباک مزاج پیش نہیں کر سکتا، یا میکیاولی کی طرح سیاسی اسرار نہیں بیان کر سکتا، یا روسو کی طرح اتنے جوش و خروش سے تبلیغ نہیں کر سکتا، یا اناطول فرانس کی طرح شاندار مضامین یا افسانے نہیں لکھ سکتا، کیونکہ اناطول فرانس (جو کہ ایک کتب فروش کا بیٹا تھا) کی خوبی اس کی دل آویز چوٹیلی مایوسی ہے۔ رئیس کی تربیت اس طرح ہوئی ہے کہ وہ آخوت کا مضحکہ اڑانے کیونکہ وہ اس دنیا کو اپنے قبضہ قدرت میں لا چکا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ جدید رئیسیت پر ایک بے نیاز اور سطحی لذت پسندی حاوی ہے۔ ایک مکمل انتشار جس میں اعلیٰ درجے کے حقوق پوری طرح حاصل ہوتے ہیں لیکن ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وراثت کے تنگ نظریہ اور شادی کی چند مرصع خاندانوں تک حد بندی کی وجہ سے انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ نسل جسمانی طور پر کمزور اور اخلاقی طور پر ناتواں ہو جاتی ہے۔ اور ایک صدی میں ذہنی عظمت سے اوسط ذہنی صلاحیت تک پہنچ جاتی ہے۔ پیٹر اعظم اور نکولا اول، ولیم اورنج اور جارج سوم کے درمیان صرف چند نسلوں کا فاصلہ تھا۔ سٹوارٹ، بوربون، ہیپرگ ہوہیزولرن اور رومنوف خاندان انحطاط پذیر ہو گئے یہ نظریہ کسی شہادت کا محتاج نہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ وراثت میں ولیم بھی ہوتے ہیں، فریڈرک بھی اس کے فوائد کم ہیں اور نقصان زیادہ۔ ذہنی عظمت کسی طبقہ کے لوگوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہے اگرچہ اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات وہاں زیادہ ہیں، جہاں اسے بافراغت روزی میسر ہو۔ لیکن وہی عظمت اپنے انہماک کی سختیوں سے خستہ و شکستہ ہو کر بالاخر خشک اور بے برگ و بار رہ جاتی ہے۔ وراثتی رئیسیت عوام کے صبر و شکر، قناعت اور کم ہمتی کی وجہ سے خاصی دیر تک قائم رہی ہے، لیکن ہیپرگ خاندان کی میعاد، پاپائیت کے مقابلہ میں کیا ہے؟ یورپ کے اہم حاکم پاپائے روم تھے اور عظیم ترین ادارۂ حکومت کلیسا تھا، لیکن کلیسا میں وراثت کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور کوئی کسان بھی پاپائے روم بن سکتا تھا۔ تاریخ کی مستحکم ترین حکومت، ایک رئیسی جمہوریت تھی۔ غالباً کسی دن ہم بھی اس قسم کی حکیمانہ حکومت قائم کر لیں گے۔

Scanned with CamScanner

۸۔ ایک اور عطائی نسخہ

انسانی حکومت کے پیچیدہ مسئلہ میں اگر ہم پر کوئی بات پوری طرح واضح ہے تو صرف یہ کہ سیاسی وراثت کا اصول دراصل انتشار کا اصول ہے کیونکہ یہ حماقت کی حفاظت اور تبلیغ کرتا ہے۔ موروثی ناقابلیت کے ذریعہ نظم و نسق کی راہیں مسدود کرتا ہے اور ایک مستحکم ریاست کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے اس لئے کہ ہر صلاحیت کی جو فرد کے اندر موجود ہو، خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو آبیاری ہونی چاہئے تاکہ وہ ملک و قوم کی خدمت کر سکے۔ جمہوریت کے الفاظ و اقوال کے پس پردہ یہی اہم حقیقت پوشیدہ ہے کہ اگرچہ افراد یکساں نہیں ہو سکتے، لیکن مواقع مساوی ہو سکتے ہیں اور یہ کہ فرد کے حقوق، عہدہ اور طاقت کے حقوق نہیں بلکہ وہ انسانی حقوق ہیں جو اس کی قابلیت کی آزمائش کا ہر راستہ اس پر کھلا رکھیں اور اس میں عہدہ اور طاقت حاصل کرنے کی اہلیت کی پرورش کریں۔

رئیسیت بہترین لوگوں کی حکومت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ حکومت خاندانی ہو، لیکن ہم اس قسم کی رئیسیت کے محض خواب دیکھتے رہے ہیں۔ اس کے نہ ہونے سے ہم اس قدر زبوں حال ہیں، لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم نوابوں کی حکومت چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بہترین انسانوں کی حکومت چاہتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری ملاقات ان مردوں اور عورتوں سے ہوتی رہتی ہے، جو کارہائے نمایاں کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، لیکن سیاست کی راہیں ان پر بند ہیں۔ جمہوریت کو یہ راہیں کھول دینی چاہئیں۔

اس مسئلہ کا حل بہت مشکل ہے، کیونکہ ہمارے انحطاط نے زندگی میں کلبیت پیدا کر دی ہے اور ہر تجویز کے بارے میں ہمارا ردعمل، ایک مایوس تبسم ہوتا ہے۔ ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دنیا ہمیشہ اسی طرح رہی ہے اور ہمیشہ اسی طرح رہے گی۔ ہم اب جب کہ بہت زیرک ہو گئے ہیں، حیوانوں کی حکرانوں پر راضی ہیں۔ شاید والٹیئر صحیح کہتا تھا کہ عقلمند انسان دنیا کو بعینہٖ اسی طرح چھوڑنے پر قانع ہے جس طرح کہ اس نے اسے پیدائش کے وقت پایا تھا۔ لیکن، جنت الارض، کا تصور ہمارے لہو میں بس گیا ہے اور ہمیں مطمئن ہو کر بیٹھنے نہیں دیتا۔ رئیسیت میں بھی چند خوبیاں ہیں، ہمیں انہیں تلاش کرنا ہے اور انہیں اس جمہوری نمائش کی حقیقت کے ساتھ مربوط کرنا ہے۔

Scanned with CamScanner

۱۹۵۹ء میں امریکہ میں میئر کے انتخاب کا تصور کیجئے' یہ انتخاب اب تک ایک جمہوری انتخاب ہے۔ ہر مرد اور عورت عہدوں کے لئے صرف ان لوگوں کو منتخب کرتا ہے جن سے وہ بہترین کام کی توقع رکھتا ہے' یہ انتخاب سب انتخابات سے زیادہ جمہوری نوعیت کا ہے' کیونکہ آج کل الیکشن میں ہمارا انتخاب عموماً دو یا تین اشخاص تک محدود ہوتا ہے' جو چند خاص طبقوں کے نمائندے ہوتے ہیں' جن پر ہمارا اختیار نہیں ہے۔ لیکن اس خیالی انتخاب میں ایک سو کے قریب نمائندے ہیں۔ یہ انتخاب آزاد ہے۔

یہ سو نمائندے کیونکر نامزد ہوئے؟ کیا انہیں سو جماعتوں نے نامزد کیا ہے؟ کیا وہ ریشہ دوانیوں یا کسی جماعت سے وفاداری کی وجہ سے نامزد ہوئے ہیں؟ نہیں' وہ کسی راستہ سے نہیں آئے۔ انہوں نے محض اپنے نمائندہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور اپنے مقاصد واضح کر دیئے ہیں' اور بس۔

انتخاب' نامزدگی کے بغیر؟ جماعتوں کا نامزدگی پر اختیار ختم ہوا۔ کیا ہر شخص اپنے آپ کو میئر' گورنر یا صدر بننے کے لئے پیش کر سکتا ہے؟ نہیں کوئی شخص اس معاملہ میں آزاد نہیں' فقط اس کی قابلیت اور تجربہ اور تربیت اسے پیش کرتے ہیں۔ انتخاب کا میدان چاہے کتنا ہی وسیع ہو' اس طرح کوئی نااہل شخص نہیں چنا جا سکتا۔

ان میں سے ہر شخص نے اپنی زندگی اپنے آپ کو اس عہدے کا اہل بنانے پر صرف کر دی ہے۔ اس نے کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور پھر سیاسی انصرام کے جامعہ میں چار برس کے لئے شدید محنت سے عملی تربیت حاصل کی ہے۔ حکومت اس کے لئے طلب انجینئرنگ' یا قانون کی طرح ایک فن یا علم ہے۔ وہ محض ایک عہدہ نہیں ہے جو اسے ہر ممکن طریقہ سے حاصل کرنا ہے۔ وہ آخرکار علم کے ذریعہ صراحت اور صحت فکر اور مشقت کے ذریعہ پاکیزگی سے آراستہ ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ کم کوش میدان میں رہ گئے ہیں اور اب وہ آزاد ہیں کہ اپنے آپ کو امریکہ کے کسی چھوٹے شہر کا میئر بننے کے لئے پیش کریں۔ اگر اس نے کسی چھوٹے شہر کی دو مرتبہ قیادت کی ہے تو وہ کسی دوسرے درجہ کے شہر کا میئر بننے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اگر وہ دو مرتبہ کسی بڑے شہر کا میئر رہ چکا ہے تو وہ گورنری کے انتخاب کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ایک ہی ریاست کا دو مرتبہ گورنر رہ چکا ہے تو وہ صدارت کا متمنی ہو سکتا ہے۔ تربیت اس کا نامزد کرتی ہے اور ہماری یونیورسٹیاں' جو کہ امریکی زندگی کے بہترین ثمر ہیں' ہمارے منتظمین کی تربیت گاہیں بن جائیں گی۔ نظم و نسق کا تانا بانا قائم رہے گا۔ کسی ایک طبقہ کا تسلط قائم رہے گا لیکن اس

Scanned with CamScanner

تانے بانے کی بنیاد تربیت اور ذمہ داری پر ہو گی اور جمہوریت باقی رہے گی۔ انتخابات میں، رئیسیت اس میں اس طرح شامل ہو گی کہ حکومت اب بہترین لوگوں کے ہاتھوں میں ہو گی، لیکن یہ جمہوریت، نااہلیت اور بدعنوانیوں کے بغیر ہو گی اور یہ رئیسیت وراثت اور موروثی استحقاق کے بغیر ہو گی۔

یہ تجویز، ناقابل عمل اور عینی ہے اور بظاہر مجذوب کی بڑ معلوم ہوتی ہے، لیکن کونسی تجویز ایسی نہیں تھی؟ کیا الزبتھ کے عہد میں کوئی کلرک واشنگٹن اور میرابو کے متعلق پیش گوئی کر سکتا تھا؟ یا واشنگٹن کے عہد میں عورتوں کے حق رائے دہی کے متعلق کوئی پیش گوئی کی جا سکتی تھی؟ یا گرانٹ کے زمانہ میں کوئی ممانعت شراب کا تصور کر سکتا تھا؟ ہر چیز جب تک ہو نہ جائے ناممکن ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج نے سیاستدانوں کو تعلیم دی، کیا ہماری یونیورسٹیاں ایسا نہیں کر سکتیں، چین نے کئی صدیوں تک عہدے ان لوگوں تک محدود کر دیئے جنہیں تعلیم و تربیت نے ہر قدم پر آزمایا تھا لیکن جب ۱۹۱۱ء میں جمہوری خیالات نے چین پر یلغار کی تو یہ نظام ختم کر دیا گیا، اگرچہ اس میں ہر شخص کو مساوی مواقع حاصل تھے۔ ایک صدی تک جرمنی کے شہروں میں اس قدر تنظیم اور صفائی تھی کہ ان کا ثانی ملنا محال تھا۔ اس لئے کہ ان کا انتظام انہیں لوگوں کے ہاتھوں میں تھا، جنہیں انتظامی تربیت حاصل تھی۔

لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے بڑے جامعوں میں حکومت کے مدرسے ہیں یا ایسے نصاب ہیں جو ان مدرسوں کے مرکز ہیں۔ ماہرین کے خلاف عناد ختم ہو رہا ہے اور سنساٹی کی طرح کے شہر خاص طور پر تربیت یافتہ لوگوں کو اپنے نظم و نسق کے لئے متعین کرتے ہیں۔ امریکہ میں تقریباً ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ ہمارے انتخابات نہایت مضحکہ خیز ہیں اور اس مضحکہ خیز کھیل کے قائدین اس بات پر متفکر ہیں کہ ووٹروں کی نصف تعداد ووٹ نہیں دیتی۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اس بدنظمی کی حقیقت کو دیکھیں، اور بے باکانہ یہ کہیں کہ ہم اس وقت تک ووٹ نہیں دیں گے جب تک کہ ہم صحیح منتظمین کا انتخاب کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ ہماری اپنی بزدلی اور کم ہمتی ہے کہ رائے عامہ حالات سے بے خبر رہتی ہے جو آدھی قوم کو اس یقین کے باوجود خاموش رکھتی ہے کہ جمہوریت ختم ہو گئی ہے۔ آیئے ہم اپنی زبانوں کو قوت گویائی بخشیں۔

ایک قلم کار بس یہ تجویز پیش کر سکتا ہے، لیکن سوچئے کہ اثر و رسوخ والے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک سو مجلسوں کو صحیح معلومات حاصل ہوں۔ ایک سو مقرر رائے دہندگی کے لئے

Scanned with CamScanner

تعلیم و تربیت کو اہم قرار دیتے ہوں پھر دیکھئے کہ صاحب فہم و فراست کی رائے کس طرح عوام تک پہنچتی ہے' آنکھیں کھل جاتی ہیں اور تعصبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور آخرکار کہیں نہ کہیں' لوگ اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ سیاسی عہدہ کو تربیت یافتہ اصحاب کے لئے مخصوص کر دیں۔ پھر ایک شہر دوسرے کی نقل کرے گا' حتیٰ کہ سب پاک صاف ہو جائیں گے اور چور اور ناپاک روحیں' سرکاری عہدوں اور بازاروں سے غائب ہو جائیں گی۔

ہم بڑے بوڑھے اب امید کے سہارے نہیں جی سکتے۔ ہمارے دل اس طرح مجروح ہوئے ہیں کہ ہم ہر جوش و خروش اور جذبہ اصلاح کا مذاق اڑاتے ہیں' لیکن ہمارے کالجوں میں ایک نئی نسل تربیت پا رہی ہے' مزاج میں جو ہم سے کم رومانوی اور زیادہ جری بہادر اور واقف کار ہے۔ جب ان میں سے چند لاکھ جوان متحد ہو کر باہر نکلیں گے تو یقیناً ہماری اجتماعی زندگی کے معائب کا خاتمہ کر دیں گے۔

Scanned with CamScanner

ہم نے جنت الارض کیونکر بنائی

ا۔ جنت الارض کے فوائد

اسکر وائلڈ نے کہا ہے۔ "دنیا کا کوئی نقشہ جس میں "جنت الارض" کا وجود نہیں، اس قابل نہیں کہ اس کی طرف دیکھا بھی جائے، کیونکہ یہ اس سرزمین کو نظرانداز کر دیتا ہے، جہاں انسانیت ہمیشہ لنگر انداز ہوتی رہتی ہے۔ جب انسانیت وہاں پہنچتی ہے؟ تو پھر نظروں کو دور تک پھیلاتی ہے اور کوئی بہتر سرزمین دیکھ کر جہاز کا رخ اس کی طرف کرتی ہے۔ ترقی جنت الارض کے حصول کا دوسرا نام ہے۔"

کیا یہ بات سچ ہے؟ کیا جنات الارض کبھی حاصل ہوئی ہیں؟ آج کل انسان کی ترقی کا تصور مروجہ انداز فکر کے خلاف جاتا ہے۔ منشنگک کہتا ہے "تاریخ مدور انداز میں حرکت کرتی ہے۔ جو چیز بالخصوص تہذیب، عروج حاصل کرتی ہے، اسے زوال بھی ہوتا ہے، ہماری ترقی محض سطح سمندر کا ہنگامی مد و جزر ہے۔ سمندر کی تہ ہمیشہ ساکن اور غیر متحرک رہتی ہے۔ جنت الارض، محض ہمارے تخیل کی فضائی پرواز ہے جو حیات موت کی کش مکش کے اندوہ کو کم کر دیتی ہے، لیکن ایک توانا شخص ان جراحتوں کو مصنوعی مرہموں کی مدد کے بغیر برداشت کرتا ہے، اور اگر اسے نسیان کی ضرورت ہے تو وہ اپنے آپ کو آج کے معاملات اور تفاصیل میں کھو دیتا ہے اور کل کی فکر نہیں کرتا۔ جو کچھ ہوتا رہا ہے وہی ہو گا، صرف انداز بیان بدلتے رہتے ہیں۔"

ہم ناشکر گزار وحشی ہیں۔ اور اب جب کہ ایجادات نے ہم پر آسائشوں کی بوچھاڑ کر دی ہے ہم مال و دولت کے انبار میں ایک رومان پسند دوشیزہ کی طرح رہتے ہیں اور کسی دور دراز سرزمین کے خزانوں کے متمنی ہیں، جو محض اس لئے دل فریب ہیں کہ وہ دور ہیں۔ ہمارے مفکروں نے عالم گیر مدرسوں کے خواب دیکھے تھے۔ ہمارے یہاں یہ مدرسے ہیں اور ہم عالم گیر یونیورسٹیوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ کبھی انسان برہنہ تھے، اب وہ لباس پہنتے ہیں، لیکن انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ دوسے لوگ زیادہ قیمتی کپڑے پہنتے ہیں۔ کبھی انسان

بھوکے تھے اب محض خوش خوری کی وجہ سے لاکھوں موت کا شکار بنتے ہیں۔ لیکن ہم بھولے سے بھی ان آسائشوں کا شکر ادا نہیں کرتے جن کی فراوانی ہمارے لئے موت کا باعث بنتی ہے۔ شکسپیئر کے زمانہ میں بھی بڑے شہر راتوں کو تاریکی میں لپٹے ہوتے تھے اور بازار غیر محفوظ ہوتے تھے۔ آج (جب کہ بازار ابھی تک غیر محفوظ ہیں۔) رات کے خطرات کم ہو گئے ہیں اور بجلی کی برکت کی بدولت ہر جگہ نور کی بارش ہوتی ہے۔ تاہم لوگ بے کل ہیں اور گزرے ہوئے زمانہ کو یاد کرتے ہیں۔ کبھی چھ برس کے معصوم بچے اور کئی کئی بچوں کی مائیں چودہ گھنٹے روز کام کرتی تھیں اور اپنی مشینوں کے پاس رات بسر کرتی تھیں۔ آج بچوں کو مدرسوں میں بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ بڑے ہو کر دنیا پر حکمرانی کریں اور لاکھوں عورتیں ایسی بے کاری میں زندگی بسر کرتی ہیں جو ان کی بڑی بوڑھیوں کو ہرگز پسند نہ آتی، لیکن وہ کتنی خوش ہوتیں اگر انہیں ایک چیز اور نصیب ہو جاتی۔ یورپ کا سفر یا سمندر کے کنارے ایک مکان! مزدوروں کو تنظیم اور جرات کی وجہ سے بہتر مزدوری ملنے لگی ہے۔ وہ آج زیادہ قابل احترام ہیں اور زندگی کے نشیب و فراز کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ ہیں۔

لیکن افسوس! انہیں ابھی آمریت حاصل نہیں ہوئی۔ کسی زمانہ میں ہمارے سپہ سالار عالم گیر جنگ کا انتظار کیا کرتے تھے، لیکن اب انہوں نے جنگوں کو آزما لیا ہے۔ وہ اب سیاروں کی طرف دیکھتے ہیں تاکہ مشتری کے باشندوں کو اسلحہ مہیا کر سکیں۔ آج ادیب اتنے زیادہ ہیں کہ پہلے کبھی نہیں تھے۔ ایجاد، رسل و رسائل اور اشتہاروں نے کتابوں کی فروخت اس قدر عام کر دی ہے کہ بائرن اور میکالے بھی دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ اناطول فرانس، بہترین نثر لکھنے کی وجہ سے کروڑ پتی بن جاتا ہے، لیکن ان کامیاب انسانوں کے دلوں میں کس قدر درد و اندوہ موجود ہے۔ اناطول فرانس کہتا ہے! "اگر تم میرے دل کے اندر دیکھ سکو۔ تو تم ششدر رہ جاؤ گے۔ دنیا میں کوئی ذی حیات مجھ سے زیادہ مخزوں نہیں۔" اے حسین زبان کے آقا! تو نے سینکڑوں عہدوں اور سر زمینوں کے فنون اپنے گرد جمع کئے۔ تو نے ارباب حل و عقد اور انقلاب پرستوں کے دلوں کو مسحور کیا۔ تو اپنے زمانہ میں تیبلز، مونٹین، والٹیئر اور فرانس کے دوسرے شاہان ادب کا بھائی تسلیم کیا گیا۔ تیرے پاس دولت اور فرصت تھی اور تو نے کسی انسان کی کمزوری سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر تجھے بھی خوشی حاصل نہیں تھی تو وہ پھر کہاں مل سکتی ہے اور ہم کم مایہ لوگ اسے کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟

کیا وجہ ہے کہ ہماری دولت یاسیت کو جنم دیتی ہے اور ہماری تسخیر فطرت نے ہمیں

Scanned with CamScanner

سلامبو کی طرح فتح کے بعد بھی ناخوش رکھا ہے۔

جنت الارض کی تکمیل ہو چکی ہے لیکن صرف خارجی دنیا میں۔ اگر جیسا کہ بعض فلسفی سمجھتے ہیں، خارجی دنیا کی کوئی حقیقت نہیں تو کوئی ہماری بے چارگی کا اندازہ کرے۔ ہم بدلے ہیں لیکن کتنی ست رفتار سے۔ ہمارے لئے روئے زمین کو بدلنا براعظموں کو، بری بحری اور فضائی راستوں سے ملانا اور کوئلے اور فولاد کو ہزاروں آسائشوں میں تبدیل کرنا آسان تھا، لیکن اپنی روح میں سے ہولناکی، جنگجوئی اور ظلم کے جذبات کو خارج کرنا ہمارے لئے آسان نہیں، کیونکہ یہ جذبات کئی نسلوں کی کش مکش اور افلاس کے حملوں کی وجہ سے ہماری فطرت میں بس گئے ہیں۔ ہم وہی کچھ ہیں جو کچھ ہمیں مجبوریوں نے بنایا ہے، لیکن ہم اب بھی وہی کچھ ہیں، حالانکہ اب دنیا کو اس قسم کے کردار کی ضرورت نہیں۔

اس لئے ہماری بے کلی اور بے قراری جائز ہے، لیکن یہ بات کسی طرح بھی جائز نہیں کہ ہم اس سائنس کے ممنون نہ ہوں، جس کی بدولت دنیا ہمارے لئے نصف "جنت الارض" بن گئی ہے اور باقی نصب کا انحصار بھی اسی نصف جنت پر ہے۔ سائنس کے یہی انعامات، روحانی اطمینان کی اساس ہیں۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ باغ عدن میں ہماری حیثیت حیوانوں کی ہے اور ہم اس حسن کے مستحق نہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم اس بات پر آمادہ نظر آ رہے ہیں کہ اس حسن کو مکروہ صنعتوں سے برباد کر دیں۔ ہم جہاں کہیں بھی اپنا گھر بناتے ہیں، وہاں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہم حسن کو بے جا استعمال کرتے ہیں اسی طرح ہم علم کو غلط استعمال میں لاتے ہیں۔ ہم نے اپنی قوتوں میں بے طرح اضافہ کر دیا ہے لیکن ہمارے منصوبوں اور اداروں میں اب تک وہی پستی اور تنگ نظری ہے جو کبھی افلاس اور زبوں حالی کے زمانہ میں تھی۔ ہم مادی طور پر توانا اور قدآور ہوتے ہوئے بھی روحانی حیثیت سے بونے ہیں۔ جنت الارض، سوائے انسانی روح کے ہر جگہ موجود ہے۔

اس لئے یہ جنت الارض جو ہم اب تعمیر کریں گے، اس کا تعلق انسانی قوتوں کی توسیع نہیں بلکہ انسانی روح کی کشادگی سے ہے۔ ہمارے اذہان اور ہمارے عزائم کی ترمیم اور اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی بہتر دنیا میں زندگی بسر کرنے کے قابل بن سکیں جو ہمارے علم کی طرح واضح اور ہماری قوت کی طرح مستحکم ہو گی۔ چونکہ انسانی جہالت نے ہر جنت الارض کے تصور کو برباد کیا ہے اس لئے اگر ہم سب سے پہلے اپنے دلوں اور اپنے ذہنوں کو آلائشوں سے صاف کر لیں تو باقی حالات خود بخود سنبھل جائیں

گے۔

آیئے ہم اس سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جائیں۔ بچے باغ میں کھیلتے رہیں اور ہم اپنے آپ کو اپنے تخیل کے سپرد کر دیں۔

۲۔ میئر جاگتا ہے

میئر وقت سے پہلے جاگ اٹھا کیونکہ سورج کی روشنی اس کی ناک پر پڑ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ہوش میں آیا۔ وائٹ ہاؤس مدہم ہو گیا اور پھیلتی ہوئی روشنی نے اسے پوری طرح بیدار کر دیا۔ اس نے پھر سونے کی کوشش کی لیکن وہ سو نہ سکا۔ وہ سوچنے لگا۔ "اوہ خدا! میں میئر ہوں۔ میں میئر کیونکر بنا؟ میں کتنا خوش نصیب ہوں! اور اس خوش نصیبی کی راہ میں کتنے حوادث آئے؟ اگر میں ٹامی برک کو نہ جانتا .... اس کی یہ بڑی نوازش تھی کہ اس نے مجھے نامزد کیا۔ لیکن دس سال پہلے مجھے یہ بات کیوں نہیں معلوم تھی کہ میں میئر بن جاؤں گا۔ اگر مجھے علم ہوتا تو میں اس کی تیاری کرتا۔ کتنا مشکل کام ہے یہ؟ یہ کام ریلوے اسٹیشن کے انتظام یا کنبہ پالنے کے کام سے مشکل تر ہے۔ میں نے اس قسم کی تربیت حاصل نہیں کی۔ میں نے شاید زندگی میں ایک کتاب بھی نہیں پڑھی' لیکن اب میں لاکھوں انسانوں کی زندگی کا ذمہ دار ہوں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں' وہ لوگوں کو برباد یا آباد کر سکتا ہے۔ میرا عمل ان لوگوں پر بھی اثر انداز ہو گا' جن کے آباؤ اجداد بھی ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ ان کے مسائل نے مجھے بوکھلا دیا ہے۔ رسل و رسائل' مکاری مالیات۔ مکاری' منڈیاں مکاری' عمارت سازی مکاری' صفائی' مکاری' صحت عامہ مکاری۔ تعلیم مکاری ------ اوہ' یہ کام میرے لئے بہت مشکل ہے۔ یہ تو سینکڑوں آدمیوں کا کام ہے' میں تنہا اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔"

دن زیادہ روشن ہو گیا۔ میئر نے انگڑائی لی اور بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے پاؤں کو سہلانے لگا۔ یکایک اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔

"آہا' مجھے یہی کچھ کرنا چاہئے۔ یہ اقدام سیاستدانوں کو متحیر کر دے گا۔ یہ کام پہلے کبھی نہیں ہوا۔ میں' یونیورسٹیوں سے بہترین سائنس دانوں' بنکوں سے بہترین مہاجنوں' مدرسوں سے بہترین مدرسوں' کلبوں سے بہترین عورتوں' معملوں سے بہترین موجدوں' بہترین منتظموں اور مزدوروں کے بہترین قائدوں کو بلاؤں گا اور ان سے یہ التجا کروں گا کہ وہ میری امداد کریں۔"

Scanned with CamScanner

"اوخدا' میں سیاست دانوں سے تنگ آگیا ہوں- وہ کوئی کام نہیں کرنا چاہتے' صرف چیزیں حاصل کرنا چاہتے ہیں- وہ صرف مشاہرہ چاہتے ہیں- ہر عہدہ کے لئے ان میں سے دس امیدوار موجود ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اس کام کے متعلق کچھ نہیں جانتا- میں ان سے تنگ آگیا ہوں-"

میئر بستر سے باہر نکل آیا اور کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر تازہ ہوا میں سانس لینے لگا-

"ہمارے شہر میں کئی بڑے آدمی ہیں- میں نے سنا ہے کہ سامنے پہاڑی پر کچھ سائنس دان رہتے ہیں' جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں- دنیا کے بعض بڑے تجارتی اداروں کے ڈائریکٹر بھی یہاں رہتے ہیں- یہاں ایک شخص نظم و نسق کے فن سے بھی واقف ہے- ہم اس کی قابلیت سے کیوں فائدہ حاصل نہ کریں؟ میں انہیں اعلیٰ عہدوں کی لالچ بھی نہیں دلا سکتا اور تنخواہیں اتنی کم ہیں کہ میں انہیں ان عہدوں پر مامور بھی نہیں کر سکتا' لیکن اگر میں ان سے کہوں ! حضرات ! مجھے آپ کی مدد چاہئے کیا آپ سب مل کر میری رہنمائی کے لئے ایک مجلس مشاورت نہیں بنا سکتے؟ میرا خیال ہے وہ ضرور اپنا کچھ وقت مجھے دیں گے- مجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ میں شہری تعمیر کی ایک کمیٹی قائم کر لوں ......"

میئر نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر خدا سے دعا مانگی

"اے خدا' مجھے ہمت عطا کر!"

۳- وہ عظیم مجلس مشاورت

اس عظیم مجلس مشاورت کی تشکیل کی خبر شہر میں "آناً فاناً" پھیل گئی- افسر اپنے مستقبل کے متعلق خوفزدہ ہو گئے' لیکن دوسرے سب لوگ خوش ہوئے- سیاسی حلقے نے بھی بظاہر خوشی کا اظہار کیا' لیکن انہوں نے خفیہ طور پر یہ بات میئر کے گوش گزار کر دی کہ اگر یہ منصوبہ کسی طرح بھی جماعت کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں-

مجلس کا اجلاس' یونیورسٹی کے ہال میں منعقد ہوا- اخباری نمائندوں نے بھی کافی تعداد میں اس میں شرکت کی لیکن عوام سے یہ التجا کی گئی کہ وہ اس میں شریک نہ ہوں- مجلس پچاس ارکان پر مشتمل تھی' جو مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے تھے' لیکن ان میں سے ہر شخص اپنے شعبہ میں ممتاز اور سربرآوردہ تھا- اس مجلس میں صرف تاجر' جائداد فروش'

Scanned with CamScanner

سیاستدان، ادیب اور فلفی شامل نہیں تھے۔

میئر نے انتہائی انکسار کے ساتھ ان سے یوں خطاب کیا!

"خواتین و حضرات! آپ کو یہاں جمع ہونے کی زحمت دی گئی ہے کیونکہ ہمارا شہراب اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اس کا نظم و نسق ایک آدمی کے بس کی بات نہیں رہی۔ وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ کئی سیاست دان مل کر بھی اس کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اب ہمیں اقتصادیات اور نظم و نسق کے ماہرین کی ضرورت ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے شہر اپنی عظیم شخصیتوں سے مستفیض ہوں۔

"ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ ہمارے مسائل کا بغور مطالعہ کیجئے اور اپنی تجاویز پر کڑی تنقید کیجئے۔ انہیں انسانی فطرت اور ہمارے شہر کی مالیات کی حدود کے اندر رکھئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی ہر اس تجویز کی پوری حمایت کروں گا، جسے آپ کی یا عوام کی بڑی اکثریت کی حمایت حاصل ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کسی شدید مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ شہری اصلاح کا معاملہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں اور اس سے کسی جماعت کے حقوق پر اثر نہیں پڑتا۔ ہم سب انتشار میں مبتلا ہیں اور ہمیں مل کر اس میں ربط پیدا کرنا ہے۔ یہ شہر آپ کا ہے، آپ ہی اس کی اصلاح کیجئے۔"

اس موقع پر اخباروں نے اس مجلس کی حمایت کی۔ اس مہم کی تضحیک بہت آسان تھی۔ ان بزدل اور بے پروا سائنس دانوں کا مذاق اڑانا اور یہ پیشگوئی کرنا کہ اس مجلس کی تشکیل سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور یہ بتانا کہ یہ (بزعم خود) نیک لوگ اپنا اخلاق تن آسانوں پر عائد کرنا چاہتے ہیں، بہت سہل تھا۔ لیکن میئر نے شہر کے ہر اہم اخبار کے مالک یا مدیر کو بھی مجلس میں شامل کر لیا تھا۔ یہ نہایت معقول اقدام تھا۔ اس عزت افزائی کی وجہ سے اخباروں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اس موقع پر اخباروں نے وہ کام کیا جس کی عوام ہمیشہ ان سے توقع رکھتے تھے، یعنی یہ کہ وہ عوام کی تربیت کریں گے۔ انہوں نے اپنے بہترین نامہ نگاروں کو اس مجلس کی روئداد مرتب کرنے پر مامور کیا اور اپنے اداریوں میں اس عظیم مہم کی جی کھول کر حمایت کی۔

کچھ لوگوں نے اس مجلس کا مذاق اڑایا۔ عوام نے اس کی طرف سے بے نیازی کا اظہار کیا، لیکن مجلس کے ایک ہفتے کے اجلاس کے بعد جو تجاویز پیش کی گئیں، لوگ ان پر سخت برہم ہوئے۔ مجلس کے ماہرین حیاتیات نے یہ کہا کہ تولید پر پابندیاں لگانی چاہئیں صرف وہی لوگ بچے پیدا کرنے کے حقدار ہیں جو ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہیں۔

Scanned with CamScanner

سارے شہر میں اس تجویز کے خلاف پرزور احتجاج ہوا۔ یہ کون سے ماہرین ہیں جو ہمیں یہ بتانے آئے ہیں کہ ولدیت ہر شخص کا حق نہیں ہے۔ اگر اخبار اس تجویز کی حمایت نہ کرتے، تو بڑا ہنگامہ برپا ہوتا۔ تجویز کے الفاظ یہ تھے :

"مجلس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ تعیر نو کا آغاز، نسل کی جسمانی صلاحیتوں کی اصلاح سے ہوتا ہے۔ ہم جب تک صحت مند لوگوں کو بچے پیدا کرنے کی اور غیر صحت مند لوگوں کو تولید سے پرہیز کرنے کی ترغیب نہیں دیں گے ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔

"لیکن اس معاملہ میں کسی امتناعی آئین سازی کی ضرورت نہیں۔ ہم محض ہر ذہین مرد اور عورت کے سامنے یہ تجویز پیش کر رہے ہیں۔ ہم قانون کی پابندیاں عائد کرنے کی بجائے محض ان کی نیک نیتی پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ہم صرف اپنے آپ پر جبر کریں گے۔

"اس لئے ہم، اس مجلس کے ارکان یہ عہد کرتے ہیں اور (ان کی رضامندی سے) اپنے بچوں کی طرف سے بھی یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کی اجازت کے بغیر بچے پیدا نہیں کریں گے۔ ہم افراد اور جماعتوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی اس اصول کو علی الاعلان تسلیم کر لیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ذہین لوگ سب سے پہلے اسے قبول کریں گے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ان کی قائم کی ہوئی مثال سے دوسرے لوگ متاثر ہوں گے۔

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ غیر صحت مند لوگوں کو شادی کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، لیکن انہیں طبی مشورہ سے ضبط تولید پر عمل کرنا چاہئے۔"

"ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اس اصول سے مطابقت زیادہ عام ہو جائے گی اگر اس پر عمل کرنے والوں کا، حادثات، بیماری، بے کاری، بڑھاپے اور موت کے خلاف بیم کروا دیا جائے اور سب ماؤں کو پرورش کے اخراجات بہم پہنچائے جائیں۔ ہم نیکی کی ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں، برائی کی ممانعت نہیں۔

"آخر میں ہم اخباروں، مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے یہ التجا کرتے ہیں کہ وہ اس موضوع کے بارے میں معلومات کو عام کریں اور ہر شخص پر یہ واضح کر دیں، کہ ہر نسل کی ذہنی اور جسمانی صحت ہی پر ہماری ترقی کا دارومدار ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہر شخص کے جذبہ وطن پرستی کو جوش میں لائیں کہ یہ ضبط نفس، ہمارے شہر کی تعمیر کی راہ میں پہلا قدم ہے۔"

اس تجویز کے آخر میں مجلس کے سب ارکان کے دستخط تھے، سوائے ایک کے۔

Scanned with CamScanner

اس اعلان سے زیادہ منشکک مزاج کے نکتہ چینوں کی رنگ پھڑکی۔ کچھ نکتہ چینوں نے لوگوں کی سادہ دل رجائیت کا مذاق اڑایا، کہ توسیع نظم سے شہر کی تعمیر نو کی جا سکے گی۔ ایک نقاد نے فریڈرک اعظم کی وہ بات دہرائی جو اس نے اپنے اس وزیر تعلیم سے کہی تھی جو عالم گیر تعلیم سے انسانیت کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ "میرے عزیز زولنر، تم اس ذلیل نسل کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے جتنی اچھی طرح میں جانتا ہوں۔" لیکن بہت سے لوگ اس نئے تصور حکومت سے خوش ہوئے کہ جبری حکومت کی جگہ تعلیم لے لی گی اور بدی کی ممانعت کی بجائے اب زور صحت مند اقدام پر ہو گا۔

اور پھر منظوری کے عہد و پیمان آنے شروع ہوئے۔ شہر کے طبیبوں نے ایک خاص اجلاس بلایا اور متفقہ طور پر اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے پروفیسروں نے اور اسکول مدرسوں نے اسے منظور کیا۔ اخباروں کے کارندوں، صنعتی کیمیا کے ماہروں اور ماہرین موسیقی نے بھی اس کی منظوری دی۔ اس کے بعد اسکولوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل طلبا نے اسناد لیتے وقت اسے برضا و رغبت قبول کیا۔ آہستہ آہستہ رائے عامہ کی اکثریت نے اسے شہریت کے اعلان میں شامل کر لیا۔ پہلی مہم کامیاب رہی۔

۴۔ تعلیم کے ذریعہ حکومت

ایک ہفتہ کے بعد دوسری تجویز مجلس کے تعلیمی شعبے نے پیش کی، جو اخباروں میں شائع ہوئی۔ تجویز یہ تھی۔

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ حکومت کے بنیادی فرائض، عوام کی صحت کی نگہداشت کرنا اور بچوں اور بالغوں کو پوری تعلیم دینا ہیں۔ ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ شہر کے خرچ سے ہسپتال قائم کئے جائیں، جہاں ہر مرض کا علاج مفت اور مکمل طریقے پر ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے مدرسوں میں جسمانی تربیت کو بھی وہی مقام ملنا چاہئے جو ذہنی تربیت کو حاصل ہے۔ ہمارا خیال یہ بھی ہے کہ صحت اقوام، دولت اقوام سے زیادہ اہم ہے اور یہ کہ خوشی کا راز صحت میں مضمر ہے۔ ہم ہر صحت مند کھیل کی تربیت اور صفائی کے فن کی ہمت افزائی کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ کھیلوں کے تماشائی بننے کے رجحان کی ہمت افزائی نہ کی جائے اور کھیل میں ہر شخص کو شریک کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ تعلیم پر مسرفانہ اخراجات کرنا ہمارے شہر کا امتیاز بن جائے۔

Scanned with CamScanner

ہم یہ چاہتے ہیں کہ سب مدرسوں کے مشاہرے بڑھا دیئے جائیں تاکہ معلم اعلیٰ مرتبہ کے لوگوں کے ہم پلہ بن جائیں۔ ہم یہ تجویز کرتے ہیں 'کہ تمام نادار طلبا کو وظیفے دینے چاہئیں' تاکہ شہر اپنے جوانوں کی ممکن صلاحیتوں سے مستفید ہو سکے۔ ہمارا خیال یہ بھی ہے کہ سائنسی تحقیقات کو مالی امداد ملنی چاہئے تاکہ ایجادات کی فراوانی سے میکانکی طاقت میں اضافہ ہو اور انسان کی غلامی کا جلد از جلد خاتمہ ہو سکے۔

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ مدرسوں کے نصاب سے جنگ کے متعلق تمام تعریفی کلمات ختم کر دیئے جائیں۔ ہمارے لوگوں کو اس بات کا پورا موقع ملنا چاہئے کہ وہ اپنے فطری رجحانات امن کی نشوونما کریں اور دفاع کے تمام لازمی اقدامات کی حمایت اور سرپرستی کریں۔

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہم نجی مدرسوں کی ہمت افزائی کریں اور تجربات تعلیم میں دل چسپی لیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قوم کا کردار' قول' اخبار' اجتماع اور عبادت کی آزادی سے بنتا ہے۔ شہر کے اچھے نظم و نسق کے ساتھ ہمیں ذہن کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہئے۔

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ مدرسہ کو اجتماع کا ذہنی مرکز بنا دینا چاہئے' جو صبح و شام کھلا رہے' تاکہ لوگ اس سے جسمانی اور ذہنی استفادہ کر سکیں۔"

"ہم سمجھتے ہیں کہ مدرسوں کو اخلاق کی تعمیر کی ذمہ داری' اپنے اوپر لینی چاہئے تاکہ دوسری اخلاقی قوتوں کے انحطاط سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے مدرسہ اسے پورا کر سکے' اور یہ کہ کوئی تعلیم مکمل نہیں سمجھی جا سکتی جب تک کہ وہ فرد کی شخصی آرزوؤں اور اجتماعی ذمہ داریوں میں مطابقت نہ پیدا کرے اور اس میں یہ میلان نہ پیدا کر دے کہ وہ اپنے کردار کو اجتماعی بہبود کے مطابق بنائے۔

"ہم اپنے اخباروں کے مالکوں اور مدیروں کے سامنے تجویز پیش کرتے ہیں کہ اخباروں کو تعلیم کا ایک مؤثر وسیلہ بنائیں۔ ہم امیر طبقہ کے فیاض لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ مالی امداد دے کر اخباروں کے ذریعہ' سائنس' تاریخ' ادب اور فن کی تعلیم کو عام کر دیں گے۔

"آخر میں ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہر شعبہ میں تعلیم بالغان کو عام کیا جائے اور یہ کہ مدرسوں اور کالجوں کے فارغ التحصیل لوگوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ان کی اسناد' ان کی شخصیت کے نشوونما میں محض ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں' اور یہ کہ تعلیم محض ایک فریضہ اور تیاری نہیں بلکہ انسانیت کی ثقافتی میراث کے ساتھ خوشگوار بے تکلفی پیدا

کرنے کا دوسرا نام ہے۔"

ان تجاویز پر سوائے دو کے سب ارکان نے دستخط کیے۔

ٹیکس ادا کرنے والوں کے علاوہ ہر شخص نے ان تجاویز کا خیرمقدم کیا۔ طبیب اس بات پر خوش ہوئے کہ مجلس نے صحت کی اہمیت پر زور دیا۔ اور لوگوں نے اس خبر کا خیرمقدم کیا کہ اب ہسپتال غریبوں کی چیرپھاڑ کا معمل نہیں رہیں گے' مدرس اعلیٰ تنخواہیں حاصل کرنے کے خیال سے خوش ہوئے اور ہر معلم کے کنبہ نے اپنی آمدنی کے اضافہ سے اخراجات میں اضافہ کر دیا۔ ان گنت ہونہار جوانوں نے' جو افلاس کو اپنی عظمت کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے' سرکاری وظیفوں کی تجویز کا خیرمقدم کیا۔ اخباروں نے اپنے اعلیٰ منصب کو پسند کیا اور لڑکے اور لڑکیاں جنت الارض کی کھلی تفریح گاہوں کے تصور سے مسرور ہونے لگیں۔

لیکن اہل جائداد کی ایسوسی ایشن کے صدر' ٹیوڈر بلیک' نے ایک احتجاج شائع کیا' جسے ہر اہل جائداد نے پسند کیا۔ اس نے لکھا:

"یہ واضح ہے کہ میٹر کی اصلاحی مجلس نے اس غیر ضروری اعلان کے بعد کہ وہ ساری نسل انسانی کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں' اب سادہ لوح عینیت پسندوں کا شکار بننا منظور کیا ہے۔ ہم نے یہ توقع کی تھی کہ یہ مجلس اپنی تجاویز کو عقل و دانش کی حدود کے اندر رکھے گی' لیکن ہمیں اب اندازہ ہوا کہ سب اقدامات محض ایک نئی جنت الارض تعمیر کرنے کا پیش خیمہ تھے۔

"یہ منصوبہ کہ ہم سب مزدوروں کو پی ایچ ڈی بنا دیں' کسی فلسفی معلم کا منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر بالغ ذہن یہ جانتا ہے کہ ہماری اقتصادی دنیا میں صرف چند عہدے ایسے ہوتے ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے کالج ہمارے مناصب کی تعداد سے زیادہ گریجویٹ پیدا کر رہے ہیں۔ ملک میں گریجوایٹوں کی بھرمار کا نتیجہ یہ ہو گا کہ گریجویٹ صنعت کے ساتھ زندگی کو سازگار نہ پا کر اپنی ذاتی بے کلی کو انقلابی ہیجان میں تبدیل کر دیں گے' کوئی ہوش مند انسان ان کی تعداد میں اضافہ کرنے کی تجویز نہیں کرے گا اور ہر تجربہ کار مدرس اس تعداد میں کمی کرنے کے وسیلے سوچے گا۔

ہماری مجلس کی تجاویز' جدید عہد کی اس پالیسی کے عین مطابق ہیں کہ نوجوانوں کو خوش رکھو۔ ہر شخص آج کل کے جوانوں کے گناہوں کی تعریف کرتا ہے اور ان کی خودپسندی انقلاب پرستی' اسراف اور بداخلاقی کو نظرانداز کرتا ہے۔ والدین اپنے بیٹوں اور

بیٹیوں کے لئے جائداد چھوڑتے ہیں اور بچے ساری جائداد تعیش میں ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ کالج، جہاں ہم اپنی اولاد کو بھیجتے ہیں محض ورزش کے اکھاڑے اور بے یقینی کے مدرسے ہیں۔ ہمارے جوان دہریوں کو مفت اعلیٰ تعلیم دینا اور ان کے لئے تالاب اور کتب خانے تعمیر کرنا ایک مضحکہ خیز تجویز ہے۔

کیا کوئی ہمیں یہ بتائے گا کہ اس منصوبہ کے اخراجات کون برداشت کرے گا؟ پہلے ہی مدرسوں اور کالجوں کے اخراجات یوں ہی اہل جائداد پر گراں ہیں۔ اگر یہ تجاویز کامیاب ہو گئیں تو ٹیکس کیا ہو گا؟ ہر اہل جائداد کو یہ دیکھنا چاہئے کہ جب قومی حکومت نے اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ یوں لے لیا اور شہر نے باغیوں کی فصل کھڑی کرنے کے لئے اس پر ٹیکس عائد کئے تو اس کے پاس باقی کیا رہ جائے گا۔

ہم میئر سے یہ التجا کرتے ہیں کہ وہ اس مضحکہ خیز ہنگامہ کو ختم کرے اور مجلس سے یہ کہے کہ وہ اپنی تجاویز کے لئے مالی امداد خود مہیا کرے۔

آپ کا مخلص

'ٹیوڈربلیک'

۵۔ لکھ پتیوں کی اشتراکیت

اس خط سے شہر کے لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور یہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔ جب مجلس نے نکتہ چینوں کی نکتہ چینی کو نظرانداز کر کے اپنی تیسری رپورٹ تیار کی تو اخلاق بہت بڑھ گیا۔ یہ افواہ پھیل گئی۔ کہ رپورٹ نے مجلس کے اندر انتشار اور نفاق پیدا کر دیا ہے۔ اور لوگوں نے یہ دیکھا کہ پچاس میں سے سات ارکان نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ رپورٹ یہ تھی۔

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ شہر کے منتظمین شہر کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی خوراک کی نگہداشت کریں گے اور اخباروں کے تعاون سے وہ ہر ہفتہ معینہ قیمتوں کی فہرست شائع کریں گے اور وہ لوازمات زندگی کی غیر ضروری تصنیع کی مخالفت کریں گے۔

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ شہر رفاہ عامہ کو اپنے ہاتھوں میں لے لے، اور اپنے ہائیڈرو الیکٹرک کے کارخانے خود بنائے اور ریاستی کارخانوں کی تعمیر میں مدد کرے۔ اس طرح بجلی منافع کے بغیر فروخت ہو سکے گی اور شہر دھوئیں سے پاک ہو جائے گا اور ساری صنعت صحت مند اور پاکیزہ ہو جائے گی۔

Scanned with CamScanner

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ شہر کے رسل و رسائل شہر کی ملکیت بن جائیں۔ کرایہ میں اضافہ یا تخفیف محض خرچ کے مطابق ہونا چاہئے اور ان آسائشوں کی نشوونما اس خیال سے ہونی چاہئے کہ انسان اژدھام سے بچے اور آبادی دیہات میں پھیل جائے۔

"ہم اجارہ دار کمپنیوں کی ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں' لیکن ان کے اسالیب کار کی نگہداشت ہونی چاہئے اور ان کے منافع پر پابندیاں عائد کرنی چاہئیں' تاکہ شہر کے لوگوں کے لئے معمولی کرایہ پر مکان بنیں اور اس طرح گھریلو زندگی شاداب ہو اور وہ ایک بار پھر اخلاق اور اجتماعی نظام کا سرچشمہ بن جائے۔

"ہم ان فیاض امرا کے ممنون ہیں' جن کی بدولت ہمارے بڑے عجائب خانے اور اسباب موسیقی ممکن ہوئے۔ ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ یہ انعام ہر طبقہ کے لوگوں تک پہنچائیں گے۔ ہم موجودہ کام کی ترقی چاہتے ہیں تاکہ فنون کا ادراک اور شعور پیدا ہو تاکہ اعلیٰ ذوق' ذہنی عظمت کا محرک ہے اور احساس حسن ہمارے شہر کو سربلندی عطا کرے۔"

تیسری تجویز کے سلسلے میں لوگوں نے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بعض لوگوں نے اسے دھیمی تعریف یا ہلکے استہزا سے ٹھکرا دیا۔ چونکہ اس کی تجاویز سارے معاشرے کے لئے مفید تھیں' ان سے کسی ایک محدود جماعت کو زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید نہیں تھی' اس لئے کسی خاص گروہ نے ان کی حمایت نہیں کی اور وہ توجہ جو پہلی غیر معمولی تجاویز کو نصیب ہوئی تھی کسی اور تجویز کو نہ مل سکی۔ لوگ رسل و رسائل اور گیس کے بارے میں کسی جذبہ یا جوش و خروش کا اظہار نہ کر سکے اور جس طرح کسی گھر کا جلنا کسی گھر کی تعمیر سے زیادہ جاذب توجہ ہوتا ہے' اسی طرح جب مجلس نے اپنی تجاویز کی تفصیلات کی وضاحت کی تو لوگوں کی دلچسپی ختم ہو گئی اور جہاں شہر کی خامیوں اور خرابیوں کے بارے میں لوگوں میں اتفاق تھا' وہاں انہیں دور کرنے کے لئے لوگوں کے پاس ہزاروں منصوبے تھے اور کوئی ایک تجویز ایک معمولی اقلیت کے علاوہ کسی اور کو پسند ہی نہیں آتی تھی۔

وہ تھوک فروش جو شہر کے تجاروں کے ہاتھ وہ اشیاء فروخت کرتے تھے' جنہیں انہوں نے سمندر میں نہیں ڈبویا تھا' دونوں جماعتوں کے قائدین پر یہ دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ مجلس کو چھوڑ دیں۔ گیس اور بجلی کی کمپنیوں نے اس شورش میں کم حصہ لیا' کیونکہ ان کا اعمال نامہ شرمناک حرکات سے کم سیاہ تھا۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ اگر انہیں قیمتیں مقرر کرنے کی اجازت ہو گی تو وہ خوشی سے گیس اور بجلی شہر کی میونسپلٹی کے ہاتھ فروخت کر دیا کریں گے۔ بعض نقل و حمل کی کمپنیوں نے کمیٹی کی تجاویز کے سیاق و سباق کو نظر انداز

Scanned with CamScanner

کرتے ہوئے اس کی تاویل یہ کہہ کر کی کہ وہ "کرایوں میں اضافہ" چاہتے ہیں اور بہت سے لوگ یہ بات پڑھ کر مجلس کے سخت خلاف ہو گئے۔ سرمایہ داروں نے اس تجویز کے خلاف شدید احتجاج کیا کہ کمیٹی منافع پر پابندیاں عائد کرے۔ غیر شادی شدہ لوگوں نے تبلیغ تولید کا مذاق اڑایا۔ اس تمام بحث و تمحیص کا لب لباب یہ تھا کہ "ان خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟"

۶۔ "جنت الارض" کے لئے سرمایہ

تشکیل کے کوئی ایک مہینہ کے بعد مجلس نے اپنی چوتھی اور آخری رپورٹ شائع کی اور جلسہ نامعلوم مدت کے لئے ملتوی کر دیا۔ شہر کے لوگ متحیر تھے کہ اس رپورٹ پر بھی پہلی رپورٹ کی طرح، سوائے ایک کے سب ارکان کے دستخط ثبت تھے۔ رپورٹ یہ تھی۔

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ جمہوریت کو زیادہ آزاد اور پابند کر دینا چاہئے، تاکہ ہر شخص کو یہ موقع حاصل ہو کہ وہ اپنے آپ کو اعلیٰ عہدہ کے قابل بنائے اور اعلیٰ عہدے صرف انہیں لوگوں کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں جو ان کے اہل بن چکے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سیاسی نظم و نسق کے مدرسے قائم کیے جائیں اور ان میں ہر شخص، خواہ وہ گریجویٹ نہ بھی ہو، امتحان داخلہ پاس کرنے کے بعد داخل ہو سکے۔ ان مدرسوں میں تعلیم اتنی ہی جامع اور قابل عمل ہو، جتنی کہ طب کے مدرسوں میں ہوتی ہے۔ ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہماری سیاسی جماعتیں اپنے نمائندے ان مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبا سے منتخب کیا کریں۔ اور یہ کہ وہ اپنی نامزدگی صرف ان مردوں اور عورتوں کے لئے مخصوص کر دیں، جو ان مدرسوں کے گریجوٹ ہوں اور جنہوں نے کسی ادنیٰ حیثیت میں دو سال کام کیا ہو۔ ہم شہری تحقیق کے شعبہ کی امداد کرنے کو تیار ہیں تاکہ اس کی کاروائی ہر جگہ شہری حکومت کے جدید اسالیب کے مطالعہ اور شہر کے ہر افسر کے اعمال کے تجزیہ تک پھیلائی جا سکے۔

"اس رپورٹ اور اس سے پہلی رپورٹوں کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ ہم اس ضمن میں یہ تجویز پیش کرتے ہیں، کہ ناکاشتہ زمین، سامان تعیش، ایک خاص قیمت سے زیادہ کے تحفے اور تمام سامان تفریح پر (جو عوام کی جسمانی اور ذہنی نشوونما میں ممد و معاون نہیں ہوتے) ٹیکس لگا دیا جائے۔ مزید برآں بلدیہ کو طویل مدت کے لئے اقرار نامے جاری کرنے چاہئیں تاکہ وہ نسلیں جو ان آسائشوں سے مستفیض ہوں گی اس استفادہ کی کچھ قیمت ادا کریں۔

Scanned with CamScanner

"یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ مالیہ کا یہ وسیلہ ناکافی ہو گا ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ جو لوگ اسے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' ایک تعمیری فنڈ میں چندہ ادا کیا کریں' جس کا انصرام ملک غیر سیاسی ادارہ کے ہاتھ میں ہو گا۔ ہم اس ضمن میں اخباروں کی امداد چاہتے ہیں کہ وہ اس فنڈ کو ہماری دولت کے مطابق متمول کر دیں گے اور ہم قابل اور دولت مند اصحاب کے جذبہ حب الوطنی اور دور اندیشی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہماری معاونت کریں گے۔ ان کی امداد کے بغیر تعمیر رکے گی تو نہیں' لیکن اس کی رفتار ست ہو جائے گی۔ ان کی امداد کے ساتھ تعمیر ایک ہی نسل میں مکمل ہو سکتی ہے اور ہمارے شہر کی عظمت کو اس مقام پر پہنچا سکتی ہے' کہ وہ ایتھنز' فلورنس اور روما کی عظمت کا حریف بن جائے۔

"اس ضمن میں ہم' اس مجلس کے ارکان' یہ عہد کرتے ہیں کہ اپنی کل آمدنی کا پانچواں حصہ' اگلے پانچ سال تک اس فنڈ میں دیتے رہیں گے۔"

۷۔ لیکن در حقیقت

اس آخری فقرہ کے اثر کو کون دور کر سکتا ہے؟

اس کی بدولت' عوام کی وہ توجہ اور امداد جس سے مجلس محروم ہو گئی تھی' اسے پھر حاصل ہو گئی۔ اور چونکہ شہر میں بے کار زمین کی مقدار زیادہ نہیں تھی' ٹیوڈربلیک بھی حیران رہ گیا۔ "ہماری ساری آمدنی کا پانچواں حصہ۔" یہ عظیم الشان فیاضی ہے' کیونکہ مجلس کے ارکان میں سے بعض اصحاب ملک کے متمول ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور اشتراکی ارکان بھی بہت مال دار تھے۔ یقیناً مثالی ریاست اب دور نہیں ہے۔

ان ہمت افزا حالات میں وہ لوگ جو ابتدا ہی سے مجلس کے خیر خواہ تھے' اب زیادہ جرات سے اس کی حمایت کرنے لگے' انہوں نے یہ امر واضح کیا کہ یہ تجویزیں نہایت محتاط اور موزوں ہیں اور یہ کہ سوائے ایک دو ارکان کے' تمام رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں نے ان پر دستخط کئے ہیں۔ اخباروں نے چاروں رپورٹیں یکجا کر کے شائع کیں تاکہ لوگ اس روشن اور صحت مند اجتماع کا مجموعی طور پر تصور کر سکیں' جس کی تخلیق کا بیڑا اس مجلس نے اٹھایا تھا۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ مثالی ریاست محض آسائشیں اور تعیش کے کل پرزوں پر مشتمل نہیں تھی' بلکہ اس کا بنیادی مقصد عوام کی جسمانی' ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا تھا۔ ان اقدامات اور مساعی کے ذریعہ جو نسل پیدا ہو گی' وہ اپنے لئے خود آسائشیں تخلیق کرے گی اور کل پرزوں کا غلام بنے بغیر انہیں استعمال میں لا سکے

گی۔

اور اخباروں کی اعانت کے ساتھ تعمیری فنڈ سرعت سے بڑھنے لگا۔ بہت سے افراد اور کنبوں نے اس شرط پر اپنی آمدنی کا پانچواں حصہ اس کی نذر کر دینا منظور کیا' کہ بلدیہ ان تجاویز کو قبول کرے۔ مجلس کے ایک رکن نے خاموشی سے پانچ کروڑ ڈالر اس فنڈ کو عطا کر دیئے' جو اس نے ایک تعلیمی فنڈ کے لئے جمع کئے تھے۔ عورتوں نے اپنے زیورات دیئے۔ مرتے ہوئے لوگوں نے اپنا ترکہ دیا اور مختلف اداروں نے اپنے ارکان کے چندوں سے معقول رقوم اکٹھی کیں۔ مجلس کے التوا کے دو مہینے بعد اس فنڈ میں دس کروڑ ڈالر جمع ہو چکے تھے۔

اب معاملہ بلدیہ کے اراکین کے ہاتھوں میں تھا۔ جس دن میئر کو یہ تجاویز پیش کرنی تھیں' سب اراکین حاضر تھے اور تماشائیوں کی گیلری بھی بھری ہوئی تھی۔ تماشائیوں کے چہرے مسرت اور شادمانی سے فروزاں تھے۔ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ آج عہد زر سے عہد زریں تک پہنچنے کی مہم کی پہلی ڈرامائی منزل کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ میئر نے یہ رپورٹیں پڑھ کر سنائیں اور یہ وضاحت کی کہ یہ تجاویز علیحدہ علیحدہ پیش کی جائیں گی۔ اس نے اراکین سے یہ پرزور اپیل کی کہ وہ انہیں منظور کر لیں۔ "مجھے یہ امید ہے" اس نے کہا "کہ اگر یہ تجویزیں کامیاب ہو گئیں تو مستقبل ہمارے عہد کو ایک حسین یادگار کی حیثیت سے محفوظ رکھے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ میرے عہد کے خاتمہ سے پہلے ان تجاویز پر عملدر آمد شروع کر دیں۔"

جب میئر نے اپنی تقریر ختم کی تو ایک رکن نے ان تجاویز کے خلاف ایک تقریر کی' اس نے کہا:

"جناب والا' میں ان تجاویز کو اشتراکیت کے آگے ہتھیار ڈالنے کے مترادف سمجھتا ہوں۔ ہمارے قائدین صنعت کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے اشتمالی شیخ چلیوں کے ہر طفلانہ منصوبہ کو منظور کر لیا ہے۔ ان تجاویز کے پس پردہ مجھے ماسکو کے سرخ ہاتھ کام کرتے نظر آ رہے ہیں میں ان تجاویز کی اس لئے مخالفت کروں گا کہ میں اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں اور کسی خارجی طاقت کے غلبہ کو کسی حالت میں منظور کرنے پر آمادہ نہیں ہوں"

تماشائی ہنسے' لیکن بلدیہ کے اراکین نے اس تقریر کو باصد متانت سنا۔ ان میں سے ایک نے اس خیال کی تضحیک کی کہ یہ تجاویز اشتراکی نوعیت کی ہیں' لیکن تیسرے مقرر نے اپنی خطابت کے زور سے مباحثہ کا رنگ بدل دیا۔ وہ ایک خوفناک شکل کا بڈھا معمار تھا'

Scanned with CamScanner

جس نے مزدور انجمنوں کے ذریعہ بلدیہ تک رسائی حاصل کی تھی۔ اس نے جذباتی گھن گرج کے ساتھ کہا:

"حضرات، یہ تجاویز محض روس کے آگے سر تسلیم ختم کر دینے کے مترادف نہیں، بلکہ بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے برابر ہیں۔ یہ مجلس کیا ہے؟ امیروں کا ایک کلب! ان کی یہ پیش کش کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک قلیل حصہ دینے کو تیار ہیں دراصل سارے شہر کو اپنے قبضہ قدرت میں لینے کا ایک بہانہ ہے۔ ان کے اس فنڈ کا اس کے علاوہ اور کیا مقصد ہے کہ وہ (ہم نہیں وہ) اپنے حسب منشا ہمارے شہر کو تبدیل کر دیں؟ سامان نقل و حمل کو خریدنا، محض ایک بہانہ ہے کرائے بڑھانے کا۔

اور یہ بھی دیکھئے، حضرات! کہ کمیٹی کے اراکین نے جنگ کے تقدس پر حملہ کیا ہے۔ یہ دریدہ دہنی کی انتہا ہے کہ یہ لوگ اس بات کے متمنی ہیں کہ ہم ان بہادر سپوتوں اور عظیم الشان جرنیلوں کی مدح و ستائش میں ایک لفظ نہ کہیں، جنہوں نے ہمارے لئے آزادی کی جنگیں لڑیں، ملک کو محفوظ بنایا اور دنیا میں حمیت کا علم بلند کیا۔

"اور ان تمام تجاویز میں مذہب غائب ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ مذہب سرے سے غائب ہے۔ اس کے برعکس یہ فتنہ پرور اشارہ موجود ہے کہ مذہب نے اپنا اخلاقی اثر کھو دیا ہے اور مدرسوں کی یہ نوجوان استانیاں اخلاقیات کو مذہب کی جگہ دیں گی۔ اخلاقیات! آپ نے دیکھا؟ اخلاقیات! اخلاقیات آخر ہے کیا؟ میں جانتا ہوں یہ کیا ہے؟ یہ مذہب کے استیصال کے لئے ایک حربہ ہے۔ اس مجلس کے آدھے ارکان دہریئے ہیں، یا کبریائی وحدت کے قائل ہیں، تثلیث کے نہیں اور یا وہ یہودی ہیں۔ میں شروع ہی سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس مجلس میں ضرورت سے زیادہ یہودی موجود ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں ضرورت سے زیادہ یہودی!

"اور جناب والا! کس طرح ان لوگوں نے آپ کو احمق بنایا ہے!

آپ، ہماری طرح گلیوں میں پل کر اس اعلیٰ منصب کے مستحق بنے ہیں اور یہ لوگ آپ کے منہ پر یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ سب میئر، یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے چاہئیں۔ یہ سکول ماسٹر ہمیں یہ بتانے آئے ہیں کہ شہر کا نظم و نسق کس طرح کرنا چاہئے؟ یہ لوگ اس جمہوریت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے آئے ہیں جس کی خاطر ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی جانیں دینے سے گریز نہیں کیا اور جسے ہمارے بھائی بندوں نے فرانس کے میدانوں میں اعدا کے حملوں سے محفوظ کیا۔ یہ لوگ دیانت دار مزدوروں سے اعلیٰ مناصب کا استحقاق چھین رہے

ہیں۔ انہیں شرم آنی چاہیے۔ اگر ان میں سے ایک تجویز بھی پاس ہوئی، ایک تجویز بھی جو ہماری حکومت کو برباد اور ہمارے حسین شہر کو بے حرمت کر دے گی، تو ہم سب کو شرم آنی چاہیے۔"

ان تجاویز پر کئی دن تک بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ میئر نے ہر تجویز کے لئے مستقل مزاجی سے جنگ لڑی اور بہت سے اراکین نے اس کی حمایت کی اور تماشائیوں نے ان تجاویز کی حمایت میں ہر تقریر اور ہر ووٹ پر والہانہ طور پر تالیاں بجائیں۔ ایک ہفتہ کے آخر میں معاملہ طے ہو گیا اور لوگ گھروں کو واپس چلے گئے۔ ان میں سے ایک تجویز بھی کامیاب نہیں ہوئی۔

تاہم اس شجر کا سایہ سکون پرور ہے اور ان بچوں کی ہنسی کس قدر خوشگوار ہے!

Scanned with CamScanner

حصہ ہشتم

مذہب ------- ایک مکالمہ

مکالمہ کے افراد

اینڈریو	ایک دہریہ	میتھو	ایک کیتھولک
ایریئل	میزبان	پال	ایک پروٹسٹنٹ
کلیرنس	ایک لاادری	فلپ	ایک مورخ
الیسٹر	ایک یہودی عورت	سدھا	ایک ہندو
سر جیمز	ایک ماہر علم الانسان	تھیوڈور	ایک یونانی
کنگ	ایک چینی	ولیم	ایک ماہر نفسیات

مکالمہ تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے

پہلا حصہ- باغ میں

دوسرا حصہ- کمرہ میں

تیسرا حصہ- کتب خانہ میں

باغ میں مذہب کی تشکیل

۱۔ مادہ میں روح دیکھنا

اریئیل۔ آیئے ہم گل لالہ کی کیاری کے گرد بیٹھ جائیں۔ ہم "گول باغ" کے سردار ہیں۔ ہم نے حلف اٹھایا ہے کہ ہم مذہب کی مدافعت یا مخالفت کریں گے۔ آؤ، میتھیو اور اینڈریو، یہ بنچ ذرا اٹھا کر رکھو۔ ہم میں سے جو لوگ غروب کے منظر کو پسند کرتے ہیں، سورج کی طرف رخ کر کے بیٹھ جائیں۔ ہاں، اس طرح۔ اب ہم کاروائی شروع کریں۔

پال، اریئیل، تم نے ہمیں یہاں کیوں جمع کیا ہے؟

اریئیل، میں نے آپ سب کو یہاں اس لئے جمع کیا ہے،

کہ آپ مذہب کے بارے میں بحث کریں۔ مجھے اس موضوع سے بہت دلچسپی ہے، لیکن یہ میرے لئے شدید ذہنی الجھن کا باعث بھی ہے، اور شاید میری طرح بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی پریشان کرتا ہو۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ مذہب کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ مذہب کی مختلف صورتوں کی قدر و اہمیت کیا ہے؟ اس زمانہ میں مذہب کو کیا حیثیت حاصل ہے اور امریکہ میں اس کا مستقبل کیا ہے؟ پھر آپ یہ بھی بتایئے، کہ میری روح فانی ہے یا غیرفانی اور یہ کہ خدا کا وجود ہے کہ نہیں؟

کلیرنس: یہ بحث نہایت مختصر ہو سکتی ہے۔ اگر ہم متفق ہو جائیں۔

اریئیل: لیکن مجھے آپ کے اختلافات سے دل چسپی ہے۔ میں نے آپ کو یہاں اس لئے بلایا ہے کہ آپ سب ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں۔ اگرچہ میں یہ جانتی ہوں کہ آپ ایک دوسرے کو غلطی پر سمجھتے ہیں، پھر بھی میں یہ توقع رکھتی ہوں کہ آپ متفق نہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے خوش گوار مراسم قائم کریں گے۔ ہم اس بحث کا آغاز کس طرح کریں؟

اینڈریو: اصلاحوں کی تعریف سے۔ پہلے یہ بتایئے کہ مذہب کا کیا مطلب ہے؟

اریئیل: نہیں، تعریفیں ایک نہایت تھکا دینے والا مشغلہ ہے۔

فلپ : میں نے ایک مرتبہ مذہب کی مختلف تعریفیں جمع کی تھیں، شاید مجھے ان میں سے چند یاد بھی ہوں۔ شلائیر ماخر نے مذہب کو احتیاج مطلق کا احساس کہا تھا۔ ہیولاک ایلس نے اسے "دنیا کے ساتھ ہم آہنگی کا وجدان" کہا ہے۔ گلبرٹ مرے نے کہا ہے کہ "مذہب ہمیں کائناتی قوتوں کے ساتھ متعلق کرتا ہے" سپنگلر کہتا ہے، کہ یہ "وہ مابعد الطبیعات ہے جسے ہم محسوس کرتے ہیں، یعنی وہ ماورائے فہم حقیقت جو یقینی ہے، وہ مافوق الفطرت طاقت جو حقیقی ہے اور زندگی اس غیر مرئی حقیقت میں وجود رکھتی ہے" پروفیسر شوٹ ویل کہتا ہے کہ "مذہب کسی پر اسرار حقیقت کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔" ایوریٹ ڈین مارٹن اس کی یوں تعریف کرتا ہے کہ "یہ پراسرار وجود کا علامتی ادراک ہے، جو انسان کی انا' کے وظائف میں تحلیل ہو جاتا ہے۔" رائناخ کہتا ہے کہ "یہ ان اوہام کا مجموعہ ہے جو ہماری صلاحیتوں کی نشوونما میں حائل ہوتے ہیں"

میتھیو : اس سے زیادہ مضحکہ خیز اور جانب دارانہ تعریف میں نے نہیں سنی۔

ولیم : یہ سب تعریفیں ژولیدہ ہیں۔

فلپ : ٹائیلر کی تعریف شاید آپ کو پسند آئے، وہ کہتا ہے کہ "مذہب محض روحانی شخصیتوں پر ایمان لانے کا نام ہے۔"

سر جیمز : لیکن کچھ دیوتاؤں کے متعلق بعض لوگوں کو یہ یقین ہے کہ وہ مادری وجود رکھتے ہیں، اور مذہب میں ایمان کے علاوہ پرستش بھی شامل ہے۔

فلپ : آپ کے نزدیک مذہب کی تعریف کیا ہے؟

سر جیمز : میرے نزدیک یہ ان برتر طاقتوں کی رضاجوئی کا نام ہے، جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ قدرت اور انسانی زندگی کی راہ نمائی اور ضبط و نظم کی ذمہ دار ہیں۔

ایریئل : تو آپ کا مطلب ہے کہ یہ مافوق الفطرت ہستیوں کی پرستش کا نام ہے۔

سر جیمز : آپ نے اس پیچیدہ بات کو جس اختصار کے ساتھ بیان کیا اس کا شکریہ قبول کیجئے۔

ایریئل : اچھا، پھر مذہب کا آغاز کیونکر ہوا؟

اینڈریو : لیوکریٹیس کا جواب اس ضمن میں بہترین ہے۔

"خوف نے دنیا میں دیوتاؤں کی تخلیق کی "وحشی زندگی کو ہزاروں خطرات درپیش تھے اور شاید ہی کبھی وحشی لوگ قدرتی موت مرتے ہوں۔ تشدد یا مرض، لوگوں کو پختہ عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیتے۔ جب وحشی انسان واقعات کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو وہ

ان کے اسباب کو شخصی سمجھتا ہے۔ اور اپنے جسم کی مثال سے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ ہر مادی چیز میں روح موجزن ہوتی ہے اور اس کے اعمال کی ذمہ دار ہے۔ کیا آپ نے کبھی کتے کی آنکھوں میں وہ تحیر اور خوف دیکھا ہے جس کے سامنے ہوا ایک کاغذ کو اڑا دیتی ہے؟ وہ ہوا کو نہیں دیکھتا۔ مجھے یقین ہے کہ کاغذ میں اسے کوئی روح نظر آتی ہے، جو اسے حرکت میں لاتی ہے۔ اس کتے کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مذہبی ہے۔ وہ ایک وحشی فطرت پرست ہے۔ اس طرح مذہب کا آغاز ہوا۔

ایریئل: کیا ہم ان کی باتیں مان لیں، سر جیمز؟

سر جیمز: اگر آپ چاہیں تو مان لیجئے۔ جس منزل کو اینڈریو، پہلی منزل کا نام دے رہے ہیں، وہ حقیقت میں دوسری منزل ہے جس میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ طاقت کئی روحوں میں بٹی ہوئی ہے، جو منفرد چیزوں میں جاری و ساری نظر آتی ہیں۔

سدھا، یہ ابتدائی عقیدہ یا ایمان نہایت صحیح تھا۔ وہ جدید سائنس کے اس نظریہ سے زیادہ مختلف نہیں کہ تمام مادہ دراصل قوت ہے۔

سر جیمز: یہ قدیم عقیدہ ہمارے یہاں کئی شکلوں میں موجود ہے۔ کسی زمانہ میں پہاڑ، دریا، چٹانیں، درخت، ستارے اور آسمان، روحوں کی خارجی اشکال متصور ہوتے تھے اور آج کل بھی ہم ان قدرتی اشیاء کو شخصی قوتیں سمجھتے ہیں۔ یونانی یہ سمجھتے تھے کہ آسمان خداوند یورانوس کا جسم ہے چاند، سائیلینی دیوی کا، زمین گیئی دیوی کا اور سمندر، پوسیڈون دیوتا کا۔

تھیوڈور: جناب! تعلیم یافتہ یونانی کے لئے یہ ساری بات محض شاعری تھی۔

سر جیمز: ایک عام یونانی کے لئے یہ ایک واضح اور بین حقیقت تھی، لیکن ہر ملک کے عوام اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ابتدائی جرمنوں اور سکینڈ مینویا کے لوگوں کے لئے جنگل، جنوں، بونوں، دیوؤں اور اس قسم کی غیر مرئی مخلوق سے بھرے ہوتے تھے۔ آئرستان کے سادہ لوح کسان اب تک پریوں کے وجود کے قائل ہیں، اور ان کے اثر سے خوف کھاتے ہیں۔ آئرستان کے احیائے ادب سے پریوں کو خارج کر دیجئے تو محض نثر باقی رہ جاتی ہے۔ امریکی ہندی کبھی کبھی اپنے انحطاط اور تنزل کو اس واقعہ سے منسوب کرتے ہیں، کہ سفید لوگوں نے درختوں کو کاٹ دیا ہے۔ جن کی روحیں سرخ لوگوں کی حفاظت کرتی تھیں۔ جزائر مولکا میں پھلتے پھولتے درختوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو حاملہ عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے قریب کسی شور یا فساد کی اجازت نہیں ہوتی کہ کہیں حاملہ عورت کی طرح ڈر کر وہ وقت سے پہلے اپنا پھل نہ گرا دیں۔ ایموئنا میں جب چاول کے کھیت ہرے

Scanned with CamScanner

بھرے نظر آتے ہیں۔ تو ان کے گرد و نواح میں کسی بلند آواز کی اجازت نہیں ہوتی، کہ کہیں وہ اسقاط' کا شکار نہ ہو جائیں۔ گال میں ڈروئیڈ اپنی مذہبی رسوم میں شاہ بلوط کی امر بیل جمع کرتے تھے۔

اریئیل : امر بیل کے ساتھ آج بھی مذہبی رسوم وابستہ ہیں' لیکن ہمیں کچھ اور بتایئے' سر جیمز۔

سر جیمز : روح مظاہر کا یہی نظریہ ستاروں پر بھی چسپاں کیا گیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر ایک رہنما روح بستی تھی۔ بابل کے لوگ سات سیاروں کو کبریاتی صفات دیتے تھے اور اپنے ہفتہ کے دنوں کو ان کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ بابل ہی میں علم نجوم نے جنم لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیارے انسانوں کی تقدیر پر حاوی ہیں۔ آج تک ہمارے اخبار ہر مہینہ نجومی کے زائچے شائع کرتے ہیں اور ہم اپنی گفتگو میں علم نجوم کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے قبائل میں چاند گرہن کے وقت لوگ خوفناک آوازیں بلند کرتے ہیں تاکہ وہ عفریب جو چاند پر حملہ کر رہے ہیں' بھاگ جائیں۔ ایتھنز نے انکسا گورس کو جلا وطن کر دیا تھا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ سورج کوئی دیوتا نہیں بلکہ آگ کا ایک گولا ہے۔ مسیحیت نے ان روحوں کو فرشتوں میں تبدیل کر دیا۔ کیلر یہ سمجھتا تھا کہ ہر ستارے کے ساتھ ایک روح ہوتی ہے جو اس کی گردش میں اس کی راہ نمائی کرتی ہے۔ تقدس کا جو ہالہ ہم صوفیا اور اولیا کے گرد دیکھتے ہیں' دراصل سورج کی پرستش کا ایک باقی ماندہ اثر ہے۔ جاپان کے میکاڈو کو آج بھی جاپانی سورج دیوتا سمجھتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ روح مظاہر کا نظریہ مذہب کی بنیاد ہے اور اس نظریہ کا مطلب یہ ہے' کہ ہر چیز میں ایک روح موجود ہوتی ہے۔

فلپ : اس ابتدائی روح مظاہر پرستی کی ایک صورت' ذکر پرستی بھی تھی۔

سر جیمز : ہاں' وحشی قبائل ان اندرونی اعضا کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے' جو تناسل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ انہیں صرف ظاہری اعضا کا علم تھا' اور ان سے کبریائی صفات منسوب کرتے تھے۔ وہ ان کی اصل حقیقت سے واقف نہیں تھے اور سمجھتے تھے کہ ان میں تخلیقی روحیں موجود ہیں۔ اس بنا پر ان اعضا کی پرستش کی جاتی تھی۔

سدھا : میرے خیال میں مذہب کا یہ تصور نہایت معقول ہے۔ ان اعضا ہی میں زرخیزی اور نشوونما کا معجزہ نظر آتا ہے۔ یہ اعضا تخلیقی قوت کے پیکر ہیں۔ تناسل کے علائم' لنگم اور یونی' اب تک ہمارے ملک میں ان کی پرستش ہوتی ہے' اور انہیں تحفظ کی علامتیں سمجھا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

فلپ : مصر کی قدیم دستاویزیں یہ بتاتی ہیں کہ مصر میں ذکر پرستی قدیم ترین ادارہ ہے۔ رومن لوگ ذکر کی علامتیں تعویذ کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے تاکہ ان کی زرخیزی میں اضافہ ہو۔ وہ اپنے میلے ٹھیلوں میں تناسل کے طلسم کو مناتے تھے۔ لوشین بڑے بڑے میناروں کا ذکر کرتا ہے۔ جو تقریباً دو سو فٹ اونچے ہوتے ہیں اور جو افروڈائیٹس کے مندر کے سامنے ذکور کی طرح کھڑے ہیں۔

اینڈریو : میں سمجھتا ہوں کہ ہر عبادت' بالخصوص عورتوں میں' جذبہ محبت کے ساتھ وابستہ ہے۔ سینٹ تریسا کے تصورات بھی جنسی احساسات اور جذبات کے ساتھ وابستہ تھے۔ اگر ہم کرافٹ ایبنگ اور ہیولاک ایلس سے اتفاق کریں تو ہر مقدس شخصیت کی یہی حالت ہوتی ہے۔ چونکہ میرا تجربہ ان میں سے صرف ایک جذبہ تک محدود ہے اس لئے میں اس موضوع پر اس سے زیادہ بحث کرنے سے قاصر ہوں۔

سر جیمز : غالباً مذہبی احساس میں جنس کی شرکت کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ شجر پرستی' چوکنٹھے میناروں' اور یورپ میں آغاز بہار منانے کے لئے جو جھنڈے گاڑے جاتے ہیں' ان کی توجیہہ جنسی اصطلاحوں میں کرنا غالباً صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح جو رسوم ختنہ کے ساتھ وابستہ ہیں ان کی بھی کوئی اس طرح کی توجیہہ مناسب نہیں۔

تھیوڈر : ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تناسل سے متعلق یہ قدیمی رسوم جنسی نہیں' مذہبی نوعیت رکھتی تھیں۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے انہیں تعیش کے ساتھ وابستہ کر دیا' لیکن ابتدا میں قوت تناسل کو جامہ تقدیس پہنایا گیا۔ میرے نزدیک اسے غلیظ سمجھنے کے مقابلے میں یہ بہتر ہے کہ ہم اسے مقدس سمجھیں۔

اینڈریو : اسے غلیظ سمجھنا غیر ضروری ہے۔

ایرئیل : اچھا! اب اور کچھ بتایئے' سر جیمز! روح مظاہر مذہب کی تشکیل کا پہلا عنصر ہے۔ اس کا دوسرا عنصر کیا ہے؟

۲۔ سحر

سر جیمز : دوسرا عنصر' جادو ہے۔ دنیا کو روحوں سے بھر کر اور ان پر قابو نہ پا سکنے کی وجہ سے وحشی قبائل نے انہیں خوش رکھنے اور اپنی طرف مائل کرنے کی ٹھانی۔ بقول رائناخ' جادو' روح مظاہر کا حربہ ہے' بالعموم اس کی شکل ہمدردانہ سحر کی ہوتی ہے اور جو شبہ دینے کی صلاحیت پر مبنی ہے۔ وحشی عبادت گزار بارش لانے کے لئے خود یا اپنے جادوگر

Scanned with CamScanner

کی مدد سے زمین پر پانی لنڈھاتا ہے۔ آج تک بلقسان اور جرمنی کے بعض حصوں میں، بارش کی کمی کے زمانہ میں ایک جوان لڑکی کو برہنہ کر کے اس پر پانی ڈالا جاتا ہے اور جادو کے منتر پڑھے جاتے ہیں۔ کافر لوگوں کو جب قحط باراں کا اندیشہ ہوتا تو وہ اپنے مذہبی رہنما سے کہتے کہ وہ چھتری ہاتھ میں لے کر کھیتوں میں چلے پھرے۔ سماٹرا میں بانجھ عورت ایک بچے کا بت بنا کر اسے اپنی گود میں رکھ لیتی ہے تاکہ اس کا بانجھ پن دور ہو جائے۔ جزائر بابر میں بانجھ عورت سرخ کپڑے کی گڑیا بنا کر اسے دودھ پلاتی ہے اور جادو کا ایک منتر پڑھتی ہے۔ لوگوں میں یہ افواہ پھیل جاتی ہے کہ اس عورت کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے اور لوگ اسے مبارکباد دینے آتے ہیں۔ بورنیو کے ڈیاک قبیلہ میں جب کسی عورت کو درد زہ شروع ہوتا ہے تو جادوگر خود اس طرح کی حرکتیں کرتا ہے جیسے اس کے یہاں بچہ پیدا ہو رہا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح درد زہ کم ہو جاتا ہے اور بچہ جلدی پیدا ہو جاتا ہے۔ چند لمحوں کی حرکات کے بعد جادوگر اپنی کمر سے ایک پتھر گراتا ہے اور ایک ایسا منتر پڑھتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جنین پتھر کی نقل کر کے باہر نکل آئے۔ تاریخ کے بہت سے مشہور علاج جادو کے ذریعہ ہوتے ہیں۔ آپ کے ملک کے عالم، ڈاکٹر جیمز۔ جے۔ وانش نے ایک نہایت دل فریب کتاب میں جادو کے قصے لکھے ہیں۔ اگر کسی کے جسم پر پھوڑا ہو گیا ہے تو اسے شہاب ثاقب کا انتظار کرنا چاہئے۔ اگر وہ گر جائے تو اپنے چہرہ کو صاف کر لیجئے، تمام پھوڑے ختم ہو جائیں گے۔ اگر وہ نہ ختم ہوں تو یقیناً اس کی وجہ یہی ہو گی کہ آپ نے تیزی سے کام نہیں لیا۔ التمیرا کے غاروں کی دیواروں پر حیوانوں کی جو تصویریں بنی ہیں، ان پر تیروں کی بارش کی وجہ غالباً جادو کے اثر سے جانوروں کو مارنا ہے۔ زمانہ وسطیٰ میں لوگ اپنے دشمنوں کو مسمور کرنے کے لئے ان کے موم کے مجسموں پر کیل گاڑ دیتے تھے۔ آج بھی ہم لوگوں کے مجسموں کو جلاتے ہیں۔ جب پیرو کے لوگ یہ رسم ادا کرتے تھے تو کہتے تھے کہ اپنے دشمنوں کی روحیں جلا رہے ہیں۔

اینڈریو: میرا خیال ہے۔ سر جیمز! کہ آپ کا یہ محبوب نظریہ ہے کہ "جادو سے مذہب پیدا ہوا ہے۔"

سر جیمز: "روح مظاہر" کے نظریہ سے شاعری پیدا ہوتی ہے، جادو سے ڈراما پیدا ہوتا ہے اور روحوں کی تسخیر کی آرزو سے سائنس پیدا ہوتی ہے۔ جب کوئی جانور کی رسم ناکام رہتی ہے تو جادوگر کی شہرت میں فرق آتا ہے اس لئے کہ لوگ جادو کی ایک کامیابی کو یاد رکھتے ہیں لیکن اس کی بہت سی ناکامیوں کو بھلا دیتے ہیں۔ جادوگر کی عافیت اسی میں تھی کہ

وہ اسباب و علل کا مطالعہ کرے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے فطری ذرائع اختیار کرے۔ ان وسائل کے ساتھ جادو کی رسم استعمال کرتے ہوئے وہ اپنی کامیابی کو جادو سے منسوب کر سکتا تھا اور اپنی اس شہرت میں اضافہ کر سکتا تھا کہ وہ دیوتاؤں کی تسخیر کر سکتا ہے۔ پرانے جادوگر معجزہ گر اور پروہت سے طبیب اور حکیم، منجم اور ماہرین فلکیات اور ماہرین کیمیا بنے۔ ہر شعبہ میں ہمارے سائنس دان ان پرانے جادوگروں کے وارث ہیں۔ اس ایک سرچشمہ کی بدولت مذہب اور سائنس، مابعد الطبیعات اور طلب جیسی چیزیں تاریخ انسانی میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔

بعض مقامات پا جادوگر کا فن یا جادو کے منتر اتنے مشہور ہو چکے ہیں کہ اگر جادوگر خدا کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہے تو لوگ اسے دیوتاؤں کی ڈھٹائی پر محمول کرتے ہیں، جادوگر کی ناکامی پر نہیں۔ یونان میں بعض اوقات جوان آدمی اگر اپنے شکار میں ناکام رہتے تو "پان" کے صنم کو پیٹتے تھے۔ اطالوی ماہی گیر اگر اپنی دعاؤں کے باوجود زیادہ مچھلی نہ پکڑ سکیں تو "کنواری مریم" کے بت کو دریا میں پھینک دیتے ہیں چینی لوگ، اگر ان کی دعائیں ناکام رہیں، کسی دیوتا کے صنم کو بازروں میں ذلیل کرتے ہیں، اور اسے گالیاں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "او ذلیل روح! ہم نے تجھے شاندار مندر رہنے کو دیا، تجھے آراستہ پیراستہ کیا، ہم نے تجھے اچھا کھانے کو دیا، ہم نے تیرے سامنے قربانی پیش کی اور پھر بھی تو ناشکر گزار ہے۔" ان عجیب و غریب رسوم، میں وحشی لوگ تقدیر کے اس تصور کے قریب تھے جو دیوتاؤں اور انسانوں سے برتر ہے اور جو یونانی تہذیب کا طغرائے امتیاز ہے۔ ایک طرف تو وہ ہمیں وحدت الوجود کی طرف لے جاتا ہے اور دوسری طرف سائنس کی طرف۔

ایرئیل: مجھے پتا نہیں چلا کہ ان سب باتوں کا نتیجہ کیا نکلا؟ لیکن شاید یہ سب کچھ ضروری ہے۔

سر جیمز: آپ کو اتنی جلدی نتائج کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ تاریخ یا سائنس کے کسی موضوع کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ بہتر ہے کہ ہم اپنے آپ کو واقعات اور حقائق سے آشنا کریں۔ اگر آپ فوراً کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں تو یہ نتیجہ چند واقعات کو منتخب کر لے گا اور آپ باقی واقعات کو نہیں دیکھ سکیں گے۔

ایرئیل: آپ صحیح کہتے ہیں آپ کی تنبیہہ حق بجانب ہے۔ اچھا آپ اپنی بات جاری رکھیے۔

سر جیمز: جادو سے نہ صرف ڈراما اور سائنس پیدا ہوئے، بلکہ مذہبی رسوم قربانی اور

Scanned with CamScanner

دعا کی رسوم بھی پیدا ہوئیں۔ بہت سی دعائیں اب تک لوگوں کے لئے جادو کے منتروں کی طرح ہیں، جنہیں وہ بار بار دہراتے ہیں۔ تعویذ، بددعا اور دعائے خیر بھی جادو سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن سب سے زیادہ اہم اور مقبول حیثیت زراعت کے رسوم کی تھی۔ وحشی قبائل نشوونما کی قوتوں کو نر اور مادہ میں تقسیم کرتے تھے۔ چیزوں کا مشاہدہ کرنے اور ان کے متعلق سوچنے کا شخصی طریقہ، غیر شخصی طریقہ سے پہلے ظہور میں آتا ہے، جس طرح نظریہ روح مظاہر، مابعدالطبیعات سے پہلے پیدا ہوا۔ ایک بچے کا خدا سپینوزا کے خدا سے کہیں زیادہ واضح اور مرئی ہے۔ فلسفہ کا ایک نقصان یہ ہے کہ وہ ہمیں موجودات کی بجائے عمومی کلئے دیتا ہے اور ہمارے شباب کے جیتے جاگتے خدا کی جگہ ایک غیر مرئی منطق کو لاکھڑا کرتا ہے جسے ہم انسانی پیکر میں نہیں دیکھ سکتے۔

ہر سال ہر نسل کا اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اچھی فصل کیونکر پیدا کی جائے۔ وحشی لوگ اس مسئلہ کو سائنٹیفک انداز سے نہیں حل کر سکتے تھے۔ وہ جادو کی مدد لیتے تھے۔ وہ دھرتی ماتا سے کہتے تھے کہ تو ہمیں اس مرتبہ اچھی فصل عطا کرنا۔ اس ضمن میں تخم ریزی کے زمانہ میں وہ ذکری میلے مناتے اور اس طرح زمین کو زرخیز کرتے اور وقتی طور پر اخلاقی پابندیوں کو خیرباد کہہ دیتے۔ بعض ممالک میں لوگ اس زمانہ میں ایک بادشاہ اور ملکہ یا ایک دولہا اور دلہن چنتے اور شادی کی رسوم ادا کرتے تاکہ زمین زرخیزی کی طرف مائل ہو۔ اکثر اوقات دولہا اور دلہن کو مجامعت کرنا پڑتی تاکہ فطرت اچھی طرح سمجھ جائے کہ اس سے کیا توقعات وابستہ کی جا رہی ہیں۔

آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ان باتوں کا مذہب سے کیا تعلق ہے۔ ذرا صبر کیجئے، جب آپ مذہبوں کا تقابلی مطالعہ کریں گے تو آپ کو اپنے مذہب کی حیثیت کا صحیح اندازہ ہو گا۔ وحشی انسان بھی ہماری طرح اچھی فصل کا محتاج تھا۔ اس کے پاس قحط اور خشک سالی کا کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ اچھی فصل کے لئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ اسے یہ خیال آیا کہ دھرتی ماتا کی بارگاہ میں ایک انسان اور اپنی رحم دلی کے عہد میں ایک حیوان کی قربانی دے۔ یہ خون، زمین کی تہوں میں رچ کر دیوی کی رضا جوئی کا باعث بنے گا اور زمین کو زرخیز بنا دے گا۔ ایکیوڈور کے ہندی تخم ریزی کے وقت انسانی خون اور دل کی قربانی دیتے تھے۔ پونی کے ہندی بھی یہی کچھ کرتے تھے اور بنگال کے قبائل میں یہ رسوم نہایت ظالمانہ انداز میں ادا کی جاتی تھیں۔ دھرتی ماتا کی بارگاہ میں بعض اوقات کسی مجرم کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا۔ ایتھنز کے باشندے چند مجرموں کو اس مقصد کے لئے ہمیشہ علیحدہ رکھ

Scanned with CamScanner

لئے کہ ضرورت کے وقت ان کی جانیں دیوتاؤں کے حضور میں نذر کر دیں۔ جب بھی طاعون یا قحط کی وبائیں ان پر حملہ آور ہوتیں تو وہ دو مجرموں کو ذبح کر دیتے' ایک قبیلہ کے مردوں کی طرف سے اور ایک قبیلہ کی عورتوں کی طرف سے یہ ہے نیابتی کفارہ کے تصور کا سرچشمہ۔

ایرئیل: آپ کا مطلب ہے کہ مسیحی مذہب کے اساسی عناصر ان خونیں رسوم میں سے پیدا ہوئے ہیں؟

سر جیمز: غالباً! لیکن میں اسے مسیحیت کا ایک اساسی عنصر نہیں کہوں گا۔ میں اس بات پر بہت حیران ہوا کہ امریکہ میں جو فرقہ ثانوی اور غیر ضروری مذہبی عناصر کو زیادہ اہمیت دیتا ہے' اپنے آپ کو بنیاد پرست' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ میں آپ کا مہمان ہوں۔ مجھے یہ کہنا تو نہیں چاہئے لیکن میں تو اسے "سطحیت پرست" کا نام دوں گا۔ لیکن کیا میں یہ داستان جاری رکھوں؟

ایرئیل: آخری منطقی حد تک جاری رکھئے۔

سر جیمز: صحیح علمی جذبہ یہی ہے۔ ہر سال تھارگیلیا کے میلے میں ایتھنز کے باشندے دو بکریوں کو سنگسار کرتے تاکہ دیوتا ان لوگوں کے گناہ معاف کر دے۔ بسا اوقات یہ جانور ایک سال پہلے ہی چن لیا جاتا اور بارہ مہینے تک اس کی پرستش کی جاتی' لیکن موسم بہار میں اسے قتل کر دیا جاتا اور بعض حالات میں خاصی اذیتیں دینے کے بعد قتل کیا جاتا۔ یقیناً لوگوں کے آزاد پرست جذبات ان پارسا رسوم میں تسکین پاتے تھے۔ اس کے بعد وحشیوں کی رسوم کے مطابق منتخب جانور کو پچھلے سال کے مقتول جانور کی روح کی تجسیم سمجھا جاتا' جس طرح بہادر کو دھرتی ماتا کا احیا سمجھا جاتا تھا۔ دیوتا کی موت اور احیا کی اساطیر مغربی ایشیا اور شمال مشرقی افریقہ کے مذاہب کا لازمی جزو بن گئیں۔

دیوتا کو قتل کرنے کی رسم سے اسے کھانے کی بہتر رسم پیدا ہوئی' کیونکہ وحشی یہ سمجھتا ہے۔ کہ جو چیز وہ کھاتا ہے۔ اس کی طاقت اس میں آ جاتی ہے۔ پہلے پہل لوگ مقتول کا خون پیتے اور گوشت کھاتے تھے' لیکن تہذیب کی ترقی کے ساتھ لوگوں نے جانور کی جگہ آٹے کے صنم بنانے شروع کر دیئے اور انہیں کھانے لگے۔ قدیم میکسیکو میں دیوتا کا بت پستے بیج اور سبزیوں سے بنایا جاتا اور اسے ان لڑکوں کے خون میں گوندھا جاتا' جو اس خاص مقصد کے لئے قربان کئے جاتے تھے۔ لوگ روزہ رکھنے کے بعد اس بت کو مذہبی عقیدت کے ساتھ کھا جاتے۔ پروہت ان مجسموں پر جادو کے منتر پڑھتے اور انہیں غذا سے دیوتا بنا

Scanned with CamScanner

دیتے۔

میتھیو: آپ اس سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے کہ مسیحی مذہب کے کفارہ اور عشائے ربانی کے تصورات محض اس لئے غلط ہیں، کہ ان سے مماثل تصورات وحشی قبائل میں بھی پائے جاتے ہیں۔

سر جیمز: نہیں۔ بالکل نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تصورات صحیح ہوں۔ میں اس مسئلہ پر قطعیت سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ رسوم بتدریج زیادہ مہذب ہوتی گئیں۔ ابتدائی رسوم آدم خور قبائل میں موجود تھیں۔ وہاں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دیوتا کا ذوق سردار قبیلہ کے ذوق کے مشابہ ہو گا۔ جب آدم خوری کا دور ختم ہوا تو انسانوں کی جگہ حیوانوں کی قربانی دی جانے لگی۔ غالباً اس تبدیلی کی جھلک ہمیں ابراہیم اسماعیلؑ اور دنبے کی داستان میں نظر آتی ہے۔ لیکن وحشیوں کے مذہبی راہ نما گوشت خور تو تھے ہی انہوں نے جلدی ہی قربانی کے جانور کے لذیذ حصے اپنے لئے الگ کرنے کے طریقے نکال لئے۔ وہ ہڈیاں چربی میں لپیٹ کر خدا کے حضور میں پیش کر دیتے۔

اینڈریو: اس وقت تک خدا کو حاضر و ناظر نہیں سمجھا جاتا ہو گا۔

۳۔ ٹوٹم اور تحریم

سر جیمز: انسان حیوانوں کے محتاج تھے اور بڑے بڑے درندوں سے ڈرتے تھے۔ اس حقیقت سے مذہب میں ایک تیسرا عنصر 'ٹوٹم پرستی' پیدا ہوا۔ ٹوٹم ایک ہندی لفظ ہے جس کا مطلب علامت ہے۔ شمالی امریکا کے ہندی ایک صنم بناتے تھے، جو کسی ایسے جانور یا پودے کی نمائندگی کرتا تھا جس میں ان کے قبیلہ کی روح موجود ہوتی تھی۔ ٹوٹم پرستی اکثر و بیشتر شکاری عہد کے ساتھ وابستہ رہی، لیکن زراعتی عہد میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔ اسی طرح مقدس فاختہ، مچھلی اور بھیڑ، یہودی اور مسیحی مذاہب میں شامل ہوئیں۔

کلیرنس: ہم سب ٹوٹم پرست ہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ بارہ سنگھے اور کچھ ہرن کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم میں سے بعض لوگ ہاتھی اور بعض جمہوریت کی بہترین علامت گدھے کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم میں سے بعض لوگ شیر اور بعض عقاب کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے مقدس جذبات کے اظہار کے لئے حیوانوں کی ضرورت ہے۔

فلپ: ۱۹۲۷ء میں جاپان کی حکومت نے یہ فرمان جاری کیا کہ وہ سب مندر اور درگاہیں جلا دی جائیں، جن میں لومڑیوں، سانپوں اور دوسرے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے۔

ولیم : غالباً یہودا اور اس کے ہم عصر خداؤں کی درشت مزاجی، وحشی درندوں کی پرستش کی یادگار تھی۔ ایک عبوری دور میں لوگوں نے خدا کا تصور اس طرح باندھا کہ اس کا چہرہ انسان کا سا اور نچلا دھڑ حیوان کا سا ہے۔ ابوالہول اس کی ایک مثال ہے۔ جب انسان اور حیوان کی باہمی جنگ کی جگہ انسان اور انسان کی باہمی جنگ نے لی تو لوگوں نے خدا کو ایک سپہ سالار کی حیثیت دے دی، حیوان نہیں تھا بلکہ فوجوں کی قیادت کرتا تھا۔ لیکن وہ بدستور درشت مزاج رہا۔ ٹارڈ بتاتا ہے کہ شوہر کی طرح زیادہ سخت گیر دیوتا زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا تھا۔

ایریئل : آپ مرد کس قدر وسیع علم پر حاوی ہوتے ہیں۔ ہم بیچاری عورتوں کو بچوں کی تربیت اور خود آرائی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ آپ کا مقابلہ کر سکیں۔ سر جیمز، آپ نے مذہب کے تین ماخذ بتائے ہیں۔ نظریہ روح مظاہر، جادو اور ٹوٹم پرستی، کیا اس کے اور بھی ماخذ ہیں؟

سر جیمز: دو اور ہیں۔ تحریم اور آباء پرستی۔ لکڑی کا وہ صندوق جس میں توریت کی الہامی تختیاں محفوظ تھیں بڑی مقدس چیز سمجھی جاتی تھی۔ اسے صرف مذہبی رہنما چھو سکتے تھے۔ جب داؤدؑ اسے یروشلم لے جانا چاہتے تھے تو انہوں نے اسے یک بیل گاڑی پر لاد دیا۔ بیل لڑکھڑائے اور قریب تھا کہ صندوق گر جائے لیکن ایک شخص نے لپک کر اسے سنبھال لیا۔ خدا نے فوراً اس کی روح قبض کر لی۔ کیونکہ اس نے ایک فرمان کی خلاف ورزی کی تھی۔ اکثر امتناعی احکام اخلاقی رسوم کی نوعیت رکھتے تھے جو قبیلہ کی بقا کے لئے اس قدر لازمی سمجھے جاتے تھے کہ انہیں مذہبی تقدس عطا کر کے ان کی اہمیت واضح کی جاتی تھی۔ دس فرمان، اس کی ایک مثال ہیں۔ ایرانی بتاتے ہیں کہ ایک دن زرتشت پہاڑ پر عبادت کر رہا تھا کہ خدا چمک اور گرج کے پردے میں اس پر ظاہر ہوا، اور اسے "کتاب قوانین" عطا کی۔ کریٹ کے اساطیر کے مطابق بادشاہ مائنوس نے کوہ ڈکٹا پر خدا سے قوانین حاصل کئے۔ یونانی روایت کی رو سے ڈائیو نیسس کو آئین ساز کا لقب ملا اس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں دو پتھر کی تختیاں اٹھائے ہوئے ہے جن پر اس کے قوانین کندہ ہیں۔ یہ حاکم کی حکومت کو مستحکم کرنے کا بہترین طریقہ تھا۔ شاید بادشاہوں کے کبریائی حقوق بھی اسی میلان کے آثار میں سے ہیں۔

کلیرنس: یہ نہایت مفید طریقہ ہے اور آج کل بھی کبھی کبھی استعمال ہوتا ہے۔

ہے۔ آبا پرستی

اریئیل : لیکن سر جیمز، یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے مذہب کی تاریخ تو بیان کی لیکن خدا کا ذکر نہیں کیا۔

سر جیمز :۔ خدا، مذہب کی آخری منزل ہے۔ آپ بچوں کی طرح یہ سوال پوچھ رہی ہیں کہ "خدا کو کس نے بنایا؟" کہ یہ دیوتاؤں کا بحر ناپیدا کنار، یہ کھلے میدانوں، جنگلوں اور آسمانوں کی روحیں، ہمارے خدا میں کیونکر تبدیل ہو گئیں؟ آپ کو وہ قدیم کہانیاں یاد ہیں جن میں دیوتا، حیوانوں اور انسانوں کی شکلیں اختیار کر لیتے تھے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ فصلوں اور حیوانوں کے دیوتا نیم انسانی دیوتا بن گئے تھے۔ جب ہم یہ سنتے ہیں کہ زئیس دیوتا نے ایک بیل کا روپ دھار لیا۔ اور جب ہم "الو کی آنکھوں والی اتھین" اور "بچھیا کی آنکھوں والی ہیرا" کی کہانی پڑھتے ہیں، تو ہمیں یہ شک گذرتا ہے کہ یونانی قبائل اپنے نئے خداؤں کے تصورات کو ان تصورات میں جذب کر رہے ہیں جو عہد قدیم میں وہ اپنے ٹوٹموں کے بارے میں باندھا کرتے تھے۔ ولیم نے ابوالہول، کا ذکر کیا ہے، جو عبوری دور کے ان دیوتاؤں کی ایک مثال ہے جو نیم انسان اور نیم حیوان ہوتے تھے۔ ولیم کو اس کی مثال کے لئے اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ کے اپنے۔ عجائب گھر میں نیم انسان اور نیم حیوان اصنام موجود ہیں۔ نیم بیل اور نیم انسان صنم، نیم اسپ اور نیم انسان صنم، نیم طائر اور نیم زن صنم، نیم ماہی اور نیم زن صنم۔ دراصل یہ ایک انسان نما خدا کے تصور کا پیش خیمہ تھے۔ آبا پرستی نے اس انقلاب کو مکمل کر دیا۔

آبا پرستی غالباً خواب میں مردوں کے ظہور سے شروع ہوئی۔ ان بھوتوں کے ظہور سے خوف پیدا ہوا اور لوگوں نے ان کی پرستش شروع کر دی۔ جو لوگ زندگی میں طاقت اور تومند تھے، مرنے کے بعد کسی حد تک ان کی طاقت کو محسوس کیا جاتا تھا۔ مردوں کا خوف مذہب کی ابتدائی منازل میں سب سے زیادہ مؤثر عنصر تھا۔ نظریہ روح مظاہر سے جادو پیدا ہوا اور آبا پرستی سے مذہب پیدا ہوا۔ بعض وحشی اقوام میں خدا کے لئے وہ لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب "مردہ انسان" ہے۔ یہوداہ کے معنی، طاقتور آدمی کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک طاقتور سردار ہو گا۔ مصر، روما، میکسیکو، اور پیرو میں لوگ بادشاہ کو خدا سمجھ کر اس کی پرستش کرتے تھے۔ سکندر نے اپنے آپ کو خدا بنا لیا تھا کیونکہ جن اقوام کو اس نے فتح کیا تھا، ان کے یہاں بادشاہ خدا کے مترادف تھا۔ اس مرتبہ کے بغیر وہ سکندر کو اپنا حاکم تسلیم ہی نہ کرتے۔ اب ان طاقتور انسانوں کی روحوں کی رضاجوئی بھی کرنا پڑی۔ ان کی تکفین و تدفین کی رسوم کا بھی یہی مقصد تھا کہ ان کا جنازہ بھی کبریائی شان و شکوہ کے ساتھ

Scanned with CamScanner

اٹھے۔ دنیا کے سرداروں کے حضور میں جس انکسار اور نیاز کی ضرورت ہوتی ہے وہی آداب خدا کی بارگاہ میں منتقل کر دیئے گئے۔ دست بستگی، رکوع و سجود، مدح و ستائش، جو سردار کی اطاعت کی علامتیں تھیں، اب عبادت ربانی کی نشانیاں بن گئیں۔ آج تک کوئی کیتھولک محراب متوفی اولیا کے اصنام کے بغیر مکمل نہیں ہوا۔ ان معنوں میں آبا پرستی چین اور جاپان تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ بتدریج ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔

یونانی اور دوسری قدیمی اقوام اپنے مزدوروں سے حاجت روائی کی طلب گار ہوتی ہیں اور مسیحی اپنے اولیا سے۔ مردوں کی دنیا ان کے لئے اتنی حقیقی ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ خاصی قیمت ادا کر کے ان تک اپنے پیغام بھیجتے ہیں۔ ایک سردار اپنے ایک غلام کو بلا کر اس کے سامنے پیغام پڑھتا ہے اور پھر اس کا سر کاٹ دیتا ہے۔ اگر سردار کوئی بات بھول جائے تو وہ ایک اور غلام کا سر کاٹ کر پہلے کے پیچھے بھیج دیتا ہے۔ مردہ انسان کی روح کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کو وہ مافوق الفطرت قوت مانا حاصل ہے، جو بعد کے دیوتاؤں کو حاصل تھی، اس لئے نہایت حزم و احتیاط سے اس کی رضا جوئی کی جاتی، مذہب مردوں کی رضا جوئی سے پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ مردوں کی محبت میں تبدیل ہو گیا۔ ایک خونخوار انسان سے بھی اس کے مرنے کے بعد محبت کی جا سکتی ہے۔

اس سے اگلا قدم خدا کا وہ تصور تھا، جس نے اسے باپ بنا دیا۔ جدید مذہب میں خدا کی والدیت ایک نازک روحانی رشتہ ہے۔ ہم خدا کے متعلق یہ نہیں سوچتے کہ وہ جسمانی طور پر بچے پیدا کرنے کا اہل ہے، لیکن یونانیوں اور دوسری پرانی اقوام میں خدا کی والدیت جسمانی تھی۔ انسانی نسلیں مختلف دیوتاؤں کی اولاد تھیں اور ہر شجرہ کی ابتدا میں کسی دیوتا کا نام موجود ہوتا۔ یہ تصور (جو یونانیوں اور یہودیوں میں موجود تھا) کہ خدا نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، بعد میں نظر آتا ہے۔

اس طرح رفتہ رفتہ آخرکار، انسانوں نے ایک انسانی خدا کا تصور باندھا۔ ارتقا کی یہ منزلیں خاصی مدت میں طے ہوئیں۔ انسانی خدا کے ظہور سے پہلے کئی صدیوں تک، روحوں کے سمندر تھے۔ چٹانوں، درختوں اور سیاروں کی روحیں تھیں، تناسل اور زرخیزی کی روحیں تھیں، حیوانی خداؤں کی روحیں تھیں۔ اور آخرکار، آباو اجداد اور امرا کی پرستش سے انسانی خدا پیدا ہوا۔ سپنسر کا خیال تھا کہ مذہب آبا پرستی سے پیدا ہوا۔ اور تیسری صدی قبل مسیح میں یوریمیرس نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا۔ لیکن آبا پرستی مذہب کی ابتدائی منزل نہیں۔ اس سے پہلے وہ دور آئے جن میں کوئی انسان نما خدا موجود نہیں تھا۔ لیکن آبا پرستی

کی نمود سے مذہب میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا- اس ادارہ نے مذہب کو انسانیت بخشی- اس نے خدا کے تصور کو پہلے ایک طاقت ور' اور بعد میں ایک نیک انسان کے تصور کے سانچے میں ڈھالا- اس نے یہودیہ' یونان اور روما کے عظیم مذاہب کے لئے راستہ صاف کیا- اب کوئی اور شخص اس داستان کو سنبھالے-

۵- فطرت پرستی

اریئیل : سر جیمز' آپ نے ہمیں جن ذہن افروز حقائق سے آگاہ کیا ہے' ان سے میرے عام اسلوب فکر میں ایک ہلچل سی مچ گئی ہے- میں دیکھ رہی ہوں کہ پال اور میتھیو نے آپ کی باتوں کو نہایت صبر اور تحمل سے سنا ہے- اب وہ ہمیں بتائیں گے کہ ان کو کہاں کہاں آپ سے اختلاف ہے- لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اب تھیوڈور ہمیں یونانیوں کے مذہب کے متعلق کچھ بتائے- فطرت پرستی یقیناً ایک دلچسپ مذہب ہو گا-

تھیوڈور : محترمہ' میں یونانی کہے جانے کا مستحق نہیں ہوں- آج کل کے یونانی دراصل سلاد ہیں- ان کی نسل بہت قدیم نہیں ہے- چینیوں کی طرح انہیں ان کا تمدن ورثہ میں نہیں ملا- وہ امریکیوں کی طرح ایک نئی قوم ہیں' جو ایک نئی ثقافت کی تعمیر کر رہے ہیں- لیکن میں نے اپنے ملک کے قدیم مذہب کا شوق و ذوق سے مطالعہ کیا ہے اور میں خوشی سے اس کے متعلق گفتگو کروں گا- دراصل مجھے پہلے ہی یہ توقع تھی کہ آپ مجھ سے یہ کہیں گے کہ میں یونانیوں کے مذہب کا ذکر کروں' اس لئے میں اپنے ساتھ سر گلبرٹ مرے کا ایک قول لکھ کر لایا ہوں-

تھیوڈور : انہوں نے میرے ملک کا ذکر بہت اچھی طرح کیا ہے- سر گلبرٹ کہتے ہیں' کہ ہر "شعبہ زندگی کی طرح مذہب میں بھی قدیم یونان نے بالکل شروع سے ابتدا کی اور سعی پیہم سے مرتبہ کمال تک پہنچ گیا- شاید ہی دنیا کا کوئی خطرناک واہمہ ہو' جس کا نقش ہمیں یونانی مذہب میں نظر نہ آتا ہو اور شاید ہی روحانی معراج کی کوئی منزل ہو' جس کی گونج ہمیں تھیلیس سے لے کر پولوس رسول تک کے ادب میں سنائی نہ دیتی ہو-" شاید میں آپ کو اس عظیم الشان ارتقا کی ایک جھلک دکھا سکوں- اور یہ واضح کر سکوں کہ سر جیمز کے شاندار تجزیہ کا اطلاق یونان کے مذہب پر کس طرح ہوتا ہے-

ابتدا میں دوسری قوموں کی طرح یونانیوں کو بھی درختوں' ستاروں' حیوانوں اور پودوں میں روحیں موجود دکھائی دیتی تھیں- غالباً ان کا پہلا معبود آسمان تھا- زئیس کے معنی لاطینی

Scanned with CamScanner

ڈیلس اور سنسکرت کے ڈی کی طرح' آسمان کے تھے۔ امریکہ میں بھی آپ کہتے ہیں'
"آسمان ہماری حفاظت کرے!" اور "میں آسمان سے ملتجی ہوں" گویا آسمان اور خدا ہم معنی
الفاظ ہیں۔ سب سادہ دل یہ سمجھتے ہیں کہ خدا بادلوں کے اوپر رہتا ہے۔ تیسری صدی قبل
مسیح میں رواتی مفکر' کرسپس نے خداؤں کی یہ فہرست بنائی تھی' "سورج' چاند' ستارے
قانون اور وہ انسان جو دیوتا بن گئے ہیں۔"

سب سے پہلی رسوم جن کا ہمیں علم ہے' زراعتی رسوم تھیں۔ ان رسوم کا مقصد
زمین کو زرخیز بنانا تھا۔ کیا آپ نے شاہزادی ڈانئی کی کہانی سنی ہے۔ جس نے اپنے آپ کو
ایک مینار میں محبوس کر لیا تھا اور زئیس دیوتا سنہری بارش کا روپ دھار کر اس تک پہنچا
تھا۔ علما یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ان قدیم رسوم سے پیدا ہوئی ہے' جن میں زمین (ڈانئی زمین
کی دیوی تھی) آسمان کے دیوتا کی باران رحمت سے سرسبز و شاداب کی جاتی تھی۔ یقیناً آپ
نے ڈیمٹر اور پرسیفنی کی کہانی سنی ہو گی اور شاید آپ نے برطانوی عجائب گھر میں ڈیمٹر کا
شان دار بت دیکھا ہو۔ ڈمیٹر اناج کی دیوی تھی' اس کی بیٹی پرسیفنی کو کوئی دوبتا برزخ میں
اڑا کر لے گیا' لیکن ڈمیٹر' کے نالہ وبکا کی وجہ سے پرسیفنی کو یہ اجازت مل گئی کہ وہ فصلیں
کاٹنے کے زمانہ میں دنیا میں آ سکے' لیکن موسم سرما میں اسے پھر برزخ میں جانا پڑتا۔

اینڈریو : اگر ہمیں جہنم میں جانا ہی ہے تو یہ بہتر ہے کہ ہم گرمیوں کی بجائے سردیاں
وہاں گزاریں۔

تھیوڈور : یہ کہانی ایک علامتی تمثیل ہے' جس کا اشارہ زمین کی سالانہ زرخیزی اور
شادابی کی طرف ہے۔ سب اساطیر اس لئے بنائی گئی ہیں کہ وہ زراعتی رسوم کی توجیہہ کریں۔
حسین افروڈائٹی' جسے یونانیوں نے بابل کی دیوی اشتر کا پیکر عطا کیا تھا' عہد قدیم کی اناج کی
دیویوں میں سے ایک دیوی تھی اور اس کا میلہ بہار کی بیداری پر مسرت کا اظہار کرنے کے
لئے منایا جاتا تھا۔ یقیناً آپ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ایسٹر' پہلے بہار کا (اور اشتر کا)
میلا تھا۔

میتھیو : کلیسا نے اپنی کبریائی حکمت کے ساتھ' فطرت پرستوں کے تہواروں کو اپنا لیا
اور لوگوں کے رسم و رواج کو مسیحی مذہب کے سانچے میں ڈھال دیا۔

تھیوڈور : افروڈائٹی۔ فطرت اور انسان کی زرخیزی کی ایک حسین علامت تھی۔ قدما'
نسوانی پارسائی کا اتنا احترام نہیں کرتے تھے جتنا کہ جدید زمانہ کے لوگ ....

کلیرنس : تھیوڈور' آپ جدید زمانہ کے لوگوں سے واقف نہیں ہیں۔

Scanned with CamScanner

تھیوڈور: میں محض یہی کہوں گا کہ قدما زمانہ وسطیٰ کے عیسائیوں اور پیورٹنوں کی طرح نسوانی پارسائی کو قابل احترام نہیں سمجھتے تھے۔ وہ صرف عورت کی زرخیزی کی قدر کرتے تھے۔ وہ محبت کی پرستش کرتے تھے۔ سچی جسمانی محبت کی بھی، جس میں کھل کھیلنے کی بیباک کیفیت موجود ہوتی تھی۔ وہ افرو ڈائٹ، یا اشتریا وینس کی طاقت، شان اور حقوق کو تسلیم کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو شخص دیوی کو محبت کے کبریائی جنون کا خراج نہیں دیتا، وہ بدقسمت ہے۔ ایشیائے کوچک کے بعض حصوں میں ہر عورت کا مذہبی فریضہ تھا کہ وہ مندر کے دروازہ پر کھڑی ہو جائے اور اپنا آپ ہر اس اجنبی کے سپرد کر دے، جو اس کی طرف مائل ہو اور پھر اپنی کمائی دیوی کی بارگاہ کی نذر کر دے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا، سر جیمز؟

سر جیمز: مندر ان عورتوں سے بھرے ہوتے تھے جو اجنبیوں کے انتظار میں وہاں کھڑی رہتی تھیں۔ ان میں سے بعض کو کئی کئی سال تک اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا۔

تھیوڈور: ایڈونس بھی بابل کے دیوتاؤں سے اخذ کیا گیا تھا۔ یہودی اسے تمز کہتے تھے اور کبھی کبھی ایڈون، جس کے معنی ہیں۔ آقا یا خدا۔ یونانی یہ سمجھتے تھے کہ یہ لقب، خدا کا نام ہے۔ بابل اور یونان کی روایتوں کی رو سے ایک وحشی سور نے ایڈونس کو قتل کر دیا تھا۔ غالباً وہ پرانے یہودیوں کے حیوان معبودوں کا انسانیت مآبک پیکر تھا۔ سال میں ایک مرتبہ لوگ سور کو ذبح کرتے، اور اسے ایک عام ضیافت میں کھاتے، لیکن پارسا لوگ ایڈونس کا ماتم کرتے اور چند دن کے بعد وہ اس کے احیا کی رسم مناتے۔

سر جیمز، غالباً اس کی موت اور احیا کی روایت ان زراعتی رسوم سے اخذ کی گئی ہے، جن میں زمین کی موت اور احیا کو علامتی انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ مذہب کے نشوونما میں ہر جگہ ایک غیر شخصی قوت کو شخصیت کا جامہ پہنایا جاتا ہے اور پھر ایک دیو مالا جنم لیتی ہے۔

تھیوڈور: یہی حال ڈائیو ینسس کی روایت کا ہے۔ وہ انگور کا دیوتا تھا، جس طرح ڈمیٹر اناج کی دیوی تھی۔ دوسرے زراعتی دیوتاؤں کی طرح وہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہوا، جس طرح زمین خزاں میں مرجھا کر بہار میں پھر ترو تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کی مرگ و احیا کا بھی تہوار منایا جاتا۔ اس رسم سے ڈائیو ینس کا تھیٹر پیدا ہوا۔ اور ایسکلیس، سوفو کلیس، اور یوروپیڈیس کے شاندار ادارے معرض وجود میں آئے۔ یہ ڈرامے ڈائینوسس کی عبادت کا ایک حصہ تھے اور ان کا موضوع ہمیشہ ایک مذہبی نوعیت رکھتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ طربیہ انہیں تہواروں سے پیدا ہوا۔ جلوسوں کے آگے لوگ ذکری علامتیں لے کر چلتے تھے،

Scanned with CamScanner

اور اس ذکری جشن سے، جس میں جنسی مزاح اور جنسی نغموں کی بھرمار ہوتی تھی، طربیہ پیدا ہوا۔ اس لئے آپ ارسٹو فینیز کے بیباک مزاح کو عفو کی نظر سے دیکھیں۔ کوئی باعزت عورت اس کے ڈرامے نہیں دیکھتی تھی۔

سر جیمز: یہ ڈراما محض مردوں کا ڈراما تھا جو بزدیوتا کے اعزاز میں کیا جاتا تھا۔

تھیوڈور: آپ ٹھیک کہتے ہیں، سر جیمز! ڈائینوسس نے ایک مقدس بکرے کی جگہ لے لی تھی، جس طرح دوسرے انسانی دیوتا مقدس حیوانوں کی جگہ لے چکے تھے۔ لوگ ڈائینوسس کی ابتدا نہیں بھوک سکتے تھے۔ وہ اس کی بارگاہ میں ایک بکرے کو قربان کر دیتے اور اسے ایک بکرے کے پیکر میں ڈھالتے۔ اس جلوس کے پیش رو بکرے کی شکل کے نقاب پہنتے۔ مقدس حیوان ہر دیوتا کے تصور کے ساتھ وابستہ تھے۔ ہومر کی شاعری میں خداؤں کو انسانیت بخشنے کے عمل میں آبا پرستی کی جھلک نظر آتی ہے۔ یونانیوں کے لئے انسان اور خدا کے درمیان خلیج ناقابل عبور نہیں تھی۔ ایک عظیم شخصیت دیوتا بن سکتی تھی اور ایک دیوتا ایک عظیم شخصیت بن سکتا تھا۔ دیوتا انسانوں سے ملتے جلتے تھے اور تقریباً ہر لحاظ سے (اپنے محاسن و معائب میں بھی) انسانوں کی مانند تھے۔ ان کا طغرائے امتیاز ان کا غیر فانی ہونا تھا۔

جب مختلف آبا پرست گروہ ایک ریاست میں یک جا ہوتے تو ان کے خدا ایک خاندان کے نظام میں منسلک ہو جاتے۔ بالآخر شعرا نے قدیم روایات کو شعر و سخن کا پر شکوہ جامہ پہنایا اور اولمپس کے دیوتاؤں نے جنم لیا۔

اینڈریو: کبھی آپ نے غور کیا ہے، تھیوڈور! کہ اولمپس کے دیوتا، اپنی حکومت کی تربیت ہمارے صدر کے کابینہ کے نمونہ پر کرتے تھے، مثلاً منرو! سیکرٹری آف سٹیٹ تھا، نپٹون (سینیچ) بحریہ کا وزیر تھا، ڈیمیٹر وزیر زراعت تھا، ہرمیز، ڈاک خانہ کا ڈائریکٹر تھا، مارس، بری افواج کا وزیر تھا، اور ہیرا وزیر داخلہ تھا جس کا کام، زیس یا صدر کی چند زوجگی کے میلانات کو قابو میں لانا تھا۔

تھیوڈور: ہاں، لیکن ان کے اور بھی کئی دیوتا تھے۔ یونانی ہر چیز کا، حتیٰ کہ حادثہ کا بھی دیوتا بنا لیتے تھے۔ سب پرانی اقوام زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ایک دیوتا بنا لیتی تھیں۔ رومنوں نے یونانی دیوتاؤں کو اپنا کر ان کی تعداد کو دوچند کر دیا۔ فضا دیوتاؤں اور جنوں سے لبریز ہو گئی۔ ابی اونا دیوی ان بچوں کی حفاظت کرتی تھی، جو گھر سے باہر ہوتے تھے۔ ڈوی ڈوکا انہیں گھر واپس لے آتی تھی۔ انٹرڈیوکا ان دو حالتوں کے علاوہ دوسری حالتوں میں ان کی حفاظت کرتی۔ کیوبا سونے کی حالت میں ان کی نگہداشت کرتی۔ ایڈوکا، انہیں کھانا

کھانے کی تعلیم دیتی۔ فیبو لونیس انہیں پڑھنا لکھنا سکھاتی۔ سٹیٹینس انہیں کھڑا ہونے کی تعلیم دیتی۔ غرض اسی طرح سینکڑوں اور دیوتا تھے۔ کینی کی تسخیر کے بعد ہنی بال روما کی طرف بڑھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اس نے خواب دیکھا کہ کوئی آواز اسے واپس چلے جانے کو کہہ رہی ہے۔ اس نے اس آواز کی متابعت کی اور ممنون رومنوں نے وہاں ایک دیوتا کی درگاہ بنائی اور اس کا نام رڈیکولس رکھا' یعنی وہ خدا جو لوگوں کو واپس بھیج دیتا ہے۔ ہر کھیتی' ہر گھر اور ہر راہ گزر کا ایک دیوتا تھا۔

اینڈریو: تو کیا نگہبان فرشتوں اور ولیوں کی پرستش ان رومنوں کے دیوتاؤں کی مسیحی میراث تھی؟

تھیوڈور: غالباً۔

اینڈریو: ان تمام دیوتاؤں کی سارے سارے دن پرستش کرتے رہنا کتنی مصیبت کی بات ہوتی ہو گی۔ اناطول فرانس نے بروسون سے کہا کہ مجھے پہلا کبریائی فرمان پسند نہیں کہ "صرف خدائے واحد کی عبادت کرو" میں تمام دیوتاؤں' تمام مندروں اور تمام دیویوں کی عبادت کرنا چاہتا ہوں۔ اناطوال فرانس سب کو اس لئے پسند کرتا تھا کہ اسے ان کی عبادت نہیں کرنا پڑتی تھی' لیکن یونانی اور رومن تو ان سب کی پرستش کرتے تھے۔

تھیوڈور: آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایک عام یونانی اپنے دیوتاؤں سے ڈرتا تھا' اور ان کی رضاجوئی میں خاصا وقت صرف کرتا تھا۔ فطرت پرستی محض عیاشی نہیں تھی' پھر بھی اس مذہب میں حسن اور خرد کی فراوانی تھی۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ فطرت کی قوتوں کو مشخص ہیئت دے دی جائے اور بہت سے دیوتا' خدائے واحد سے اس لئے بہتر ہیں کہ وہ فطرت کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کو اچھی طرح سے ادا کر سکتے ہیں۔ اس ایمان اور عقیدے سے فن کی مختلف شکلیں پیدا ہوئیں۔ تدفین سے بت تراشی اور فن تعمیر پیدا ہوئے۔ مذہبی جلوسوں سے تمثیل پیدا ہوئی اور اس وقت جو مذہبی گیت گائے جاتے تھے' ان سے موسیقی اور شاعری کے فنون نے جنم لیا۔ پھر فن نے مذہب میں حسن بھرنا شروع کیا اور قدیم دیوتاؤں کو شان و شوکت عطا کی ہومر اور ہیسائیڈ نے اولمپس کے دیوتاؤں کو واضح اور متعینہ شخصیت بخشی اور فائیڈیاس نے انہیں عظمت اور تقدس عطا کیا۔ آپ شاید یہ کہیں گے کہ جب فائیڈیاس کے دیوتاؤں نے جنم لیا تو ہومر کے دیوتا مر چکے تھے۔ عوام نے خطرناک اور شہوت پرست دیوتا بنائے تھے۔ فن کاروں نے ان میں بہترین انسانی صفات کے نقش بھرے اور انہیں یونان کے تہذیب و تمدن کے نشوونما کی علامتیں قرار دیا۔ ہیسائیڈ کی

حکایات کا خول آشام زئیس، کس قدر مختلف ہے، اس عظیم الشان قادر مطلق سے جسے ایکلیس کے توانا تخیل نے تخلیق کیا اور سوفوکلیس کی متین حکمت نے اعلیٰ صفات کے جامہ سے آراستہ کیا۔ اکثر کتابوں میں اس حقیقت کا ذکر آتا ہے کہ فن مذہب کا رہین منت ہے، لیکن اس حقیقت کا کوئی ذکر نہیں آتا کہ مذہب فن کا رہین منت بھی ہے۔

تاہم یہ بات یونانی قدامت پرستوں کے حق میں بری ثابت ہوئی کہ ڈراما، ڈائینوسس کی رسوم سے پیدا ہوا، کیونکہ ڈراما، ادب بن گیا اور ادب نے فلسفہ کی شکل اختیار کی اور فلسفہ قدامت پرستی کا تار و پود بکھیر دیتا ہے۔ سوفوکلیس کے ایمان وحدت کے بعد دوسرا قدم یوروپیڈس کا تشکک تھا۔ اس کے دوست پروٹیگورس کے یہ قول قابل ذکر ہے کہ "ہمیں معلوم نہیں کہ دیوتاؤں کا وجود ہے کہ نہیں" آپ نے دیکھا، میرے عزیز کلیرنس، کہ آپ دنیا کے پہلے لاادری نہیں۔

کلیرنس: میرا بھی یہی خیال تھا۔

تھیوڈور: درحقیقت ڈرامے سے ایک خیال پیدا ہوا، جس نے قدیم دیوتاؤں کو مسمار کر دیا۔ اور وہ خیال تھا تقدیر۔ وہ تقدیر جو دیوتاؤں اور انسانوں کی زندگی پر حاوی ہے۔ اس سے عالم گیر فطری قانون کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور مفکروں کا رہین منت ہے۔ علم کی ترقی سے لوگوں نے فطری توجیہات ڈھونڈنا شروع کیں۔ قبل سقراط کے فلسفیوں نے دیوتاؤں کی جگہ پانی، ہوا اور آگ کو لا کھڑا کیا۔ سوفسطائیوں نے لوگوں کو شک کرنے کا اسلوب سکھایا اور فطری توجیہ کے اصول کو حتمی قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہوش مند نوجوان دہریہ بن گیا۔ افلاطون کے عہد میں یونان کا ابتدائی مذہب کھوکھلا ہو چکا تھا۔ "قوانین" میں افلاطون کہتا ہے۔ "چونکہ اکثر لوگ اب خدا پر ایمان نہیں رکھتے، اور حلف بیکار ہو گیا ہے، عدالتوں کو اب محض اثبات و تردید ہی پر اکتفا کرنا چاہیے"

کلیرنس: ہم امریکہ میں بھی بہت جلد اسی مقام پر پہنچنے والے ہیں۔ پھر بھی بعض سادہ لوح لوگ امریکہ کی ترقی کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

پال: آپ نے یہ نہیں بتایا۔ تھیوڈور، کہ سقراط بھی خدائے واحد پر ایمان رکھتا تھا اور عدالت کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے وقت اس نے اپنے اس ایمان کا اعلان کیا تھا۔

تھیوڈور: ہاں! افلاطون کی تحریروں میں ایک شدید مذہبی کیفیت نظر آتی ہے، لیکن سقراط کا خدا، محض ایک سلبی دیو ہے۔ اور ارسطو کا خدا، ایک سرد مہر کمال جو خود ستائی میں مستغرق ہے۔

کلیرنس: ایک قیاس، جو خود نگری میں ڈوبا ہوا ہے۔

تھیوڈور: اور اپی کیورس کے دیوتا بے عمل بادشاہ تھے، جنہیں انسانوں کے معاملات اور مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اریئیل: وہ ایک نہ ختم ہونے والی بزم کی مانند تھے۔

تھیوڈور: اریئیل! کس عمدگی سے آپ نے، مجھے یہ بتایا ہے کہ اب میں اپنا بیان ختم کروں۔ میں صرف ایک دو لمحے اور چاہتا ہوں۔ پر ہو، اور متشککین کے زمانہ تک یونان کے دیوتا مر کھپ چکے تھے۔ وہ صرف ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کے لئے زندہ تھے۔ اب ایک لاادری ثقافت پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے حقیقت کے تجسس کو ترک کر دیا اور تسلیم و رضا پر قانع ہو گئی۔ اس نے فن کی لذتوں اور لذت کے فنون کا مطالعہ کیا اور ایک مائل بہ فنا کائنات کے حسن انحطاط کا مشاہدہ کرنے لگی۔ ایک لحاظ سے یہ یونان کی پختگی کا زمانہ تھا، جیسے تمام متمدن لوگوں نے طامس ہارڈی، جارج میرڈتھ جارج کلیمنسو اور اناطول فرانس کی پختگی سے خوشہ چینی کی ہو۔

پال: فلسفیوں کی فتح ہوئی، لیکن اپنی فتح کے سرور میں وہ ایک بات بھول گئے۔ انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کیا ایک اخلاقی نظام جسے اس کی مافوق الفطرت اساس سے محروم کر دیا جائے انسانوں کو وہ ضبط نفس نہیں سکھا سکتا جو طاقت اور استحکام کے لئے لازمی ہے۔ اس کا انجام وہی ہوا جو غالباً ہماری تہذیب کا بھی ہو گا کہ اخلاق ختم ہو گیا، نفسا نفسی کا دور دورہ ہوا، جرم، خود کشی اور بدکاری عام ہو گئی۔

تھیوڈور: لیکن عوام کے سینہ میں مذہب پھر کروٹیں لینے لگا۔ ڈیلفی اور ڈیلوس کی قدیم بارگاہیں اپلوا کی رسوم اور سکندری فوجوں کی واپسی کے ساتھ یونان میں مشرقی مذاہب کے نفوذ نے، اس شکست خوردہ قوم کے لئے وہ سامان تسکین بہم پہنچایا، جس کی وہ خواہش مند تھی۔ آرفک مسلک پھر مقبول ہو گیا۔ تاریکیاں سب پر حاوی نہیں ہوں گی، نیک لوگ جنت میں جائیں گے، برے لوگ بھی وہاں جا سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے وارث پادریوں کی جیب گرم کرتے رہیں۔

آرفک مذہب یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانی اندوہ، ٹائیٹنس کے اس گناہ کی وجہ سے ظہور میں آیا کہ اس نے خدا کی نافرمانی کی تھی۔ اس ابتدائی گناہ کی وجہ سے روح کو جسم میں مقید کر دیا گیا اور صرف راہبانہ طرز حیات اور پیہم عبادت ہی اسے جسم کے حبس سے نجات دلا سکتی ہے۔ افلاس زدہ لوگوں کو یہ مسلک بہت پسند آیا۔ اجتماعی مذہب ختم ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

لوگوں نے ذاتی نجات کے گن گانے شروع کیے اور دنیوی آلام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا مسلک اختیار کیا۔ الہیاتی عالم، اس شکست خوردہ زندگی سے زیادہ حقیقی بن گیا۔ اس پاکیزگی کے عہد میں مسیحیت آئی۔ اور روح یونان نے روح مشرق کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

اریئیل : شکریہ، تھیوڈور! سر جیمز نے ہمیں مذہب کے آغاز کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں، اور آپ نے ہمیں اس کی موت اور احیا سے باخبر کیا، آیئے اب ہم کھانا کھائیں، کھانا کھاتے ہوئے ہم دیوتاؤں کی تقدیر پر غور کریں گے۔

Scanned with CamScanner

باب بست و دوم

کھانے کی میز پر
کنفیوشس سے مسیح تک

ا۔ کنفیوشس۔

کنگ : میرے عزیز دوست تھیوڈور! آپ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس سے میرے ملک کی خدمت کا پہلو نکلتا ہے، اگر آپ مجھے معاف کریں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ مشرق کے متعلق مغرب کا نظریہ حد درجہ خارجی ہے، آپ ایشیا کے حجم کا بھی تصور نہیں کرتے۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ یورپ اس عظیم براعظم کا محض ایک شاخسانہ ہے۔ اور ایشیا نہ صرف آپ کے مذاہب بلکہ آپ کی زبانوں اور آپ کی نسلوں کا سرچشمہ ہے۔ اگر آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ایشیا ایک نہایت وسیع خطہ زمین ہے تو شاید آپ اس کے متعلق اتنی جلدی کلیہ طرازی نہ فرمائیں، آپ ایک براعظم کے بارے میں یک قلم اس طرح کے فیصلے صادر نہیں کر سکتے۔

ایریئل : بہت خوب، کنگ! ہمیں کچھ اور باتیں بتائیے۔

کنگ : ایشیا کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا مشرق قریب کا اسلامی ایشیا، لیکن وہاں بھی کتنی مختلف نسلیں آباد ہیں! عثمانی ترک، یہودی نژاد عرب اور یہودی، ایرانی اور افغان، قفقازی اور آرمینین۔ دوسرا تصوف پسند ایشیا یا پاک و ہند کا برعظیم جس کے متعلق سدھا ہمیں بہت سی باتیں بتائیں گے۔ تیسرا حصہ سائیبریا جس میں منگول، روسی کوریا اور جاپان کے لوگ شامل ہیں۔ جن کے اختلافات کی وجہ سے ان کے متعلق کوئی کلیہ قائم کرنا آسان نہیں۔ اور چوتھے چین جہاں دنیا کی قدیم ترین اور جدید ترین قوم آباد ہے۔ ہم امریکہ کو اس قدر اہمیت کیونکر دے سکتے ہیں جب کہ اس کی تہذیب محض دو سو سال اور ہماری تہذیب پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ مغرب کی ترقی پسندی اور مشرق کے جمود کے تضاد کا ذکر مضحکہ خیز ہے۔ کتنی مرتبہ چین کی مختلف تہذیبوں میں ترقی کے مسئلہ پر

ہنگامے بپا ہوئے ہیں! چین نے سب مسلک آزمائے ہیں اور ان سے بیزار ہو چکا ہے۔ وہ
پروٹیگورس کی طرح ہے جس نے سب باغیانہ خیالات آزمانے کے بعد رسمی تصورات کی
پابندی شروع کر دی۔ اس نے ان آزمائشوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا' کہ ایک خیال اور
دوسرے خیال' ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں بہت تھوڑا فرق ہے' اس لئے ان میں
سے کسی ایک کے بارے میں اپنے جذبات میں ہیجان بپا کرنا غلط ہے جب تک آپ نے
ہمیں صنعت' جمہوریت اور دولت کی ہوس کا نشہ نہیں پلایا تھا' ہم اپنے رسم و رواج اور
امن کے تواتر سے مطمئن تھے۔ اگر ترقی محض ایک سطحی تبدیلی ہے تو چین ٹھیک کہتا ہے'
کہ ہر رسم اپنی جگہ اچھی ہے' اور ہل جوتنے کی زندگی اتنی ہی اچھی ہے جتنی کہ صنعت
اور تجارت کی پریشان زندگی۔ وہ سادہ کسان جو کھیتی باڑی کرتا ہے اور اپنے آباو اجداد کی
قبور کی حفاظت کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے' اتنا خوش اور مطمئن ہے جتنا کہ دنیا کا کوئی اور
انسان ہو سکتا ہے۔

ایریئل : کنگ ! ہمیں چینی مذہب کے متعلق کچھ بتایئے۔

کنگ : مادام! چین میں ایک مذہب نہیں ہے۔ چین میں بدھ مذہب ہے' اسلام ہے'
بعض لوگ ارواح اور اصنام کی' پرستش کرتے ہیں' بعض مقدس جانوروں کی۔ میں
موخرالذکر کا ذکر نہیں کروں گا کیونکہ اوہام دنیا میں ہر جگہ کسانوں کی زندگی کے ساتھ وابستہ
ہیں۔ سوائے نوجوان قوم پرستوں کے ہر مذہب میں آبا پرستی کا عصر موجود ہے' جس کے
ذریعہ مردے زندہ لوگوں کی زندگیوں پر حاوی ہیں۔ وہاں لاؤزے کا مذہب تاؤ یا صراط' بھی
ہے (جو کہ بڑی حد تک بدھ مت میں جذب ہو چکا ہے۔) (اب بھی نفس کش صوفی پیدا کر
رہا ہے۔ اور وہاں کنفیوشس کا مذہب ہے جو کئی سو سال سے چین کے تعلیم یافتہ طبقے کا
مذہب رہا ہے۔ ان مذاہب میں سوائے اس کے کہ وہ چینی ہیں اور کوئی صفت مشترک
نہیں۔ انہیں مشرقی بھی نہیں کہا جا سکتا' کیونکہ اگر وہ مشرقی تھے تو مسیح اور سقراط بھی مشرقی
تھے۔ لاؤزے کا مذہب بنیادی اصولوں میں مسیح کے مذہب سے بہت ملتا جلتا ہے اور
کنفیوشس کا فلسفہ بڑی حد تک سقراط کے فلسفہ سے مماثل ہے۔ میں آپ کو لاؤزے کے
چند اقوال سناؤں؟

"ظلم کے بدلے رحم کرو۔ بھلے لوگوں کے ساتھ میں بھلائی کروں گا' برے لوگوں کے
ساتھ بھی بھلائی کروں گا تاکہ وہ بھلے بن جائیں۔ وفاداروں کے ساتھ میں وفا کروں گا۔ بے
وفاؤں کے ساتھ بھی میں وفا کروں گا تاکہ وہ وفادار بن جائیں۔ جو دوسروں پر اعتماد نہیں

Scanned with CamScanner

کرتا وہ ان میں اعتماد میں نہیں پائے گا- پیچھے رہو اور تم آگے پہنچ جاؤ گے- جو شخص انکسار سے کام لیتا ہے وہ محفوظ و مامون رہے گا- جو اپنا سر جھکاتا ہے اسے سربلند کیا جائے گا- جو شخص عظمت کا متمنی ہے، وہ انکسار کو اپنی زندگی کی اساس بناتا ہے- جو شخص اپنی طاقت کا شعور رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کمزور بنا کر خوش ہے وہ انسانیت کا مجسمہ ہے- عالم ہو کر بھی اپنے آپ کو جاہل سمجھنا حکمت کا کمال ہے- حکیم اپنے دل کی دولت کا شعور رکھتے ہوئے اس کی نمائش نہیں کرتا- وہ خوددار ہے لیکن اپنے لئے کسی اعزاز کا خواہاں نہیں- فطرت کی ہر چیز خاموشی سے اپنا کام کرتی ہے- وہ معرض وجود میں آتی ہے اور کسی اور چیز پر قبضہ نہیں کرتی- وہ اپنا فرض ادا کرتی ہے اور کوئی دعوئٰی نہیں کرتی- سب چیزیں اپنا فریضہ ادا کر کے ختم ہو جاتی ہیں- جب کوئی چیز اپنے کمال پر پہنچتی ہے تو پھر اپنے ماخذ کی طرف لوٹ جاتی ہے- ماخذ کی طرف رجوع کا مطلب سکون یا تقدیر کی تکمیل ہے- رجعت ایک دائمی قانون ہے- اس قانون کا شعور حکمت ہے- انا کی رضا سے کوئی کام نہ کرو لیکن رضائے مطلق کے مطابق زندہ رہو تو تمہارے سب کام پورے ہو جائیں گے-"

میتھیو: بہت خوب، لیکن اس میں مذہب کا عنصر بہت کم ہے-

کنگ: اس لحاظ سے کنفیوشس میں تو مذہب اور بھی کم ہے- اس نے مافوق الفرطت اصطلاحیں استعمال ہی نہیں کیں اور اسے حیات بعد ممات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی- جب ایک شاگرد نے اس سے پوچھا کہ روحوں کے بارے میں انسان کے فرائض کیا ہیں؟ تو اس نے جواب دیا "ہم زندہ لوگوں کے متعلق اپنے فرائض ادا کرنے سے پہلے مردوں کی روحوں کے متعلق کیونکر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں" اور جب اس شاگرد نے موت کے بارے میں سوال کیا تو کنفیوشس نے جواب دیا- "زندگی کا علم حاصل کرنے سے پہلے ہم موت کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟" انسانی فرائض کو سنجیدگی سے ادا کرنا اور دوسرے لوگوں کا احترام کرنا حکمت کی جان ہے- کنفیوشس کا مذہب وحدت الوجود کا مذہب تھا، جو سپنوزا کے فلسفہ کے بہت قریب ہے- ذرا ان اقوال پر غور کیجئے، کیا یہ سپنوزا کی اخلاقیات کے اقتباس نہیں معلوم ہوتے؟

"حق خدا کا قانون ہے- حق کا مطلب اپنے وجود کا حق ادا کرنا ہے- اخلاقی قانون ہمارے وجود کا قانون ہے- حق کے ذریعہ ہم سے خارجی اشیا وجود میں آتی ہیں- یہ حق مطلق غیر فانی ہے اور غیر فانی ہونے کی وجہ سے یہ اپنے وجود کا سبب خود آپ ہے اور اس وجہ سے لا منتہی ہے- یہ شعور کے بغیر معقول اور ماورائے ادراک ہے- چونکہ یہ لامتناہی

Scanned with CamScanner

اور دائمی ہے۔ یہ سارے وجود میں سمایا ہوا ہے۔"
کنفیوشس نے دنیا کو کوئی دین، کوئی مسلک نہیں بلکہ ایک اعلیٰ اخلاقی نظام عطا کیا، اعلیٰ انسان کا مسلک۔ بعض جگہ اس کے اقوال مسیح کے اقوال سے ملتے جلتے ہیں۔ مسیح سے پانچ سو برس پہلے اس نے کہا تھا، "جس سلوک کی آپ دوسروں سے توقع نہیں رکھتے وہ دوسروں سے روا نہ رکھیں" لیکن وہ سقراط ارسطو اور گوئٹے سے بہت مشابہ ہے۔ وہ اخلاق اور ذہانت کو مترادف قرار دیتا ہے اور انکسار اور نرم مزاجی کی نہیں بلکہ شخصیت کے پورے نشوونما کی تلقین کرتا ہے۔ جب میں چین میں طالب علم تھا تو مجھے اس کے اقوال حفظ کرنے پڑے تھے۔ میں کئی گھنٹے تک آپ کو وہ سنا سکتا ہوں۔
"اعلیٰ انسان کیا ہے؟ جو احترام کے ساتھ اپنی شخصیت کی تربیت کرتا ہے۔ اعلیٰ انسان جانبدار نہیں، کشادہ دل ہوتا ہے۔ عام انسان کشادہ دل نہیں جانب دار ہوتا ہے۔ اعلیٰ انسان سوجھ بوجھ کے ساتھ الفاظ استعمال کرتا ہے، کیونکہ بہت سے لوگ اپنے الفاظ کے باعث تباہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بولنے سے پہلے عمل کرتا ہے اور اپنے قول کو اپنے عمل کے مطابق ڈھالتا ہے۔ وہ مناظرہ نہیں کرتا۔ وہ اعتدلال کی راہ پر چلتا ہے .... ان گنت چیزیں انسان کو متاثر کرتی ہیں۔ جب اس کی پسند اور ناپسندیدگی کسی قانون کے مطابق نہیں ہوتی تو اس کی فطرت خارجی اشیا کی فطرت کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔ اعلیٰ انسان ہر چیز اپنے اندر ڈھونڈتا ہے۔ ادنیٰ انسان ہر چیز دوسروں سے طلب کرتا ہے۔ اعلیٰ انسان پریشان رہتا ہے کہ وہ حق تک کیونکر پہنچے۔ وہ اس لئے فکرمند نہیں ہوتا کہ کہیں وہ مفلس نہ ہو جائے۔ وہ اپنے اندر استعداد کی کمی کی وجہ سے غمگین ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ دوسرے اسے نہیں جانتے۔ وہ صفت جس میں کوئی اعلیٰ انسان کی برابری نہیں کر سکتا، اس کا وہ کام ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔

۲۔ تصوف

سدھا: میرے عزیز کنگ! لیکن یہ مذہب تو نہیں، یہ محض اخلاق ہے اور اخلاق بھی اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے لئے جنہیں اخلاق کی غالباً کوئی ضرورت ہی نہیں۔ مذہب اخلاق کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے اور اس چیز کے بغیر اخلاق ایک ایسی آگ ہے جو دور ہونے کی وجہ سے اپنا حرارت تم تک نہیں پہنچا سکتی۔ مذہب کوئی نظریہ نہیں اور یہ محض کوئی عقلی چیز بھی نہیں۔ یہ ایک احساس ہے جس میں کل کا ادراک روح کو یکایک جذب کر لیتا ہے۔ خود

غرضی کو سپردگی اور علیحدگی کو ربط کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ معلوم نہیں مغرب کے لوگوں پر یہ احساس کبھی طاری ہوتا ہے کہ نہیں؟

فلپ: جیکب بوہم اور سینٹ فرانسس پر یہ احساس طاری ہوا تھا۔

اینڈریو: پال بلڈ کہتا تھا کہ یہ احساس اشیر کے اثر سے طاری ہو جاتا ہے۔

سدھا: یہ مثالیں تو ایسی ہیں جنہیں ہم مستثنیات کہہ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمی یہ ظاہر کرتی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں مذہب کا اثر بہت کم ہے۔ ہندوستان میں' جزو اور کل کے ربط کو مذہب کی جان سمجھا جاتا ہے' کسی شخص کو ہم محض اس لئے متدین نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک نظریہ پر ایمان لے آیا ہے اور اس کی متعلقہ رسوم ادا کرتا ہے۔

ہمارے مذہبی پیشوا یعنی برہمن' اپنے خدا برہما کی نسبت سے برہمن کہلاتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ (برہما) کی ایک شخصیت کے لئے نہیں' بلکہ ایک مکمل حقیقت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ برہمنوں کا یہ عقیدہ ہے کہ صرف برہما ایک لامحدود حقیقت ہے۔ انسانوں کی علیحدگی فریب ہے۔ جب آپ یہ محسوس کریں کہ آپ کی شخصیت پگھل رہی ہے اور آپ بحر وجود میں مطمئن ہو کر تیر رہے ہیں اور اس جذب کے علاوہ ہر چیز آپ کو حقیر معلوم ہو' تب آپ کو معلوم ہو گا کہ مذہب کیا ہے اور خدا کیا ہے۔ آپ خود خدا کا ایک جزو بن جائیں گے۔

ایریئل: مجھے تھورو کا ایک فقرہ یاد آ رہا ہے' "ایک گرم دن جب میں ندی کے ست رو پانی پر بہتا ہوں تو میں زندہ نہیں رہتا' اور وجود پا لیتا ہوں" وہ کہتا ہے کہ جب میں پرندوں کو چہچہاتے سنتا ہوں تو اپنے آپ کو ایک "بڑے حیوان" کا جزو سمجھتا ہوں۔

سدھا: مادام! مجھے یہ قول یاد ہیں۔ یہ کتنے حسین قول ہیں! کیا آپ کو معلوم ہے کہ تھورو ہندو فلسفیوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "چونکہ میں ہندو فلسفہ کو بہت پسند کرتا ہوں' میرے لئے چاول ہی مناسب غذا ہیں۔"

کلیرنس: لیکن یہ لازمی نہیں کہ یہ احساس کل' مذہبی نوعیت ہی رکھتا ہو۔ ایک مرتبہ ایک ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے میں نے دریچہ میں سے نیلے آسمان پر سرخ بادل دیکھے۔ اس عظیم گنبد کے حسن سے میں بے حد متاثر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک مقدس کل کا ایک بے حیثیت جزو ہوں۔ لیکن یقین جانئے کہ میں کوئی مذہبی آدمی نہیں ہوں۔

اینڈریو: محض کل کے ساتھ وصل کا سرور ہی ہندو مذہب کی جان نہیں' اس کے علاوہ

عبادت، جنس اور تثلیث اس کے خاص عناصر ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ کرشن جی مہاراج نے جو اس تثلیث میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، انسان کا روپ دھارا اور دنیا کو نجات دلوا دی۔ اس کے علاوہ ہندو مذہب دیوتاؤں اور دیویوں سے بھرا پڑا ہے۔ رائناخ کہتا ہے کہ "ہندو دیوتاؤں کی آماجگاہ ایک گھنے جنگل کی مانند ہے۔" لوگ احساس کل' کے متوالے نہیں۔ وہ محض ایک دل چسپ لیکن ناقابل یقین افسانہ سننا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو سدھا کا یہ سوفیانہ سرور مرغوب نہیں۔ انہیں یہ افسانہ پسند ہے کہ ایک دیوتا نے ایک سمندر کا سارا پانی پی لیا اور دوسرے نے ایک رات میں دس ہار باکرہ عورتوں کے ساتھ ہم بستری کی۔ اس کے بعد انہیں رسمیں منانے کا چسکا ہے۔ مثلاً وہ گنگا میں اپنے ہاتھ دھوتے ہیں (جیسے گنگا کسی چیز کو پاک کر سکتی ہے) منتر پڑھتے ہیں اور اپنی تقدیر کو ذکری تعویذوں کی کبریائی قوت کے سپرد کر دیتے ہیں۔ سچ بتائیے، سدھا! کیا میں صحیح نہیں کہہ رہا؟

سدھا: جی نہیں! لیکن آپ نے مذہب کی روح اور جسم کو آپس میں الجھا دیا ہے۔ آپ کے فلسفی یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی مشین یا ڈھانچہ ہی اس کی روح ہے، عام لوگ جن کی رسوم کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے کبھی کبھی لمبے روزے رکھ کر اپنے آپ کو نڈھال کر لیتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ فاقوں میں کوئی لذت یا تسکین ہے سوائے اس کے کہ ان کی مدد سے انسان انا' کے احساس سے آزاد ہو کر کل میں جذب ہو جاتا ہے۔ میں نے ان سادھوؤں کو دیکھا ہے جو اپنی مٹھیاں اتنی مدت تک بند رکھتے تھے کہ ان کے ناخن ان کی ہتھیلیوں کو چیر کر دوسری طرف سے باہر نکل آتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ یا بدھ کی مثال لے لیجئے۔ مسیح کی طرح اس نے بھی روایتی مذہب کو معائب و نقائص سے منزہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ان مکھیوں کو مارنے سے انکار کر دیا، جو اس کا ناک میں دم کئے رکھتی تھیں۔ وہ ان شیروں کی طرف بھی مائل بہ کرم تھا، جو ہندوستان میں بہت سے لوگوں کو کھا جاتے تھے۔ عیسائیوں کی طرح وہ جنت اس کا مطمع نظر نہیں تھی جس میں سب خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہے، بلکہ خواہش کی فنا اس کا مقصد تھا تاکہ شخصیت روح کائنات سے ہم آغوش ہو جائے۔ نروان' کا یہی مطلب ہے۔ آپ انا' کے احساس سے پاک ہو جائیں تو آپ کی روح' دائمی حقیقت میں سما جاتی ہے۔

اینڈریو۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب کو نروان' مل جائے گا۔ بدھ مذہب کی دہریت مجھے پسند ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے خدا کے تصور کے بغیر ہی ایک نہایت توانا مذہب تعمیر کر لیا تھا۔

Scanned with CamScanner

سدھا: اگر خدا سے آپ کی مراد ایک عظیم الشان شخصیت ہے تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ لیکن اگر خدا سے مطلب روح کل ہے تو آپ کا بیان صحیح نہیں۔

اینڈریو: میں نے سنا ہے کہ بعض روایات کی رو سے بدھ ایک باکرہ عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر دیوتا کی پیدائش فطری تولید کی توہین کرتی ہے، جو کبھی ہر دیوتا اور دیوی کے وجود کی علامت اور سرچشمہ تھی۔

سدھا: آپ کو ان افسانوں کو سطحی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے اس طرح آپ اس حکمت سے محروم رہ جائیں گے جو ان میں استعارۃ" اور کنایتہ" بیان کی گئی ہے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ یہ باتیں مذہب کی جان نہیں ہیں۔

اینڈریو: آپ کا مطلب ہے کہ یہ باتیں مذہب کے بدن پر مکھیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سدھا: جی ہاں آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ شاید دس بیس سال میں، مغرب کے لوگ مذہب کے معنی سمجھنے لگیں۔ اب آپ مذہب کے معنی نہیں سمجھ سکتے کیونکہ آپ مشینوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور آپ کے خیالات ہمیشہ زر و جواہر کی طرف مائل رہتے ہیں۔ لیکن جنگ صنعت کو تباہ کر دے گی اور یورپ اور امریکہ اندوہ و الم کے محیط میں غرق ہو جائیں گے۔ اس وقت انفرادی دولت اور شخصی تفاخر ختم ہو جائے گا۔ اس رنج و الم کے سیلاب میں لوگ پھر خدا کا شعور حاصل کریں گے۔ خدا کو جو ایک بے نام روح اور زندگی ہے، ایک ہندو مفکر نے خدا کا تصور ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ "خدا وہ عدم ہے، جو درخت کے سارے حصے کاٹ دینے کے بعد رہ جاتا ہے۔" اب بھی جب آپ جسمانی لذتوں اور مادی چیزوں سے تنگ آتے ہیں تو مشرق ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مسیحی سائنس آپ لوگوں میں مقبول ہو رہی ہے، اور ان لوگوں میں جنہیں روح کل سے اپنی جدائی کا احساس ہے تھیوسوف عقیدہ کی کشش بڑھ رہی ہے۔ کسی نہ کسی دن آپ ہندوستان کو اور مذہب کو سمجھ جائیں گے۔

تھیوڈور: آپ شاید صحیح کہہ رہے ہیں، مذہب کی تاریخ روح یونان اور روح مشرق کی پیہم آویزش کی داستان ہے۔

Scanned with CamScanner

۳۔ یہودیت

استھر: میں سدھا کی طرح یہ محسوس کرتی ہوں کہ ہم نے مذہب کے چند اہم عناصر کو نظرانداز کر دیا ہے۔ ہم "خدا کے لئے" کہتے تو ہیں لیکن ہمارے لئے یہ فقط تین الفاظ ہیں۔ حالانکہ مذہب ان الفاظ کے معنی سے دل چسپی رکھتا ہے۔ مذہب یہ چاہتا ہے کہ ہم سب کام خدا کے لئے کریں، انسان کش لذتوں سے محروم رہیں، اور اس آخری اور قطعی نظام یعنی خدا کے لئے اندوہ و الم برداشت کریں۔ یہی بات مذہب کا نچوڑ ہے اور اس کے بغیر اخلاق بے جان مشین کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی کی بدولت یہودی مذہب دوسرے مذاہب سے ممتاز ہے۔

اریئل: ہاں، مجھے افسوس ہے کہ ہم نے مذہب کے بارے میں اتنی باتیں کیں اور دنیا کی سب سے زیادہ مذہبی قوم کا ذکر نہیں کیا۔ استھر، تم ہمیں یہودی مذہب کے اصولوں کے متعلق کچھ بتاؤ۔

استھر۔ یہ داستان شروع سے آخر تک حسین نہیں ہے، کیونکہ اس نہایت سنجیدہ مذہب کی ابتدا نظریہ روح مظاہر اور توہمات میں دبی ہوئی ہے۔ ابتدائی یہودی چٹانوں، مویشیوں، بھیڑ بکریوں اور غاروں اور کنوؤں کی روحوں کی پرستش کرتے تھے۔ وہ علامتوں کو پرستش کرتے تھے اور ان کے یہاں ایک وحشیانہ قسم کے جادو کا استعمال عام تھا۔ حتیٰ کہ وہ ایک بکس میں پانسے پھینک خدا کی مرضی کا پتا چلانے کی کوشش کرتے تھے،

اینڈریو: ہم آج بھی خدا کی مرضی معلوم کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلتے ہیں۔

استھر۔ اس مذہب میں ذکری علامتوں کی پرستش کا بھی رواج تھا۔ سانپ اور بیل کو ذکر، علامتیں سمجھا جاتا تھا اور بال دیوتا نر اصول کا پیکر تھا۔ جس کا کام مادہ زمین کو زرخیز اور شاداب بنانا تھا۔ تقریباً تمام یہودی تہوار زراعتی رسوم سے پیدا ہوئے ہیں۔ مزاتھ کا تہوار جو کی فصل کاٹنے سے متعلق تھا۔ شبواوتھ گندم کی فصل کو کاٹ چکنے پر منایا جاتا تھا اور سکوتھ میں انگوروں کے توڑنے کی خوشی کا اظہار کیا جاتا تھا، بھیڑ بکریوں کے پہلے بچوں کی پیدائش سے تعلق رکھنے والا تہوار تھا۔ ایک بھیڑ کو ذبح کیا جاتا اور اس کے گوشت پر ایک ضیافت قائم ہوتی۔ اور اس کا لہو دروازے پر چھڑکا جاتا تاکہ حریص خدا کی حرص پوری ہو۔ اس کے بعد اس رسم کا مطلب یہ نکالا گیا کہ خدا نے مصریوں کے پہلے بچوں کو قتل کروا دیا تھا لیکن یہودیوں کی پہلی اولاد کو اس طرح محفوظ رکھا کہ ان کے دروازوں پر بھیڑ کا خون چھڑک دیا۔ لیکن یہ توجیہہ مذہبی پیشواؤں کی من گھڑت تھی۔ یہ رسم کنعانیوں سے لی گئی

تھی جو، بھیڑ کے بچے کو دیوتا کی بارگاہ میں قربان کرتے تھے۔ ابتدا میں بھیڑ کنعان کے ایک قبیلہ کا ٹوٹم تھی، اور پھر یہ مسیحیت میں مسیح کی علامت بن گئی۔ اس مذہب میں دوسرے ٹوٹموں کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ یہوداہ کو اکثر بیل کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور سور کا گوشت یہودیوں کے لئے اس لئے حرام ہے کہ سور ابتدائی یہودیوں کا ایک ٹوٹم تھا۔

اینڈریو : کیا کہا؟ میں سمجھتا تھا کہ اس خیال کی بنیاد حفظان صحت کے کسی اصول پر ہے اور تمام مشرق قریب میں سور اس لئے حرام ہے کہ اس کے کھانے میں مہلک امراض پیدا ہوتے ہیں۔

استھر : رابرٹسن سمتھ اور سلومن رائناخ، جو ایک دوسرے سے بہت کم اتفاق کرتے ہیں اس روایتی توجیہہ کو بیک زبان مسترد کرتے ہیں۔ انجیل میں کہیں بھی کسی مرض کو غلیظ جانوروں کے گوشت سے منسوب نہیں کیا گیا۔ مرض ہمیشہ روحوں کے غیض و غضب سے پیدا ہوتا رہا ہے اور صحیح علاج بدروح کا بدن سے اخراج ہے۔ حفظان صحت ایک یونانی تصور ہے۔ اینڈریو ! آپ کو معلوم ہے کہ رائناخ، حفظان صحت کے خیال کو حرمت خنزیر کا سبب قرار دینے کو جہالت کا اظہار سمجھتا ہے۔

اینڈریو، میں نے یہ توجیہ رینان کی ایک تصنیف میں پڑھی تھی۔

استھر۔ رائناخ نے رینان کا مذاق اڑایا ہے۔

اینڈریو : کسی دن ماہرین علم انسان، رینان کا مذاق اڑائیں گے۔ میں ان مستند حضرات کے ناموں سے متاثر نہیں ہوا۔ یہودیوں کے اخلاقی نظام میں حفظان صحت کے بہت سے عناصر موجود ہیں، اس لئے حرمت خنزیر کو حفظان صحت کے خیال سے منسوب کرنا کوئی ایسی غیر معقول بات نہیں۔ لیکن آپ اپنی بات جاری رکھئے۔ ہو سکتا ہے کہ میں غلط کہہ رہا ہوں۔

استھر۔ موسوی نظام میں "دس احکام" کی فہرست ایک ایسا عنصر ہے جو حفظان صحت کے اصول سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے۔ لیکن یہ احکام بھی ایک وحشیانہ سادگی سے آراستہ تھے۔ ان کا موضوع قبیلہ پروری ہے انسانیت کا احترام نہیں۔ انہیں پیغمبروں کا انتظار کرنا تھا۔ "تم قتل نہیں کرو گے" اس حکم کا یہ مطلب نہیں کہ یہودی جنگ نہیں کریں گے، کیونکہ بسا اوقات یہوداہ نے قتل عام کا بھی حکم دیا ہے۔

کلیرنس : وہاں! جیسا کہ خداوند نے موسیٰؑ کو حکم دیا تھا۔ اور اس کے مطابق انہوں نے مدیانیوں سے جنگ کی، اور سب مردوں کو قتل کر دیا ...... موسیٰؑ ان سے کہنے لگا کیا تم

نے سب عورتیں جیتی بچا رکھی ہیں ...... اس لئے ان بچوں میں جتنے لڑکے ہیں سب کو مار ڈالو، اور جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں ان کو قتل کر ڈالو۔"

اسمتھ: ہاں، اور اس وحشت و بربریت ہی سے انسان کی بعض بہترین اخلاقی اقدار نے جنم لیا۔ موسوی نظام اس ترقی کا ایک نہایت اہم سبب تھا۔ اس نے یہودیوں کے کردار کو استحکام بخشا اور باقاعدگی اور فلسفیانہ رحمت کشی کی تعلیم سے ان میں یہ قوت پیدا کی کہ ان مصائب اور آلام کا بہادری سے مقابلہ کریں جو بعد میں مسیحی دنیا نے ان پر نازل کیے۔ یہ پہلا نظام تھا جس نے پارسائی کے بعد صفائی کو اہمیت دی۔ اور انسانی جسم کو وہ حرم سمجھا جس کی نگہداشت مذہبی خلوص اور سپردگی کے ساتھ کرنی چاہئے اکثر اوقات لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ نظام حمورابی کے نظام سے بہتر نہیں ہے۔ لیکن یہ پہلا نظام تھا جس نے غلاموں کے ساتھ نرمی کے برتاؤ کی تلقین کی اور اس کے جشن طلائی کے ادارہ میں تو ہمیں اشتراکیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ "زمین ہمیشہ فروخت نہیں ہوتی رہے گی، کیونکہ میں زمین کا مالک ہوں ...... اور تم پچاسویں سال کو مقدس سمجھو گے اور سب باشندوں کے لئے آزادی کا اعلان کرو گے۔ یہ تمہارے لئے ایک تہوار ہو گا، اور تم ہر شخص کو اس کی ملکیت لوٹا دو گے اور ہر شخص کو اس کے کنبہ میں بسا دو گے۔" یہ یہودیوں کا عمل نہیں، محض نصب العین تھا، لیکن دوسری قومیں اس نصب العین سے بھی محروم تھیں۔

آپ نے خون آشام خدا، یہوداہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ جنگ کا دیوتا تھا۔ اور ابتدائی یہودیوں کا ایک قبائلی خدا۔

یرمیاہ نے کہا۔ "اوہ، یہوداہ، تمہارے شہروں کی طرح تمہارے دیوتا بھی متعدد ہیں۔ اور جب نعودمی نے روت سے کہا: "تمہاری بہن تمہارے لوگوں اور تمہارے خداؤں کے پاس واپس چلی گئی ہے" تو روتھ نے جواب دیا: تمہارے لوگ میرے لوگ ہیں اور تمہارے خدا میرے خدا ہیں۔" قبیلہ سے انتقال کرنے کا مطلب دیوتاؤں کو بدلنا تھا۔ یہ "چند خدائی" اس زمانہ تک قائم رہی جب کہ پیشاٹیوک لکھی گئی اس لئے کہ تخلیق کائنات کی کہانی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ یہوداہ نے یہ دنیا تخلیق کی اور اس کے بعد ایلوہیم نے (اور ایلوہیم کا مطلب بہت سے خدا ہے) تخلیق کائنات اور جنت العدن کی کہانی ایشیائے کوچک کی مختلف قوموں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ محض پادریوں کا واہمہ تھا کہ یہ کائنات ۷۰۰ قبل مسیح میں تخلیق ہوئی۔ یہ کہانی ایرانیوں، فینیشیوں، کلدانیوں اور بابل کی مذہبی روایتوں میں موجود ہے۔ ۸۰۰ قبل مسیح میں ہسائیڈ نے اس یونانی روایت کا ذکر کیا

Scanned with CamScanner

ہے کہ مبارک لوگوں کے جزیرہ میں ایک درخت پھوٹا جس کی ٹہنیوں پر سونے کے سیب لگے جو انسانوں کو بقام و دوام بخشتے تھے۔

سدھا : ہمارے یہاں بھی اسی قسم کی ایک روایت ہے۔ وید میں لکھا ہے کہ شوجی مہاراج نے آسمان سے ایک انجیر کا درخت پھینکا' اور عورت سے کہا کہ وہ مرد سے کہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے دوام حاصل ہوتا ہے اور اس طرح مرد کی آزمائش کرے۔ مرد نے وہ پھل کھا لیا اور شوجی نے اس پر لعنت بھیجی اور درد و اندوہ کو اس کی قسمت بنا دیا۔

کنگ : قدیم چین کی ایک کتاب 'چی کنگ' میں یہ لکھا ہے :

"سب چیزیں پہلے مردوں کے ماتحت تھیں۔ لیکن عورت نے اپنی ہوس علم سے ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ ہمارے آلام کا سبب آسمان نہیں بلکہ عورت ہے۔ آہ' بدنصیب عورت! تم نے وہ آگ سلگائی جو ہمیں بھسم کر رہی ہے اور یہ آگ روز بروز بڑھ رہی ہے۔"

فلپ : ان روایتوں کے پس منظر میں یہ احساس موجود ہے کہ جنس اور علم بدی کے سرچشمے ہیں' جو ایک معصومیت کی شادمانی کے جانی دشمن ہیں۔ یہ موضوع پوری انجیل میں شروع سے آخر تک جاری و ساری ہے' اسی ضمن میں عورت کی تفضیحیک کے سلسلے میں یہ پر معنی فقرہ بھی ہے' کہ "جو شخص علم میں اضافہ کرے گا وہ دکھ میں اضافہ کرے گا۔" مسیح نے بھی جنسی محبت کی مذمت کی ہے اور بچوں کی حکمت کو سراہا ہے۔

کلیرنس : اس میں شبہ نہیں کہ ان باتوں میں خاصی صداقت ہے۔ کیا ہم اب اس وقت کے مقابلے میں جب ہم علم سے محروم تھے زیادہ غمگین اور افسردہ نہیں ہیں۔ ہم چھوٹے بچوں کے معصوم چہروں کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ غالباً اس لئے کہ وہ جنس اور علم دونوں کی قید سے آزاد ہیں اور یہ چیز ہمارے لئے باعث رشک ہے۔ لیکن' ا-ستھر! ہم آپ کے بیان میں مخل ہو رہے ہیں۔

ا-ستھر : صرف دو باتیں اور باقی رہ گئی ہیں۔ یہودی وحدت ربانی کے قائل تھے اور انہوں نے معاشرتی عدل کی تلقین کی۔ ان ابتدائی دیوتاؤں کی قبائلی حیثیت دراصل قبیلہ کی اقتصادی خود اختیاری اور علیحدگی پر مبنی تھی۔ جب قبائلی زندگی میں تجارت کی نشوونما ہوئی اور اقتصادی حیثیت سے لوگوں کو ایک دوسرے کا محتاج ہونا پڑا تو قبائل آپس میں مل گئے اور مختلف دیوتاؤں کے خصائل بھی ایک دوسرے میں رس بس گئے۔ آخرکار قبائلی طرز فکر

Scanned with CamScanner

سے ہٹ کر ساری انسانیت کے بارے میں سوچنا ممکن ہو گیا اور اس طرح خدائے واحد کے تصور نے جنم لیا۔ ۔سعیاہ نے سب سے پہلے اس عظیم خدا کا ذکر کیا۔ "خدائے عظیم کو دیکھو۔ جس نے اپنی ہتھیلی پر تمام پانیوں کو سنبھال رکھا ہے، جس نے افلاک کی گردش کو معین کیا ہے اور جو زمین کی خاک کو اپنی مٹھی میں لے کر پہاڑوں اور چٹانوں کو ترازوں کے پلڑوں میں تولتا ہے ...... ' دیکھو کہ اقوام اس کے لئے ایک مشکیزہ میں پانی کے ایک قطرے کی مانند ہیں ...... دیکھو کہ وہ جزیروں کو اس طرح اٹھاتا ہے جیسے وہ کوئی چھوٹی سی چیز ہوں۔" اس کے بعد ایواب نے خدا کا تصور اس طرح باندھا کہ وہ نظام کائنات ہے۔ اس منزل پر یہودیوں کا مذہب جو جادو اور توہمات سے شروع ہوا تھا' سپینوزا کی بلند نظری کے قریب جا پہنچا اور اس نے جدید سائنس کی بنیادیں تعمیر کیں۔ لیکن وحدت خدا سے زیادہ اہم انسانیت' ترک جنگ اور اجتماعی عدل کے تصورات کی تخلیق تھی۔

کلیرنس : ترک جنگ؟ ہم ابھی تک یہ غور کر رہے ہیں کہ اس کے متعلق غور کریں کہ نہ کریں۔

ایستھر۔ عاموس یروشلم میں آیا' دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ اور انسان کے نئے مذہب کا اعلان کرنے لگا۔ "چونکہ تم غریبوں پر ستم کرتے ہو اور ان سے گندم کا خراج لیتے ہو، تم نے ترشے ہوئے پتھروں کے مکان بنائے ہیں' لیکن تم ان میں رہ نہیں سکو گے۔ تم نے انگور کی فصل تیار کی ہے' لیکن تم اس کی شراب نہیں پی سکو گے۔ لعنت ہے ان پر جہاں یہاں آرام سے رہتے ہیں' جو مرمریں بستروں پر لیٹتے ہیں اور جو صوفوں پر استراحت کرتے ہیں۔" بارگاہوں میں قربانیاں دینے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ خدا ان سے کہے گا: "میں تمہارے تہواروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اگرچہ تم میرے لئے لذیذ غذاؤں کے تحفے لاتے ہو' میں انہیں قبول نہیں کروں گا۔ میں تمہارے نغموں کے شور سے بیزار ہوں۔ اپنے ساز اٹھا لے جاؤ' لیکن انصاف اور نیکی کی راہ صاف کرو۔ یا دیکھئے ۔سعیاہ کیا کہتا ہے۔

"خدا عوام کے بادشاہوں اور حاکموں سے محاکمہ کرے گا۔ تم نے انگور کی ساری فصل ہضم کر لی۔ تم نے مفلسوں کا حق چھین لیا اور اپنے گھر بھر لیے۔ تم کیوں لوگوں کو مارتے پیٹتے ہو اور مفلسوں کو خاک میں روندتے ہو۔ لعنت ہے ان لوگوں پر جو کئی گھروں اور کئی کھیتوں کو ملا کر ان پر ملکیت حاصل کرتے ہیں۔ تم محاکمہ اور محاسبہ

کے دن اور اس تنہائی اور بربادی کے دن کیا کرو گے۔ جو دور سے تم تک پہنچے گا؟ تم اس وقت کس کو مدد کے لئے پکارو گے اور اپنی شان و شوکت کو کیا کرو گے؟ خدا نے کہا۔ تمہاری قربانیوں کی کثرت تمہیں کیا فائدہ پہنچائے گی؟ میں بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کی قربانیوں سے تنگ آگیا ہوں۔ میری روح تمہاری ضیافتوں سے متنفر ہے۔ وہ میرے لئے دکھ کا باعث ہیں، میں انہیں قبول نہیں کرنا چاہتا۔ جب تم اپنے ہاتھ میری طرف پھیلاؤ گے تو میں اپنی آنکھیں بند کر لوں گا۔ ہاں، جب تم مجھ سے دعا مانگو گے تو میں اسے نہیں سنوں گا۔ تمہارے ہاتھ خون آلود ہیں۔ انہیں دھوؤ تاکہ تم پاک ہو جاؤ، میری آنکھوں کے سامنے سے اپنے اعمال یا بدی کو دور لے جاؤ۔ گناہوں سے احتراز کرو، نیکی کرنا سیکھو، شعور حاصل کرو، مظلوموں کی مدد کرو۔ یتیموں پر رحم کرو، بیواؤں کی وکالت کرو۔"

اینڈریو: بہت خوب، کتنی زوردار زبان ہے!

ا-ستھر: تاریخ مذہب اور تاریخ ادب میں اس سے زیادہ خوب صورت تحریر نہیں ہے۔ رینان نے کہا تھا کہ یونانیوں نے ذہن کو حریت بخشی لیکن یہودیوں نے انسان اخوت عطا کی۔ یونان کے پاس ثقافت تھی۔ لیکن اس کے پاس دل نہیں تھا۔ اس کے فلسفیوں نے بھی غلامی کے نظام کی حمایت کی۔ یونانیوں نے فن اور سائنس تخلیق کیے لیکن یہودیوں نے دنیا کو معاشرتی عدل اور حقوق انسانی کے تصورات دیئے آج وہ مغربی قومیں جنہوں نے اسے فتح کیا تھا اور اس پر ظلم ڈھائے تھے، روحانی طور پر اس کے آگے سر جھکاتی ہیں اور ان اقدار کی آرزو کرتی ہیں جو اس نے دنیا کو عطا کی تھیں۔

اینڈریو: -سعیاہ سے ٹراٹسکی تک!

ا-ستھر: ہاں، مسیحیت کی موت کے بعد اشتراکیت دنیا کا مذہب ہو گی۔

۴۔ مسیحیت

اریئیل: تم بہت اچھی ہو، ا-ستھر! تم نے میرے دل میں اپنی قوم کے لئے فخر و مباہات کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔ اب آپ میں سے کون ہمیں مسیحیت کے متعلق باتیں بتائے گا؟

Scanned with CamScanner

شوخ اینڈریو! تم نہیں، کیونکہ تم اس میں صرف کیڑے ڈالو گے۔ میتھیو! تم بھی نہیں، کیونکہ تمہیں مسیحیت سے بہت محبت ہے۔ فلپ! تم، اگر چاہو تو غیر جانب دار ہو سکتے ہو، تم ہمیں تاریخی پس منظر بتاؤ پھر ہم باقاعدہ جنگ کریں گے۔

میتھیو: میں نے ابھی تک سب کچھ نہایت صبر سے سنا ہے، لیکن میں اب اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مذہب کے تقابلی مطالعہ کی بارگاہ پر ہر مذہب کی انفرادیت کو قربان کیا جا رہا ہے۔ فلپ ہمیشہ غلط بات کہتا ہے لیکن میں اسے قابل عفو سمجھتا ہوں۔

فلپ: متیھیو! تم ایک سچے مسیحی کی طرح باتیں کرتے ہو لیکن تم جلد ہی اپنی نیک دلی پر نادم ہو گئے، مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ ایریئل مسیحیت کو ایک جامع پس منظر میں دیکھنا چاہتی ہے۔ بقول شخصے، تناظر ہی سے کسی واقعہ کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ مسیحیت تاریخی واقعات کے دو رجحانات سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک، یروشلم، سکندریہ، انطاکیہ ایتھنز اور روما میں ایک بے بس اور نومید پرولتاریت کا صنعتی اور تجارتی تصرف، دوسرے یہودیوں کی اخلاقی اقدار کا یونانیوں کے فلسفہ اور دینیات سے ربط او امتزاج۔

سلیمان کے زمانہ سے یروشلم ان تجارتی شاہراہوں کا مرکز بن چکا تا، جو خلیج فارس کو فینیشا، بحیرۂ روم کو شام اور بابل کو فارس سے ملاتی تھیں۔ ان آسانیوں کی وجہ سے یہاں کے یہودیوں نے اپنی تجارت کو ترقی دی۔ اور دولت کی فراوانی سے امیر اور غریب کے درمیان خلیج بہت وسیع ہو گئی، وہ یہودی جو بابل سے واپس آئے تھے قلاش تھے۔ یونانی اور رومی فوجیں حملہ آور ہوتیں اور یہاں کے ہزاروں غریب جوانوں کو غلام بنا کر لے جاتیں۔ مسیح کے بچپن کے زمانہ میں رومن ناصرہ کے آس پاس بہت سے شہروں کی آبادی کو غلام بنا کر فروخت کر چکے تھے۔ بحیرۂ روم کی بڑی بندرگاہوں میں ہر جگہ ایک مفلس اور قلاش طبقہ جنم لے رہا تھا، اور ان میں ایک ایسا مذہبی تصور پیدا ہو رہا تھا و ان کے آقاؤں کے خلاف جاتا تھا۔ امیر لوگ اگرچہ وہ پوشیدہ طور پر لاادری تھے لیکن بظاہر متداول مذہبی رسوم کی حمایت کرتے تھے۔ مفلس لوگوں نے ایک ایسا اخلاقی نظام بنایا جس کے نزدیک ان کے ناتوانی، بدنصیبی اور افلاس ایک خوبی تھی۔ انہوں نے ایک ایسا ضابطہ دین تیار کیا تھا جس کی رو سے مفلس جنت میں اور ارباب دولت جنہم میں جائیں گے۔ اسی بنا پر نیٹشے نے مسیحیت کی مذمت کی کہ یہ ایک طاقتور انسان پر ایک کمزور انسان کی فتح کی علامت ہے۔ پرولتاریت ایک ایسے مذہب کے لئے تیار تھی جو مظلوم کی حمایت کرے، نرم دلی اور

منکسرالمزاجی کی تلقین کرے اور ایک ایسی بہشت کی بشارت دے جو اس دنیا کے بدنصیبوں کو جاودانی مسرت عطا کرے۔ جدید مسیحیت کے لئے یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ وہ امیروں کی دولت اور غریبوں کی محبت کو کسی طرح ہم آہنگ کرے۔

میں مسیح کی اخلاقیات اور اشتمالیت کو اس ناانصافی اور افلاس کے پس منظر میں دیکھتا ہوں۔ یقیناً مسیح ایک اشتمالی تھا' کیونکہ اس کا یہ ایمان تھا کہ زندگی کی تمام بنیادی ضروریات سب کی ملکیت ہیں اور امیروں کو چاہئے کہ اپنی دولت میں غریبوں کو برابر کا شریک بنائیں۔ بقول نیطشے' مسیح اگر زندہ ہوتا تو اسے سائبیریا بھیج دیا جاتا' لیکن امیر یا غریب جو بھی اس کی سادہ داستان پڑھتا ہے اس کی طرف مائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ یقیناً تاریخ کی سب سے زیادہ پراثر شخصیت ہے۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ اس کی تعلیمات بعد میں ایک دین اور کلیسا کے ساتھ وابستہ ہو گئیں' اس لئے کہ جب اس دین اور کلیسا کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے گا تو لوگ غالباً انسانیت کے اس عظیم ترین معلم کو بھول جائیں گے۔

اس کا اخلاقی نظام' اپنی سادگی اور اصلیت کے اعتبار سے' بہترین یہودیوں کی اخلاقی اقدار کا ترجمان تھا۔ کلاوسز نے ہمیں بتایا ہے کہ مسیح اپنے زمانے کی روح سے علیحدہ نہیں تھا۔ اسے اسرائیل کے پیغمبروں اور اخلاقی معلموں کی بیباک گھن گرج ورثہ میں ملی تھی۔ پال جو مسیح سے پہلے گزرا ہے مسیح کی طرح کہتا ہے' "اپنے ہمسایہ پر اخلاقی حکم نہ لگاؤ جب تک کہ تم اپنے آپ کو اس کی حالت میں رکھ لو۔" "میرا انکسار میری سربلندی ہے اور میری سربلندی ہی میرا انکسار ہے۔" "دوسروں سے ایسا سلوک نہ کرو جو تم نہیں چاہتے کہ وہ تم سے کریں۔ یہ ہے قانون کی اصلیت' باقی سب تفسیر ہے' ویلو ہاؤس نے کہا "مسیح مسیحی نہیں تھا وہ ایک یہودی تھا۔" رینان نے کہا۔ "مسیحیت' یہودیت کا ایک کارنامہ ہے' اور بقول ہائنے یہ ایک یہودی بدعت تھا۔"

بہرحال اس نے یہودیت میں ایک ایسے عقیدے کا اضافہ کیا جو مسیح کی شخصیت اور زندگی کے ساتھ' مسیحیت کو مقبولیت کی توجیہہ کرتا ہے۔ اپنی تبلیغ کی ابتدا میں مسیح نے آخرت کا بہت کم ذکر کیا۔ اس نے خدا کی بادشاہت کا اس طرح ذکر کیا کہ گویا وہ زمین ہی پر حاصل ہو جائے گی۔ بشرطیکہ ہم روح کو ایک بے لوث پاکیزگی میں بسا لیں۔ بقا کا تصور یہودی مذہب کا لازمی عنصر نہیں ہے' اپنے اقتدار کے زمانے میں یہودیوں نے اس تصور کو غیرلازمی قرار دیا تھا کیونکہ وہ کہتے تھے کہ فرد کو اجتماع میں سما جانا چاہئے۔ اور انفرادی نجات کے بجائے ریاست کی فلاح و بہبود کی فکر کرنی چاہئے۔ ایوب اپنی نسل کا پہلا شخص تھا جس

Scanned with CamScanner

نے شخصی بقا کے تصور پر غور کیا کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ جب تک میں یہ نہ جانوں کہ خدا اس دنیا میں ایک عدل پسند انسان کی بدنصیبی کا بدلہ اسے ایک دوسری دنیا میں دے گا میں ایک اچھے خدا پر ایمان نہیں لا سکتا۔ جب یہودی فتح کی طرف سے مایوس ہو گئے تو ان کی مقدس کتابوں میں ایک ایسی جنگ کا ذکر آنے لگا جس میں اعمال کا انتقام یا انعام ملے گا۔ یہی حال مسیح کا تھا۔ جب وہ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت قائم کرنے سے مایوس ہو گیا تو اس نے اس بادشاہت کو بہشت میں منتقل کر دیا اس نے روز حشر کا ذکر اس طرح کیا کہ اس دن نصف انسانی نسل' جس میں دنیا کی اکثر حسین عورتیں بھی ہوں گی' ایک ایسی ابدی جہنم کے سپرد کی جائے گی جس کی آگ کبھی نہ بجھے گی اور انسان کبھی نہیں مرے گا۔

میتھیو: تمہارے اس خاکہ میں مجھے خدا کا نرم دل بیٹا کہیں نظر نہیں آتا۔

فلپ: غالباً ہم دونوں کے خاکے غلط ہیں۔ فلسفے کا ایک حسن یہ ہے کہ اس کی کوئی بات یقینی نہیں ہے' اس لئے فلسفی نہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور نہ لوگوں کو جنگ اور مردم کشی کی آگ میں جھونکتے ہیں۔ اگر مسیح کے آخری زمانے میں مجھے اس کی تعلیمات میں ایک عجیب سی تلخی نظر آتی ہے تو وہ اس لئے کہ میں اس کے اخلاقی عقیدوں کی روشنی میں اس کے کردار کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ اخلاقی عینیت' میرے نزدیک مسیحیت کی جان ہے اور یقیناً انسان کو مہذب بنانے کی بہترین کوشش ہے میں اس معجزے پر اکثر حیران ہوتا ہوں کہ بندر اور جنگل سے ایک ایسا انسان پیدا ہوا' جس میں ساری کائنات کے متعلق سوچنے' اس سے محبت کرنے اور اس کے لئے دکھ اٹھانے کی صلاحیت تھی۔

میتھیو: کیا تم نہیں سمجھتے' فلپ کہ صرف کوئی دیوتا (یا خدا) ہی کہ اس طرح دکھ برداشت کر سکتا اور محبت کر سکتا تھا۔

فلپ: اس ضمن میں بھی ہم متفق نہیں ہیں۔ مسیح کے اخلاقی عقیدہ میں بھی بہت سے قابل اعتراض عناصر موجود ہیں۔ ہم میں سے بہت کم لوگوں میں یہ جرات ہے کہ ہم علی الاعلان یہ کہہ سکیں کہ مجموعی طور پر مسیح کی اخلاقی تعلیم ناقابل عمل ہے۔ ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنی زندگی کے متعلق یہ سوچنا چھوڑ دیں کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے۔ ہم ہوا کے طیور یا باغ کے پھولوں کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ ہمسایوں سے اس طرح محبت کرنا جس طرح ہم اپنے آپ سے کرتے ہیں مشکل ہے اور دشمنوں سے محبت کرنا تو بالکل ناممکن ہے۔ فطری انتخاب اور جہد البقا کے اصولوں کے ماتحت جینے والوں انسانوں کی دنیا میں عدم تشدد جارحانہ ظلم اور استعماریت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

Scanned with CamScanner

وہ قوم جو اپنے دشمنوں سے محبت کرتی ہے حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔

کنگ : لاؤزے نے بھی کہا تھا، "اپنے دشمنوں سے محبت کرو" لیکن کنفیوشس نے جواب دیا، "تو پھر رحم و کرم کا معاوضہ کیونکر ادا کرو گے۔ نیکی بدلے نیکی کرو، لیکن بدی کے بدلے انصاف کرو۔"

پال : آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اگرچہ مسیح کے عقائد بحیثیت مجموعی ناقابل عمل ہیں، وہ ایک بربریت زدہ انسانیت کی تہذیب کے لئے بالکل ضروری تھے۔ مسیحیت ہماری نسل کی فطری وحشت کو اعتدال کی سطح پر لے آئی۔ اور دو ہزار برس کی تبلیغ سے انسان کے کردار میں کچھ نہ کچھ فرق پڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم یونانیوں اور رومنوں سے زیادہ رحم دل۔ فیاض اور امن پسند ہیں۔ ہم نے غریبوں پر استحصال بیجا کرنے میں کمی کر دی ہے، بربریت میں گداز اور نرمی پیدا کی ہے اور انسان کی شخصیت کو بلند و ارفع بنایا ہے۔

فلپ۔ میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ جب مسیح نے اس اعلیٰ رطز عمل کی تبلیغ کی تو اس کے ذہن میں اپنے مرید اور پیرو تھے۔ وہ انہیں ایسی راہبانہ تعلیم دینا چاہتا تھا کہ ان کی شخصیت دنیا کی تحریص و ترغیب گناہ کے خلاف مستحکم ہو جائے۔ اسی طرح افلاطون نے اپنے فلسفی۔ ملوک کو راہبانہ اشتمالیت کی تعلیم سے انسانی خامیوں سے محفوظ رکھنا چاہا۔ مسیح اپنے پیروؤں سے کہتا ہے کہ تم شادی نہ کرو اور چیزوں کی ملکیت کی ہوس نہ کرو۔ وہ انہیں راہب سمجھتا ہے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اکثر لوگ شادی اور جائداد کے بندھنوں سے آزاد نہیں ہوں گے۔ اس ک ۔نظریہ کے متعلق اس غلط فہمی نے کہ وہ ساری انسانیت پر حاوی ہے، مسیحیت کو ایک خوش گوار منافقت کی صورت دے دی اور اسے ناقابل عمل بنا دیا۔

اینڈریو : مجھے اس قابل احترام استاد کی یہ بات ناپسند ہے کہ وہ جسم کے خلاف تھا اور انسانی جبلتوں کی سادہ لذتوں سے بیزار۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک یہودی پیورتن تھا۔

میتھیو : تم غلط سمجھتے ہو۔ اس نے پانی کو شراب میں تبدیل کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس کے عہد کے احمق یہ کہتے تھے کہ وہ شرابیوں اور گناہ گار عورتوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتا ہے۔ وہ ایک ماں کی طرح جسمانی گناہ کو برداشت کرتا تھا۔ کیا تم اس عورت کی کہانی بھول گئے جو زنا کرتی پکڑی گئی تھی۔

فلپ : اس کہانی کی صداقت مشکوک ہے، لیکن محض یہ واقعہ کہ وہ تحریر میں لائی گئی یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسیح کی شخصیت میں عورت کے لئے ایک خاص قسم کی نرم دلی موجود تھی، امرا کی پرزور مذمت اور مفلسوں سے شدید محبت نے اسے دو ایک صدیوں میں دیوتا

کہانیوں کا مرکزی کردار بنا دیا- اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ اس قسم کی روایات کا بھوکا رہتا ہے اور کسی قسم کی قدیم روایات نے مسیحی مذہب کی تشکیل کی- خدا کے بیٹے کا تصور، وہ ناجی جو باکرہ کے بطن سے پیدا ہو گا، انسانوں کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر اپنی جان دے دے گا اور پھر قبر سے اٹھے گا، مسیحیت سے پہلے کہ بہت سے مذاہب میں موجود ہے- ہندوستان میں تقریباً یہی اوصاف کرشن میں پائے جاتے ہیں- مصر میں ہورس ہیں اور میکسکو میں کیوٹسالکوٹل میں-

تھیوڈور: عام یونانیوں کی روایت ہے کہ آرفیئس قتل کیا گیا تا- وہ برزخ میں اترا اور ازسرنو زندہ ہوا- یہی کہانی پرومیتھیئس، ایڈونس اور ہیرکلیس کے متعلق بھی مشہور ہے-

سر جیمز: وہ خدا جو انسان بن جاتے ہیں قدیم مذاہب میں بہت عام ہیں- چین میں ان تمام خداؤں کے نام، پیکن کے محکمہ نوآبادیات کے رجسٹر میں درج تھے، جو انسان کی شکل اختیار کر چکے تھے- ایک سو ساٹھ خداؤں نے دنیا میں زندہ رہنے کے لئے سرکاری لائیسنس حاصل کیا تھا- مسیح کا تصور اس قربانی کے بکرے سے پیدا ہوا جسے لوگ مارنے کے لئے چن لیتے تھے تاکہ اس کی موت ان کے گناہوں کا کفارہ بن سکے اور ارض و سما کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کر سکے اور زمین پر پھر گندم کے پودے ہرے بھرے نظر آئیں- یہ روایت تقریباً ہر قوم میں دہرائی گئی ہے-

ایستھر: سترھویں صدی میں زبانی زیوی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ مسیح ہے جسے خدا نے یہودیوں کی نجات کے لئے بھیجا ہے-

سر جیمز: اس کے بعد بھی اسی قسم کا ایک اور مسیح آیا تھا- ۱۸۳۰ء میں کشی میں ایک شخص نے اعلان کیا کہ وہ خدا کا فرزند اور انسانیت کا ناجی ہے- ہزاروں آدمی اس پر ایمان لائے اور اس کا پیغام مقبول عام ہوتا گیا- دفعتاً" اس کے ایک پیرو نے اس سے یہ درخواست کی کہ وہ اس خطہ کے جرمنوں سے جرمن زبان میں خطاب کرے- اس نے کہا "یہ لوگ انگریزی زبان سے نابلد ہیں اور یہ، امر قابل افسوس ہو گا کہ وہ محض اسی بنا پر جہنم میں جھونکے جائیں-" نئے مسیح نے یہ اعتراف کیا کہ اسے جرمن زبان نہیں آتی- اس کے پیرو نے حیرت سے کہا- "تم خدا کے بیٹے ہو اور تمہیں جرمن زبان نہیں آتی-" اس واقعہ کے بعد کشی کے مسیح کی مقبولیت ختم ہو گئی-

فلپ: مسیح کو خدا بنانے کے بعد ابتدائی مسیحیوں کو مقدس عدد ثلاثہ، کو منطقی شکل میں ڈھالنے اور وحدت کبریائی کو قائم کرنے کے لئے چند دینیاتی تصورات تراشنے پڑے- لیکن

یہودیوں کا خدا، جنگ اور طاقت کا خدا تھا۔ اور غربا جنہیں مسیحیت پسند آئی تھی، رحم و کرم کے خدا کے متمنی تھے، اس لئے یہوداہ نے وفات پائی اور خدا، ہمارے باپ نے جنم لیا۔ اس خدا کی ہمہ گیری کو شر کے وجود سے ہم آہنگ بنانے کے لئے یہ لازمی ہو گیا کہ شر کا بھی ایک دیوتا شیطان یا لیو سیفر بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ نئے مذہب کو بحیرہ روم کی اقوام کی اس رسم کی مطابقت کرنی تھی کہ خدا تین ہوتے ہیں۔ ہندوؤں، مصریوں، فینشویوں۔ شامیوں اور رومنوں نے تین خداؤں کی پرستش کو اپنا اصول بنایا تھا، لیکن یہودیوں کی تحریک وحدت نے مسیحیت کے تین خداؤں کو تثلیث میں پرو دیا اور سکندریہ کے فلسفیوں نے اسے یونانی فلسفے اور روایت کے سانچے میں ڈھالا۔ مسیحی علما نے نئے مذہب کی تعمیر وحدت ربانی کے نظریہ کے مطابق کی لیکن عوام نے اسے اپنے چند خدائی کے مقبول تصور کی تصدیق سمجھا۔ مریم نے وینس، افروڈا، اشتر، آئیسس اور مادر عظیم کی جگہ لے لی۔ مریخ، میقائیل اور مرکری جبرئیل بن گیا۔ اس کے بعد معمولی فطرت پرست دیوتاؤں کی جگہ رسولوں نے لے لی، ہر قوم، ہر شہر، اور ہر قصبہ کا ایک علیحدہ رسول بن گیا۔ لوگوں کے فطری رجحان نے فتح پائی۔

اسی طرح پرانے تہوار قائم رکھے گئے اور نئے تہواروں کو قبل مسیح کے مقدس ایام پر متعین کیا گیا۔ ایسٹر نے یہودیوں کے پاس اودر، بابل کے رسوم اشتر اور یونان کی احیائے ایڈونس کی رسوم کی جگہ لے لی۔ کرسمس دراصل آفتاب کی پیدائش کا جشن تھا جسے ابتدائی مصری منایا کرتے تھے۔ اہل مصر، نوزائیدہ سور کی ایک بچہ کے مجسمہ سے نمائندگی کرتے تھے، جسے اسقف بازاروں میں لا کر لوگوں کو دکھاتے تھے۔ اسی طرح پرانی رسوم کو نئے مذہبی مطالبوں کے ماتحت ڈھالا گیا، بپتسمہ دینا ایک قدیم رسم تھی، جو بچے کی عالم بلوغت میں رسائی کی علامت تھی اس کی ابتدائی شکل یہ تھی کہ بچہ کو پانی میں ڈبویا جاتا اور پھر اس کو مصنوعی طور پر ڈوبنے سے بچایا جاتا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے دوبارہ جنم لیا ہے۔

تھیوڈور: ڈائینوسس کے مذہب میں نو بالغ کو "دو زائیدہ بچے" کہتے تھے۔

فلپ: جیسا کہ سر جیمز ہمیں بتا چکے ہیں عشائے ربانی کا تہوار دیوتاؤں کو کھانے کی رسم سے پیدا ہوا۔ مسیحیوں کی بعض رسوم بھی یہودیوں کی رسوم سے پیدا ہوئی ہیں۔ پہلے کلیسا، یہودیوں کے معبدوں کی مانند تھے۔ نسلاً بعد نسلاً یہ رسوم پیچیدہ تر ہوتی گئیں اور عقائد زیادہ ژولیدہ ہوتے گئے۔ پادریوں کی طاقت بڑھتی گئی، اپنے مخصوص علم کی وجہ سے وہ گناہ گاروں اور اس خدا کے درمیان وسیلہ بن گئے، جس کی رضاجوئی صرف چند مقدس

رسوم کی ادائی سے ہو سکتی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ پادریوں نے مذہب کو تخلیق کیا ہے' والٹیئر نے پوچھا "وہ کون شخص تھا جس نے مذہب کی طرح ڈالی؟ اور اس نے خود ہی جواب دیا: "وہ پہلا بدمعاش جسے پہلے احمق سے واسطہ پڑا۔" لیکن حقیقت یہ ہے کہ پادریوں نے مذہب نہیں بنایا بلکہ مذہب نے پادریوں کی تخلیق کی انسان کی مستقل امید آفرینی نے مذہب کی تعمیر کی اور ہمیشہ کرے گی۔ لیکن پادریوں نے کلیسا کی تعمیر کی۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک مستحکم نظام میں منظم کیا' جس کا سرمایہ عوام بہم پہنچاتے تھے اور جس کا نظم و نسق اسقفوں کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے کانسٹنٹائن کو مسیحیت کی طرف مائل کیا' امرا کے وظائف قبول کیے اور کلیسا مفلس ماہی گیروں کی عبادت گاہ کی بجائے دنیا کا متمول ترین اور مستحکم ترین ادارہ بن گیا۔ اصلاح مذہب کے عہد سے پہلے کلیسا یورپ کے ایک تہائی حصہ کا مالک تھا اور اس کا خزانہ مال و زر سے لبریز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ہادی کے پیغام کی روح سے بیگانہ اور ہر قسم کی دنیاداری کا شکار ہو گیا۔ یورپ مسیحیت کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ ابتدائی مسلک احیائے علوم کی نرم رو فطرت پرستی میں کھو چکا تھا۔ مذہب مفلس لوگوں میں پیدا ہوتا ہے اور امرا میں مقبول ہو کر مر جاتا ہے۔

"اصلاح مذہب" کی تحریک نے مسیحیت کی ابتدائی سادگی اور رہبانیت کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ تحریک کامیاب ہوئی اور اس نے ایک صحت مند فردیت کے رجحان کو عام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ضبط نفس اور استحکام شخصیت کا ایسا اخلاقی نظام بنایا' جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی اور نظام نہیں کر سکتا۔ جدید سیاسی اور اقتصادی تاریخ کی تقریباً تمام عظیم شخصیتیں' پروٹسٹنٹ تھیں' لیکن انہوں نے یہ عظمت بعض دوسری اقدار کی قربانی کے ذریعہ حاصل کی۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے ایک مکمل کلیسا کی جگہ ایک مکمل کتاب کو دے دی' اور کلیسا کی عدم موجودگی سے ہر شخص کو یہ اجازت مل گئی کہ وہ الہامی کتاب کی تعبیر اپنی مرضی کے مطابق کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نئے پروٹسٹنٹ نے ایک نیا فرقہ بنایا اور یہ مسلک ہزاروں حصوں میں بٹ کر رہ گیا۔ ابتدائی مسیحیت کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش میں اس نے یہودیت کی روح کو بحال کر دیا اور اخلاقیات میں ایک شدید اور جنگجو قسم کی پارسائی کو شامل کر دیا' جس نے دو سو برس تک فنون لطیفہ کو ختم کیے رکھا۔ کیتھولک مذہب نے ہمیں حسن بنا دیا لیکن وہ حق سے دور تھا۔ پروٹسٹنٹ مسلک نے ہمیں حق عطا کیا لیکن وہ حسن سے عاری تھا' میرا خیال ہے کہ آخر میں فتح حسن کی ہو گی۔

۵۔ کیتھولک مسلک اور پروٹسٹنٹ مسلک

میتھیو : حسن اور حق کیا کبھی تم نے غور کیا ہے فلپ کہ حق حسن سے زیادہ معروضی نہیں ہے خدا کے متعلق بھی اسی قدر اختلاف ہے جس قدر کہ :-

اینڈریو : دیوں کے متعلق اور دیویوں کے متعلق۔

میتھیو : یونہی سہی۔ شیطان اینڈریو، تم مذہبی احساس سے قطعی محروم ہو کیونکہ تم حسن کو آرزو سے جدا نہیں کر سکتے۔ یعنی تم وہ بے پناہ حسن نہیں محسوس کر سکتے جو زمین کبھی کبھی خزاں میں بھی ارزاں کرتی ہے، یا سرما کی کسی صبح کو ہر شجر پر فروزاں برف اور برف سے ڈھکے ہوئے مکانوں میں سے پھوٹتا ہے۔ لیکن اسے غیر مطمئن متشککین! تم حق سے بھی تو محروم ہو۔ تمہاری سائنس ہر روز بدلتی ہے۔ وہ آج، پچاس برس پہلے کے مقابلہ میں، مادے کی حقیقت کی سے زیادہ بے خبر ہے۔ تمہارا علم حیاتیات ہر تیس برس کے بعد ایک نئے کلیہ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ایک نسل میں وہ ماحول کو سب کچھ سمجھتا ہے، دوسری نسل میں وراثت کو، اور تیسری میں پھر ماحول کو اپنا ملجا و ماویٰ بنا لیتا ہے۔ اسی طرح اسی کے نظریات اور تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ تمہاری نفسیات ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ شعور کا وجود ہے کہ نہیں۔ اور تمہارا ریاضی یہ نہیں جان سکا کہ خط مستقیم دو نقطوں کے درمیان قلیل ترین فاصلہ ہے کہ نہیں۔ اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان فانی حقائق پر اس حسن کو نثار کر دوں جو مسیحی مذہب نے مجھے عطا کیا ہے۔ کیا تم یہ بات نہیں سمجھتے کہ ہم برخود غلط ذرے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم زندگی کے ایک پہلو یعنی انسانی عقل کے ذریعے ساری کائنات کا احاطہ کر لیں گے۔ تمہاری عقل کیا ہے سوائے حواس اور منطق پر اعتماد کے۔ وہ حواس جو چیزوں کی اصلیت کو بگاڑتے ہیں اور وہ منطق جو ہر تعصب کو معقول صورت دے سکتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جہاں تک دنیا کے متعلق نظریوں کا تعلق ہے، حقیقت کے نقطہ نظر سے ان میں سے کوئی بھی دوسرے نظریے سے بہتر نہیں ہے، اور میں اس نظریہ سے مطمئن ہوں جو مجھے حسن سے آشنا کرتا ہے اور دل میں امید کو مستحکم کرتا ہے۔ جب خرد کینٹربے ماند پڑ جائیں گے اس وقت بھی میرا مذہب لاکھوں انسانوں کے دلوں کو بھائے گا۔ غالباً آپ کے پوتے اور نواسے آپ کی میراث تشکک کی سرد مہر فضا سے اکتا کر میرے ایمان کی طرف رجوع کریں گے۔ مغرب، بتدریج اس عظیم غلطی یعنی اصلاح مذہب کے تصور سے سنبھل رہا ہے۔ بہت سے پروٹسٹنٹ فرقے، خانہ جنگی سے تنگ آ کر پھر ایمان قدیم کی طرف لوٹ رہے ہیں اور باقی جدت پرستی اور ضبط تولید کی وجہ سے منتشر ہو جائیں

گے۔ فردیت کا گھن ان کلیساؤں کو کھائے جا رہا ہے، جنھوں نے پاپائے روم کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جب ہر شخص اپنے آپ کو فلسفہ اور دینیات کا ماہر سمجھنے لگے تو مذہب کو بھی انہی نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن سے جمہوریت کو ہونا پڑا ہے۔ جب فرد، کنبہ کی اور تعیش یک زوجگی کی جگہ لے لے تو نسل روبہ انحطاط ہو جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کیتھولک طبقے میں مرد اور عورتیں آخر تک ایک دوسرے کے ساتھ وفادار رہتے ہیں، اور بچوں کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے حسین نشوونما اور فطری بازی پسندی سے گھروں کو رنگین بنائیں۔

پال: میتھو! تم سچ کہتے ہو۔ ہم پروٹسٹنٹ اپنے آپ کو فرقہ پروری اور ضبط تولید سے ختم کر رہے ہیں۔ امریکہ میں ہر پانچ مسیحیوں میں سے دو مسیحی آپ کے کلیسا سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمہاری شرح پیدائش ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ دو ہزار عیسوی تک، (اگر یہی رجحانات حاوی رہے) یہ ملک سارا آپ کا ہو چکا ہو گا اور شاید یہ صحت مند تبدیلی ہو گی۔ میں مانتا ہوں کہ آپ کا مذہب میرے مذہب سے زیادہ مسرت بخش اور حسین ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے نظریہ نکاح میں حکمت آپ کے نظام میں عظمت، آپ کے اسقفوں اور تارک الدنیا عورتوں میں نجابت اور سخاوت ہے۔ غالباً زندگی اپنے امراض اور درد دیاس کے ساتھ، اس شاعری کے بغیر ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ جو قدیمی ایمان ہماری بے کیف زندگی کو عطا کرتا ہے۔ لیکن مجھے آپ کے مذہب سے ڈر لگتا ہے۔ میں یہ بات فراموش نہیں کر سکتا کہ آپ کے کلیسا نے کبھی ظلم و تشدد کی حمایت کی تھی۔ اس نے کوپر نیکس کو جلا وطن کر دیا تھا، گیلیو کو جبراً خاموش کر دیا تھا اور برونو کو آگ کی نذر کر دیا تھا۔ بسا اوقات کلیسا نے علم کی ترقی اور انسانی ذہن کی آزادی کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں۔ مجھے اس خیال سے بھی دکھ ہوتا ہے کہ آپ کا کلیسا کچھ عرصے کے بعد اس ملک پر چھا جائے گا۔

میتھیو: ہاں ہم اپنا انتقام لے رہے ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آپ کے جہلا کے ہاتھوں ظلم و تشدد کے بعد ہمیں بھی اب عزت اور اقتدار حاصل کرنا چاہئے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ کلیسا نے ہمیشہ علم کی نشوونما کی مخالفت کی۔ اس نے فقط، اپنی ہر دلعزیزی کے زمانے میں ان غلط تصورات کے خلاف جہاد کیا ہے جو وقت کی دھوپ چھاؤں نے پیدا کئے تھے۔ اس نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کے اراکین خرد نظر کے اس انتشار میں نہ الجھیں جو ہمارے عہد کی عظیم ذہنی شخصیتوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کلیسا نے کبھی

کبھی کسی قدیم تعصب کی بھی حمایت کی ہے لیکن انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ کیا اس سیاسی جماعت نے کبھی غلطی نہیں کی جسے پچھلے انتخاب میں آپ کی حمایت حاصل تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے دو ہزار برس میں کلیسا عظیم ترین اخلاقی، فنی اور ذہنی قوت کی حیثیت سے تاریخ کو متاثر کرتا رہا ہے۔ ہسپانیہ کی عدالت تفتیش، اصلاح مذہب کا نتیجہ تھی۔ وہ محض خوف و ہراس کی ایک ہنگامی علامت تھی۔ کس نے سب سے پہلے امریکہ میں حریت عبادت کی روایت قائم کی؟ نیو انگلینڈ کے مہاجروں نے نہیں جو کریکروں کی اصلاح، جلتی سلاخوں کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ وہ اصلاح کرنے والے میری لینڈ کے کیتھولک تھے۔ کیتھولک مسلک نے آسٹریا، بیوریا اور فرانس میں جہاں اسے تسلط حاصل ہے، کبھی حریت افکار یا ترقی علم کی مخالفت نہیں کی لیکن امریکہ کے بنیاد پرستوں نے ہر کہ دمہ کو یہ آزادی دے کر کہ وہ جدید حیاتیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں، علم کے حق و باطل کو مذاق بنا دیا ہے۔ کیا ہمہ دان اجتماع یا ہمہ دان کسان ایک ہمہ دان کلیسا سے بہتر ہیں؟

پال : میتھیو! یہ بڑی سخت چوٹ ہے، مجھے بنیاد پرستوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں ان کی حمایت میں کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ لوگ جہالت کے آخری حربہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے مدرسے اور دوسرے تعلیمی ادارے ان کے اثر کو جلد ہی زائل کر دیں گے۔ میرا اپنا پروٹسٹنٹ عقیدہ اس واہمی پرستی سے نجات کی ایک کوشش ہے۔ اگر ہم ان مصیبت زدہ لوگوں کے سامنے جنہیں خدا اور بقائے روح کے تصور سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے، دہریت کا اعلان کریں تو ہم انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ تحفظ سکون کی خاطر تشدد پر اتر آئیں۔ نفرت اور خوف کی اس فضا میں میرا جدید نظریہ نہیں پنپ سکتا۔ خطرے کے وقت عقل کو کون نوازتا ہے؟ پھر بھی فتح ہماری ہو گی۔ متوسط طبقے اور تعلیم کی توسیع ہمارے عقیدے کے حق میں جاتی ہے، اور غالباً کیتھولک مسلک کی فتح تمام آزاد خیال لوگوں کو ایک ایسی متوازن مسیحیت کے شیرازہ میں یکجا کر دے گی جو اپنے پیروؤں سے فقط خدا پر ایمان اور اخلاق مسیح کی توقع رکھے گی۔

کلیرنس : پال! تمہارا مذہب ختم ہو رہا ہے۔ اس کے زوال کی طرف دیکھو۔ وہ دس ہزار فرقوں میں منتشر ہو چکا ہے، اور ہر فرقہ اپنے عقیدے کو حق مطلق کا درجہ دے کر دوسرے نو ہزار نو سو ننانوے فرقوں سے نفرت اور حقارت کا سلوک کرتا ہے۔

پال : میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ پروٹسٹنٹ مسلک انتشار پیدا کرتا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ فرد اپنے ضمیر کے مطابق دوسروں سے مختلف ہونے کا حق رکھتا ہے۔ یہ مسلک اس

Scanned with CamScanner

کڑے نظام سے بہتر ہے جو انفرادیت اور اختلاف رائے کو سرے سے کچل دیتا ہے۔

میتھیو: مرکزی نظام کا واحد بدل انتشار ہے۔

کلیرنس: پروٹسٹنٹ مسلک، کسی مرکزی نقطہ کی غیرموجودگی کے باعث تباہ ہو جائے گا۔ یہ مسلک رومانیت اور تعلیم کا امتزاج ہے۔ والٹیئر نے جو بات عوام کے بارے میں کہی تھی، وہ مذہب پر بھی صادق آتی ہے۔ جب مذہب استدلال شروع کردے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ پروٹسٹنٹ مسلک۔ اصلاح مذہب کی تحریک کے زمانے سے انحطاط پذیر ہے۔ علم اس کا بدترین دشمن ہے۔ سائنس کی ترقی سے کیتھولک مذہب پر کچھ اثر نیں پڑتا کیونکہ کیتھولک مسلک استدلال کرتا ہی نہیں۔ وہ عقل کی بجائے قلب و نظر کو متحرک کرتا ہے۔ جب قلب و نظر مطمئن ہو جائیں تو ذہن ساکن ہو جاتا ہے۔ لیکن پروٹسٹنٹ مسلک قلب و نظر کو نہیں عقل کو تحریک دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے مذہب کو دلائل و براہین پر استوار کیا۔ اس کے کلیساؤں کی تعداد کم ہوتی جائے گی، لیکن کیتھولک مسلک کئی صدیوں تک مستحکم رہے گا۔ پروٹسٹنٹ مسلک ذہن اور تخیل کی کشاکش میں کچلا جائے گا۔ امریکہ کا مستقبل فرانس کے حال کی طرح ہو گا۔ اقلیت تشکک میں مبتلا ہو گی، اکثریت پارسائی سے وابستہ ہو گی اور آزاد خیال لوگ توہمات کے لادے کی زد میں ہوں گے۔ کیتھولک مسلک عوام کو مسحور کر لے گا اور اگر اقتصادی تقابل یا جنگ کے ہولناک نتائج کے باعث افلاس پھیلا تو پرانے اساطیر پھر لوگوں کے ذہن سے ابھریں گے۔ ہر ملک کے کاشت کار ابھی تک قدیم حکایات سے شغف رکھتے ہیں۔ سادہ لوگ ہر جگہ ابھی تک روحوں اور مافوق الفطرت ہستیوں پر یقین رکھتے ہیں۔ الیگزانڈر برکین کہتا ہے کہ اس نے سینٹ پیٹرز برگ میں ایک دیوار پر لکھا دیکھا کہ مذہب عوام کے لئے افیون کا اثر رکھتا ہے، لیکن برابر والے کلیسا میں بہت سے لوگ عبادت کر رہے تھے۔ یہ قول لکھنے والا یہ بات بھول گیا کہ افیون مشرق میں بہت مقبول ہے اور مغرب میں بھی۔ ہم اہل مشرق سے بہتر نہیں ہیں۔ جہاں چند لوگوں میں آزاد خیالی کا چرچا ہے۔ وہاں قدیم مذہب کی خشک اور ویران زمین سے ہزاروں نئے فرقے ابھر رہے ہیں۔ ہمیں ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ مسیحی سائنس مقبول عام ہو رہی ہے، کیونکہ لوگ نہ مسیحیت پر ایمان رکھتے ہیں نہ سائنس پر۔ تھیوسوفی ناکام کلرکوں اور دکان داروں کو ہندو فقیر بنا دیتی ہے۔ ایک اخبار کی حالیہ اشاعت میں ایک سو ترپن مذہبی اعلان تھے۔ ان میں سے ترپن باطنی فرقوں کے تھے۔ ایک شخص نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس موضوع پر تقریر کرے گا "کیا شیطان ایک شخصیت

Scanned with CamScanner

ہے اور کیا وہ ایک ہزار برس تک ایک اتھاہ گڑھے میں محبوس رہے گا؟" ایک پرانی روایت ہے کہ جب دیوتا دیووں کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں گے تو ایک نئی کائنات پیدا ہو گی اور دیوتا پھر زندہ ہو جائیں گے۔ دنیا کی تاریخ میں یہی ہو رہا ہے۔ دیوتا واپس آ جاتے ہیں اور ہمیشہ مشرق سے واپس آتے ہیں۔ ہم مشرق کے نئے فرقوں کے زیر اثر آ رہے ہیں۔ جس طرح یونان اور روما مسیح سے تین صدی پہلے مشرقی مذاہب سے متاثر ہو رہے تھے یا جس طرح افریقہ اور ہسپانیہ کو اسلام نے مسخر کر لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو ہمیشہ ایک ایسے مذہب کی طلب رہے گی جو مافوق الفطرت تقدس سے آراستہ ہو کر ان کے تخیل کی تسکین کرے۔ لوگ سائنس نہیں چاہتے۔ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں' کیونکہ سائنس کا وعظ یہ ہے کہ زندگی' زندگی کو کھاتی ہے اور زندگی تباہ ہو جائے گی۔ عوام کبھی سائنس کو قبول نہیں کریں گے جب تک کہ وہ دنیا کو جنت نہ بنا دے۔ جب تک افلاس موجود ہے' دیوتا قائم رہیں گے۔

Scanned with CamScanner

باب بست و سوم

کتب خانہ میں
خدا اور بقا

ا۔ بقا۔

اریئل : اس کتب خانہ میں ہمیں آسائش اور خاموشی میسر آئے گی۔ اگر آپ اس مباحثہ سے تنگ آ جائیں تو آپ کتابوں سے جی بہلا سکتے ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ جب تک مجھے بقائے روح اور ہستی باری تعالیٰ کے متعلق کچھ بتا نہیں لیں گے۔ یہاں سے نہیں جائیں گے۔

پال : کلیرنس یہ سمجھتا ہے کہ روح لافانی نہیں ہے اور ہم سب کتوں کی طرح مر جائیں گے۔

کلیرنس : ہاں ! اگر میں لافانی ہوں تو میرا کتا بھی لافانی کیوں نہ ہو؟ میں یہوداہ کی طرح اس پر جبر کرتا ہوں۔ میں خود غرض ہوں اور اسے وہی کچھ کھانے کو دیتا ہوں جو میں خود نہیں کھانا چاہوں۔ میں جب چاہتا ہوں اس سے جدا ہو جاتا ہوں لیکن وہ میرا وفادار ہے۔ ہم دونوں میں سے وہ بہتر مسیحی ہے۔

سر جیمز: پال ! تمہاری "روح" ان روحوں سے پیدا ہوئی ہے جنہیں وحشی لوگ اپنے خوابوں میں دیکھتے تھے۔ جب وحشی انسان نے مردوں کی روحیں ان کے جسموں سے جدا دیکھیں تو اس نے سمجھا کہ اس کے اندر بھی ایک ایسی ہی روح ہے' جو اس کے جسم سے جدا ہو سکتی ہے۔ اس نے آوازوں کی گونج اور سایوں کی یہ تعبیر کی کہ یہ انسان کی روح ہیں۔ باسو تو قبیلے کا وحشی ندی کے پاس سے نہیں گزرتا کیونکہ وہ دوڑتا ہے کہ کہیں مگرمچھ اس کے سایہ کو نہ کھا لے۔ یہ حقیقت ہے کہ وحشی خواب میں اپنے آپ کو شکار کرتے' چلتے پھرتے اور اچھلتے کودتے دیکھتا تھا لیکن بیدار ہونے پر وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ اس نے تمام رات ذرا سی جنبش نہیں کی۔ یہ بات اس کے لئے اس بات کا کافی ثبوت بہم پہنچاتی تھی کہ اس کے جسم میں ایک روح ہے۔ اسی طرح سرمستی اور بیہوشی بھی اس کے لئے جسم کی

Scanned with CamScanner

روح سے ہنگامی جدائی کی علامت تھی۔ مغربی افریقہ کے حبشی یہ سمجھتے ہیں کہ جب روح کھو جائے تو درد سر ہوتا ہے۔ وہ اپنے طبیب کو جنگلوں میں بھیجتے ہیں کہ وہ روح کو ڈھونڈ لائے۔ وہ روح کو ایک بکس میں بند کر کے لے آتا ہے۔ وہ بکس کو مریض کے کانوں کے پاس کھول دیتا ہے اور درد سر دور ہو جاتا ہے۔

کلیرنس: اناطول فرانس کی ایک کہانی میں پولینیشیا کا ایک شخص کہتا ہے :۔ "روح ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ میں مرنے لگا ہوں تو میں نے اپنی ناک دبالی تاکہ روح نکلنے نہ پائے، لیکن میں نے ناک کو زور سے نہیں دبایا اور میں مرگیا۔"

سر جیمز: سیلیبس میں لوگ مریض کی ناک، کمر اور پاؤں میں مچھلی پکڑنے کے کانٹے لگا دیتے ہیں تاکہ اگر اس کی روح نکلنا چاہے تو وہ کانٹے میں اٹک جائے۔ وہ چھینک کو بڑے خطرے کی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر چھینک زور کی ہو تو ممکن ہے کہ روح باہر نکل آئے۔ اس لئے جب کوئی شخص ان کے سامنے چھینکتا ہے تو وہ خدا سے رحم کی دعا مانگتے ہیں۔ جب ہندوؤں کے سامنے کوئی جمائی لیتا ہے تو وہ چٹکی بجاتے ہیں تاکہ اس کی روح باہر نکل پڑے۔ بعض وحشی تصویر نہیں اترواتے کہ کہیں ان کی تصویر کے ساتھ ان کی روح بھی نہ چلی جائے، کیونکہ اگر روح چلی جائے تو فوٹوگرافر جس وقت چاہے آکے انہیں نگل سکتا ہے۔

نظریہ بقائے روح اسی تصور سے پیدا ہوا۔ ٹکارورا کے ہندی کہتے ہیں کہ تمام نیک ہندیوں کی روحیں ایک ایسی روحانی دنیا میں جاتی ہیں جہاں انہیں حسین عورتیں میسر آتی ہیں، جو نہ بوڑھی ہوتی ہیں نہ موٹی اور جہاں خوب صورت شکار گاہوں میں ان گنت ہرن چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں۔ گناہ گار ہندی کی روح مرنے کے بعد ایک ایسی جگہ منتقل کی جائے گی جہاں غذا کم یاب ہو گی اور سانپ کھانے کو ملیں گے۔ اہل مصر میں بقائے روح کا تصور اس قدر اہم تھا کہ وہ اس زندگی میں جسموں کے لئے تو جھونپڑیاں بناتے تھے لیکن موت کے بعد روحوں کے لئے شاندار مکانات دوام" تعمیر کرتے تھے۔ ہندوستان میں یہی تصور مسئلہ تناسخ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اطالیہ میں ہمیں فیساغورث یہ کہتا سنائی دیتا ہے :۔ "اس کتے کو نہ پیٹو کیونکہ اس کی آواز میں مجھے اپنی متوفی دوست کی آواز سنائی دیتی ہے"۔ ہمارے اپنے عہد میں نیٹشے کے دائمی تواتر کا نظریہ ایک جدید شکل میں اسی موضوع کا اظہار ہے۔ جہنم کا تصور تمام قوموں میں ملتا ہے لیکن اس کی نوعیت ان آلام کے ساتھ بدلتی رہتی ہے جو مختلف قومیں برداشت کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ یہی آلام ان کے دشمنوں کو

نصیب ہوں۔ ہمارا اپنا تصور جہنم، ہمیں یہودیوں سے ملا جو صحرا کی جلتی ہوئی دھوپ سے نالاں تھے، لیکن اسکیمو یہ سمجھتے ہیں کہ جہنم ایک نہایت سرد جگہ ہے۔

پال: آپ غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ تصور بقا بہت پرانا ہے اس لئے غلط ہے۔ میں اس تصور کو انہیں وجوہات کی بنا پر قبول کرتا ہوں جن کی بنا پر وحشی نے اسے اپنایا تھا۔ میں اپنے اندر کی طرف جھانکتا ہوں تو ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہوتا ہوں جس کی مادی اصطلاحات میں توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ میرے جسم کی موت سے میری روح آزاد ہو جائے گی۔

ولیم: پال! ممکن ہے کہ روح شاید مادی نہ ہو لیکن وہ وقت کی قید سے آزاد نہیں ہے۔ ذہن جسم سے وابستہ ہے۔ دونوں اکٹھے ہی پھلتے پھولتے اور مرجاتے ہیں اور اکٹھے ہی امراض اور صدموں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ولیم جیمز نے کہا تھا کہ دماغ فقط ذہن کی ایک شرط ہے لیکن غدودوں کے علم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دماغ ذہن کی تحریکوں کا ذمہ دار ہے۔

میری شخصیت میرے موروثی میلانات اور میری عادات اور حافظہ پر مشتمل ہے جو میرے عصبی نظام سے وابستہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ذہن جسم ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ عصبی نظام سے متعلق ہے۔ اس کا محتاج ہے اور اس لئے اس کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا حافظہ ہنگامی یا مستقل طور پر اثر یا بعض کیمیاوی مرکبات کی وجہ سے مجروح ہو سکتا ہے۔ بڑھاپے میں حافظے کے بعض حصے ختم ہو جاتے ہیں اور شخصیت محدود ہو جاتی ہے۔ غالباً اس لئے کہ دماغ کمزور اور منتشر ہو جاتا ہے۔ جب میرے اعصاب قبر میں گل سڑ جائیں گے تو میری منفرد انا' بھی ان کے ساتھ ختم ہو جائے گی' کیونکہ میری انا' میری وراثت اور تجربہ کا امتزاج ہے اور یہ دونوں عناصر میرے گوشت پوست سے وابستہ ہیں۔ شخصیت کی وحدت بھی جو بقائے روح کی شرط ہے۔ ایک مشکوک تصور ہے۔ میری شخصیت بدلتی رہتی ہے۔ اور زندگی کے ہر دس سال میں میں بہت مختلف ہو جاتا ہوں۔ جو اب ہوں اور میں جو دس سال کے بچہ تھا' مختلف شخصیتیں ہیں۔ ان ہنگامی شخصیتوں میں سے کون میں' ہوں؟ پھر دیکھئے کہ ایک ہی جسم میں دو یا دو سو سے زیادہ شخصیتیں ہو سکتی ہیں۔ انا' محض تجربات کا مجموعہ ہے اور یہ ممکن ہے کہ یہ تجربات کا مجموعہ کسی مرض یا صدمے کی وجہ سے دو مجموعوں میں بٹ جائے جیکل یا ہائیڈ میں سے کون غیر فانی تھا؟ اور اگر روح بدن کے بعد زندہ رہے بھی تو اس سے کیا حاصل؟ کیا آپ جسم کے بغیر کسی وجود کا تصور کر سکتے ہیں یا اس قسم کے وجود کا تصور کوئی تسکین بہم پہنچا سکتا ہے؟ کیا آپ جسم کے بغیر کوئی

لذت یا محبت کی لرزش محسوس کر سکتے ہیں؟

میتھیو: پال، آپ نے دیکھا کہ اگر آپ بقائے روح پر یقین رکھنا چاہیں تو منطقی طور پر آپ کو احیائے جسم پر بھی ایمان لانا پڑے گا۔

پال: نہیں! یہ بات ماننا کہ جب جسم کو کیڑے کھا چکے ہوں گے تو وہ قیامت کے دن اپنے کروڑوں حصوں کو پھر یکجا کر کے زندہ ہو گا، بہت مشکل ہے۔ اگر ہم جسم کے بغیر روح کا تصور نہیں کر سکتے تو یقیناً نقص ہم میں ہے نہ کہ امکان بقائے روح میں۔ طبیعات میں سینکڑوں ایسی چیزیں ہیں، (مثلاً برق) جن کا تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن ہیں وہ حقیقی۔ روحانی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ روح جسم کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اس کے حق میں شہادت اتنی فیصلہ کن ہے کہ مسلمہ دیانت کے لوگ جو پہلے اس تصور کے خلاف تھے (مثلاً ہائیلوپ بحرو سواور الفرڈرسل راس، اب اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ "سائنٹیفک امریکن کا مدیر بھی یہ مان گیا ہے کہ مارجری کرینڈن واقعی روحوں سے ہم کلام ہو سکتی ہے۔ اور اس نے اپنے بھائی سے جسے مرے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا تھا، باتیں کی تھیں۔

ولیم: "سائنٹیفک امریکن" نے مسز کرینڈن کا جو امتحان کیا تھا اس کے نتیجے کے متعلق متضاد آراء کا اظہار کیا گیا تھا۔ برڈ اور کیرنگٹن اس کے حق میں تھے بیوڈنی اور میکڈوگل خلاف تھے ہارورڈ کے پروفیسروں نے جو امتحان کئے تھے ان کے نتائج بھی اس تصور کے خلاف تھے۔ بیوڈنی نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ تمام روحانی معجزوں کو دہرا سکتا ہے۔ اس نے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور کہا کہ ہر روحانی معجزہ فریب نظر ہے اس نے ہر مشہور وسیلہ کا نام لے کر یہ کہا کہ یہ شخص دھوکے باز ہے اور یہ بھی کہا کہ اگر میں غلط کہتا ہوں تو یہ شخص مجھ پر بے حرمتی کا دعویٰ کرے۔ کسی شخص نے دعویٰ نہیں کیا۔ اس نے روحانی واقعات کے سائنٹیفک ثبوت کے لئے دس ہزار ڈالر کے انعام کا اعلان کیا لیکن کسی نے یہ ثبوت بہم نہیں پہنچایا۔ مسز پائپر نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ متوفی ڈاکٹر فینیوٹ سے ہم کلام ہو سکتی ہے ولیم جیمز، سر آلور لاج اور مسز سجوک نے جو روحانی تحقیق کے حامی تھے، مسز پائپر کا امتحان کیا۔ انہوں نے اس کے خلاف رپورٹ دی۔ آپ نے ڈنگلس ہوم کی داستان سنی ہے۔ براوننگ نے اس کردار کو عارضی طور پر گویا غیر فانی بنا دیا تھا۔ یوسیپیا بیلاڈینو نے یورپ کا دورہ کیا اور روحانی طاقت کا دعویٰ کیا۔ برگساں، موسیلو اور مادام کیوری نے اس کا امتحان کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ تاریکی میں جب روشنی میز پر پڑتی تھی تو میز ہوا میں اٹھ جاتی تھی اور کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی تھی جو اسے سہارا دے سکتی۔ فاضل ممتحنوں نے یہ

کہا کہ انہیں اس عمل میں کوئی فریب نظر نہیں آیا، لیکن کوئی شعبدہ باز بھی اس قسم کا عمل کر سکتا ہے۔ جب ۱۹۰۹ء میں مادام پیلاڈینو امریکہ آئیں تو ہارورڈ میں مسٹر برگ نے اس کا امتحان کیا۔ جب مادام نے میز اٹھانے کے لئے پاؤں ہلائے تو ایک طالب علم نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلبا استادوں سے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر لارڈ نے اس کا امتحان کیا اور پھر طلبا نے اس کے فریب کو بے نقاب کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک کیمرہ لے گئے تھے، جس سے مادام قطعا" بے خبر تھیں۔ تصویر میں یہ دیکھا گیا کہ مادام اپنے ہاتھوں سے میز اٹھا رہی ہیں۔ یوسیپیا ۱۹۱۰ء میں نہایت مایوس اور نامراد اطالیہ واپس چلی گئیں۔

پال : ہاں، اس ضمن میں ہزاروں فریب کئے گئے ہیں۔ اگر سو یا لاکھ میں سے ایک "وسیلہ" دیانت دار ہے اور اس نے مردوں سے واقعی کلام کیا ہے تو فریب کی داستانیں بے سود ہیں اور بقائے روح ایک قطعی حقیقت ہے۔ یقیناً آپ یہ نہیں کہیں گے کہ سر آلور لاج فریبی تھے۔ اس موضوع پر کتابوں کو دیکھئے اس کے ثبوت میں جو واقعات جمع کئے گئے ہیں وہ اتنے حیران کن ہیں کہ اگر آپ انہیں نہیں مانتے تو آپ ڈارون کے مخالفین کی طرح بزدل قدامت پسند ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سائنس کی روح کو آپ کے اندر یہ احساس پیدا کر دینا چاہئے کہ اس اعجاز آفریں کائنات میں ہر چیز ممکن ہے۔ یاد رکھئے کہ ذہن کے متعلق ہمارا علم ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے۔

اینڈریو : پھر بھی ہم ذہن کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ فکر کرنے کی صلاحیت ارتقا کا ایک حصہ ہے، جس طرح ہماری حرکت کرنے، ہضم کرنے اور محسوس کرنے کی صلاحیتیں ارتقا کا حصہ ہیں۔ یقیناً ہمارے اذہان نے بھی ہمارے جسموں کی طرح نشوونما پائی ہے۔ اور یہ ارتقا ہر فرد میں اپنے آپ کو دہراتا ہے ارتقا کے اس عمل میں بقا کا عنصر کب اور کس طرح داخل ہوتا ہے؟ اگر انسان غیر فانی ہے تو بندر بھی غیر فانی ہے۔ اگر بندر غیر فانی ہے تو اس کی دم پر جو مکھی بیٹھتی ہے وہ بھی غیر فانی ہے۔ اور پرندہ بھی اسی طرح غیر فانی ہے جس طرح وہ کیڑا جو اس کی خوراک ہے۔ یہ ایک تکلیف دہ خیال ہے کہ وہ تمام کھٹمل، جو بھٹیوں میں ہمیں پریشان کرتے ہیں، جنت میں ہمارے ہمسائے ہوں گے۔ پھر یہ دیکھئے کہ دنیا کی وہ تمام قومیں اور نسلیں، جو ہمیں ناپسند ہیں، جنت کی مشک افشاں ہوا کو اپنے تعفن سے بوجھل کریں گی اس طرح جنت مخلوق سے بھر جائے گی۔ اگر ہم اس نسل کے لوگ غیر فانی ہیں تو پہلی نسلوں کے لوگ بھی غیر فانی ہوں گے۔ ہر سال

لاکھوں جان دیتے ہیں۔ اور چونکہ نسل انسانی لاکھوں برس سے حالت وجود میں ہے جنت کا بھی وہی سماں ہو گا جو براڈوے کا دوپہر کے وقت ہوتا ہے۔

ولیم : یہ بحث یقیناً لا ملائل ہے' کیونکہ بقا پر یقین ہماری فطرت میں رچا ہوا ہے اور استدلال کے احاطہ سے ماورا ہے۔ یہ یقین بقائے نفس کی خواہش پر استوار ہے۔ زندگی مختصر ہے اور انا' خوشگوار ہے' اس لئے ہم کیوں کر یہ مان لیں کہ ہم اتنی جلدی ختم ہو جائیں گے؟ بقائے روح کا تصور گرم ممالک میں پیدا ہوا' جہاں زندگی جلد پختہ ہو کر گل سڑ جاتی ہے اور بقائے روح کا تصور اس زندگی کو برداشت کرنے کے لئے لازمی ہو جاتا ہے۔ لنکا میں عورتیں دس سال کی عمر میں بیاہی جاتی ہیں۔ اٹھائیس سال کی عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہیں اور چالیس سال کی عمر میں مر جاتی ہیں۔ وہاں انسان زندگی کے سمندر میں محض ایک حقیر قطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم بھی' حالانکہ ہمارا معیار زندگی ان سے دو گنا ہے' اس معیار سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہم موت کی حقیقت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ ہم ایک اور شباب اور ایک اور عہد محبت کے متمنی ہیں۔ کبھی مذہب خوف پر مبنی تھا' آج وہ امید پر استوار ہے۔

اینڈریو : آج بھی مذہب خوف پر مبنی ہے۔ ہم بقا اس لئے نہیں چاہتے کہ ہمیں زندگی سے محبت ہے' بلکہ اس لئے کہ ہم موت سے ڈرتے ہیں۔ بسا اوقات ہم زندگی اور اس کے آلام سے تنگ آ جاتے ہیں۔ ہم سیزر کی طرح یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم کافی دیر زندہ رہ چکے ہیں۔ حیوان موت سے نہیں ڈرتے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی اور حیوان کو مرتے دیکھتے ہیں اور پھر موت کو تبھی دیکھتے ہیں جب وہ ان کے سر پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس وقت وہ کوئی نظریہ بقا نہیں بنا سکتے۔ جب حیوان' انسان بنے اور انہوں نے حافظہ کی صلاحیت پیدا کی اور اسے مستقبل پر چسپاں کر کے موت کو دریافت کیا تو اپنے سکون قلب کے لئے بقائے روح کا تصور ایجاد کیا۔ بقول وکٹر ہیوگو' پیدا ہونے کا مطلب موت کا انتظار کرنا ہے۔ موت کا خوف' مذہب کی ابتدا ہے۔

فلپ : مجھے تو اپنی بقا کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب میں اپنے آپ کو زندگی کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ ہم ایک کل کے اجزا ہیں اور ہم اس کل کی بقا کے لئے جو کچھ کرتے ہیں۔ وہی ہماری بقا ہے۔ افلاطون غیر فانی ہے' محض اس لئے کہ وہ ہمارے ذہنوں میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہم اپنی اولاد اور اپنے تخلیقی کاموں کے ذریعے زندہ رہتے ہیں۔ اس قسم کی بقا فرد کے لئے اہم نہیں' لیکن اجتماع کے لئے بہت اہم ہے' کیونکہ تہذیب مرے ہوئے

لوگوں کے کارہائے نمایاں کے تحفظ پر مبنی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم بھی یونانیوں اور ابتدائی یہودیوں کی طرح اپنی بقا کو انفرادی بقا نہیں بلکہ اجتماع اور نسل کی بقا سے وابستہ کریں۔

کلیرنس : یہ عجیب بات ہے کہ ہم اسی مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں، جسے دو ہزار برس گزرے لیوکریشس نے طے کر دیا تھا۔ ذرا لیوکریشس کو سنئے :

"کیا یہ کائنات پھر عدم میں سما جائے گی اور یہ ناتواں انا، ——— یہ تازہ شعلہ ——— تنہا غیر فانی اور اداس سلگتا رہے گا۔

کیا قدرت نے گہوارہ شب میں اسی لئے اسے پالا تھا۔ قدرت نے اپنی بے نیاز قوت کے ساتھ اس بچے کو ساحل پر پھینک دیا؟

یہ بچہ کیا ہے؟ فقط ایک چیخ۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کے اعضا بھی اپنے ہیں کہ نہیں۔ کل اس بچے کی حیثیت ایک چیخ سے بھی کم تھی، اور کل وہ اس سے بھی کم ہو گی۔

ایک رگ میں سے دوسری رگ نکلتی ہے اور یہ روح بن جاتا ہے۔ جس طرح پنکھڑی : پنکھڑی میں سے ابھر کر گلاب کا پھول بن جاتا ہے۔ رگیں گل سڑ جاتی ہیں۔ اور پانی کے بلبلے کی طرح وہ پھٹ کر مر جاتا ہے۔

پانی کے جھاگ پگھل رہے ہیں۔ جسم میں روح بھی اس طرح پگھل جاتی ہے۔ ذرات تھک کر آرام کرتے ہیں۔ "بیم ورجا" راکھ کی طرح خاموش ہو جاتے ہیں۔"

میتھیو : آپ نے دیکھا کہ آپ کے دلائل کتنے فرسودہ اور پرانے ہیں!

کلیرنس : لیکن میرا خیال تھا کہ پال یہ سمجھتا ہے کہ کسی عقیدے کی قدامت اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حقیقت بہت پرانی ہے، اور صرف شاعر کاذب اور احمق ہی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں۔ مجھے اناطول فرانس کا ایک فقرہ یاد ہے جو اپی کیورس کا آخری شاگرد تھا "ہمارا سورج ہم سب کو ہرکولیس مجمع النجوم کی طرف لے جا رہا ہے جہاں ہم کروڑوں صدیوں کے بعد پہنچیں گے وہ راستے میں مر جائے گا اور دنیا بھی اس کے ساتھ تباہ ہو جائے گی" اور ہم دنیا کے ساتھ مر جائیں گے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک فانی سیارے کی مخلوق بقا کا دعویٰ کر رہی ہے؟ لیکن ہم آپ کو اس حسین عقیدے سے محروم کرنا نہیں چاہتے۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارا نظریہ یاس آفریں ہے، اور ایک گرسنہ روح اس سلبی نظریہ کے لئے ممنون نہیں ہو سکتی۔

پال : ڈرائیے نہیں! آپ نے مجھے زیادہ پریشان نہیں کیا، ایک لمحہ کا محاسبہ نفس تمام دلائل و براہین کو مسترد کر دیتا ہے۔ میں اپنے ذہن کو دیکھ سکتا ہوں اور میں یہ دیکھ سکتا

Scanned with CamScanner

ہوں کہ میرا ذہن، میرے جسم سے برتر کوئی چیز ہے۔ میرا جسم، میری روح کا ایک وقتی آلہ ہے۔ میں حیات بعد ممات کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میں صرف زیادہ امید آفریں نظریے کا حامی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں، (اگرچہ وہ مادیت کی اصطلاحوں میں تحلیل نہیں ہو سکتا) صحیح ہے۔ اگر آپ کا کوئی عزیز مرجائے تو آپ کو ایک نئے فلسفے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قبر کے نزدیک آپ کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ قدرت اس قدر ظالم ہو سکتی ہے کہ آپ کے لخت جگر کو آپ سے چھین لے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے مرے ہوئے عزیزوں کو پھر دیکھوں گا۔ میرا یہ یقین میرے دل میں جذبہ مسرت اور آلام برداشت کرنے کی وہ طاقت پیدا کرتا ہے جو آپ کے کھوکھلے دلوں کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ جب آپ پر کوئی صدمہ آئے تو صرف آپ کی حالت پر افسوس کر سکتا ہوں۔

سدھا: میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پال!

میتھیو: میں جانتا ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پال!

کلیرنس: خدا کرے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں پال!

۲۔ خدا کے تغیر پذیر تصورات

استھر: یہ تو بے حد مایوس کن نقشہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ خدا کے متعلق آپ کے پاس کچھ خوشگوار باتیں بھی کہنے کو ہیں۔

سر جیمز: محترمہ! اگر ہم اس خدا کی حقیقت ثابت نہ کر سکیں جس کی عبادت آپ بچپن میں کیا کرتی تھیں، تو پریشان ہو جائے گا۔ انسان کا تصور خدا ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی تاریخ خدا کے تصورات کے تغیر و تبدل کی داستان ہے۔ ایک تصور بدل جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا لے لیتا ہے جو انسانیت کے پھلتے پھولتے اخلاقی نصب العین کی نمائندگی کرتا ہے خداؤں کے ان مختلف تصورات کی فہرست دیکھ کر حیران ہوں گے جنہیں انسان نے لازوال سمجھ کر کبھی نہ کبھی مرکز عبادت بنایا ہے۔ اس فہرست میں ہمیں سینکڑوں بڑے خدا اور کروڑوں چھوٹے خدا نظر آتے ہیں۔ اگر آج پچھلی نسلوں کے لوگ پھر زمین پر واپس آئیں تو وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ جائیں گے کہ ان کے قادر مطلق دیوتا، جن کے آگے کبھی وہ انہماک اور سپردگی سے سر بسجود ہوتے تھے آج صرف علم الانسان کے ماہرین کی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ ہر عہد میں لوگوں نے ایک نئے انداز سے خدا کو سمجھا ہے اور اس ہنگامی تصور کے تحفظ کے لئے جانیں دی ہیں اور کشت و خون کا

بازار گرم کیا ہے۔ مورخ اس قتل و غارت یا شہادت سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ لوگوں نے اکثر تبدل پذیر تصورات کے لئے جانیں دی ہیں۔ اور وہ اس بات کے لئے تیار ہے کہ جس طرح یہ تصور ماضی میں بدلتا رہا ہے حال اور مستقبل میں بھی بدلے گا۔ اس لئے وہ خدا کے تصور کی نئی تعبیروں سے نہیں گھبراتا۔ وہ اس تصور کو بڑھتے ہوئے علم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوششوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ انسان ہمیشہ خدا پر یقین رکھیں گے کیونکہ طاقت اور کمال کا امتزاج روح میں امنگ اور طلب پیدا کرتا ہے۔ قدرت مطلق کے ساتھ دوست داری بہت خوش گوار ہوتی ہے۔

ہمارے آباو اجداد کا خدا یہوداہ کی زندگی کی آخری شب تھی۔ فرائیڈ نے خداؤں کی تشکیل میں باپ کے تصور کے حصے کو کسی قدر مبالغے سے بیان کیا ہے۔ یقیناً نوجوان ذہن خدا کو ایک باپ سمجھتے ہیں۔ جو دنیا کے کنبہ پر حکومت کرتا ہے' لیکن باپ کا تصور آبا پرستی کے ادارہ اور اس عقیدہ سے اخذ کیا گیا ہے کہ مختلف قبائل مختلف دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ خدا کو مردانہ خصائل سے متصف کرنا۔ عورت کی آخری توہین ہے جس کا انتقام وہ لے کر رہے گی۔

خدا کے ساتھ انسانی صفات وابستہ کرنے کا رجحان غالباً آبا پرستی کے ادارہ سے پیدا ہوا۔ خدا ایک مرد کی مانند ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ ایک عام مرد سے زیادہ وسیع اور توانا ہے۔ زینوفن نے مسیح سے ۶۰۰ برس پہلے کہا تھا۔ "انسان یہ سمجھتے ہیں کہ دیوتا پیدا ہوتے ہیں اور انسانوں کی طرح لباس پہنتے ہیں اور آواز دیتے ہیں' لیکن حبشہ کے دیوتا سیاہ فام ہوتے ہیں' اور ان کی ناک چپٹی ہوتی ہے اور تھریشیا کے دیوتاؤں کے بال کم سیاہ اور آنکھیں نیلی ہوتی ہیں۔ ہومر اور ہسیائیڈ نے دیوتاؤں سے وہ تمام صفات منسوب کیں' جو انسانوں میں مذموم سمجھی جاتی ہیں۔ چوری' زنا' فریب اور دوسرے غیر اخلاقی اعمال۔ اگر بیلوں' شیروں اور گھوڑوں میں صنم تراشی کی صلاحیت ہوتی۔ تو وہ اپنی شکلوں کے مطابق دیوتا بناتے اور انہیں اپنی طرح کے جسموں میں ڈھالتے۔"

اولمپس کے خاندان کی بداخلاقی کے متعلق یہ شکایت اس عمل کو واضح کرتی ہے جس کے ذریعہ خدا مر جاتے ہیں۔ یہ خدا انسان کی اخلاقی نشوونما سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنے کبریائی جمود کے باعث فنا ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی یونانیوں کے زناکار' چور اور دروغ گو دیوتا۔ ان لوگوں نے وضع کئے تھے' جنہیں یہ طرز عمل معیوب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ عہد' لوٹ مار' زنا بالجبر اور جنگ و جدل کا عہد تھا' اور دیوتا ان کاموں میں خوب ماہر تھے۔ اخلاقی شعور

کی ترقی نے ان بدچلن دیوتاؤں کو افلاطون اور زینوفن کا ہدف تنقید و تنقیص بنایا۔ یہی حال سب دیوتاؤں کا ہے شروع شروع میں ان کے متعلق جو تصور باندھا گیا تھا وہ بعد کے لوگوں کا ناپسند تھا۔ یہ ہر تہذیب کی بدقسمتی ہے کہ اسے وحشی دیوتا میراث میں ملتے ہیں۔ ہمیں اپنے موروثی خدا، یہوواہ کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ جنگ کا دیوتا تھا۔ جس طرح جہنم کا تصور، وحشی انسانوں کے ظلم و ستم کی عکاسی کرتا ہے، اسی طرح خدا کا تصور قبائلی زندگی کے خطرات و خدشات کا آئینہ دار ہے۔ اجتماعی نظام کی ترقی سے زندگی زیادہ محفوظ ہو گئی، اور جنگیں کم ہو گئیں تو بالغ اذہان نے ایک ظالم خدا کے تصور کے خلاف بغاوت کی جو کروڑوں انسانوں کو جہنم میں بھیج دیتا ہے۔ اجتماعی نظام کا یہ تقاضا تھا کہ لوگوں میں اخلاقی تعاون کی عادات پیدا ہوں۔ آہستہ آہستہ ایک کامل انسان کا تصور اس قدیمی خدا کے تصور سے دور ہٹتا گیا۔ جان سٹوارٹ مل نے یہ کہا تھا کہ "اگر زمانہ وسطیٰ کے دینی تصور کا خدا موجود ہے تو وہ خدا نہیں شیطان ہے۔ اور اگر یہ خدا مجھے اس لئے جہنم میں بھیجے گا کہ میں اسے اچھا نہیں سمجھتا تو میں جہنم میں جانا پسند کروں گا۔" انسان کی اخلاقی ترقی اس کے "تصور خدا" سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔

انسانی فطرت کی یہ تہذیب و تزئیہ کچھ اقتصادی ضروریات کی تسکین اور سیاسی حالات کی ترتیب سے اور کچھ مسیحی اخلاق کے انیس سو سال کی تاریخ سے وجود میں آئی ہے۔ مسیح نے یہوواہ کا خاتمہ کیا، مسیحیت نے مفروضہ مسیحی خدا کو ختم کیا۔ میں یہ نہیں مانتا کہ ہم اپنی جنگجوئی اور سیاسی انتشار کے باوجود دو ہزار برس کی اخلاقی تربیت سے متاثر نہیں ہوئے۔ ہم آج کل جو حالات دیکھ رہے ہیں۔ ان کا یہ مطلب نہیں کہ مسیحیت ختم ہو گئی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسیح اپنے رحم و کرم کی تلقین کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک بہتر خدا کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

اینڈریو: یقیناً یہ کسی مذہب کی عظمت کی علامت ہے کہ وہ اپنے نظام اخلاق کے کمال کے باعث تباہ ہو جائے۔ لیکن آپ کے بیان میں سب اسباب و نتائج کا ذکر نہیں جب کوپر نیکس نے یہ اعلان کیا کہ زمین ان گنت دنیاؤں کے درمیان محض ایک ذرہ کی حیثیت رکھتی ہے تو قدیمی ایمان ختم ہو گیا۔ کائنات کا کوئی مرکز نہیں ہے، کوئی اعلیٰ ادنیٰ کی نسبتیں نہیں ہیں زمین اپنا وقار رکھ چکی تھی۔ اور اس ایمان کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں کہ کائنات کے پس پردہ جو کبریائی قوت کار فرما ہے، وہ محض اس حقیر سیارہ کی حقیر مخلوق کے حقیر گناہوں کی خاطر اس دنیا میں آئی، دکھ اٹھائے اور سولی پر چڑھ گئی۔ اسی لئے اناطول فرانس /

نے اس انقلاب کے متعلق یہ کہا تھا کہ یہ تاریخ فکر کا اہم ترین واقعہ ہے دنیا نے اس انقلاب کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا۔ وہ انقلاب جس نے جنت کی جگہ مکان کو دے دی' اور دنیا اور انسان کو سیاروں کی تاریخ میں محض حادثات بنا دیا۔ برونو کو محض اس لئے نذر آتش کر دیا گیا کہ اس نے ان مطالب کی وضاحت کر دی تھی "لیکن اصلاح مذہب" کی تحریک کچھ اس طرح جاری رہی جیسے کوپر نیکس اور گیلیلیو کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔

ڈارون نے اس تخریبی مہم کو مکمل کر دیا۔ جس طرح ماہر فلکیات نے کرہ ارض کو مکان کی جلا میں جھونک دیا تھا۔ اسی طرح ماہر حیاتیات نے انسان کو لامحدود زبان کی نذر کر دیا۔ قسمت کی جگہ "فطری انتخاب" نے لے کی دائمی عشق کی جگہ دائمی مبارزہ نے لے لی۔ جنگ پھر خالق زندگی بن گئی۔ پال کے عہد میں ہر عضو ایک خاص وظیفہ کی ادائیگی کے لئے تخلیق کیا گیا تھا۔ اور ہر حیوان' انسان کی ضروریات کی تسکین کے لئے پیدا ہوا تھا لیکن ڈارون نے نہ صرف اس تمام نظام کو ختم کر دیا۔ بلکہ اس نے یہ بتایا کہ تمام انسانی زندگی میں ایک بدنظمی اور ابتری کا اصول کار فرما ہے۔ کیا کوئی چیز اس سے زیادہ مضحکہ خیز ہو سکتی ہے جس سے انسان اپنی نسل میں اضافہ کرتا ہے؟ پیدائش اور موت کی حقیقت ہی خدا کے وجود کی تردید کے لئے کافی ہے۔ کوئی طبیب اور کوئی جرنیل اس پر یقین نہیں رکھتا۔ کیا کوئی ذہین خالق اس قسم کی دنیا بنا سکتا تھا جس میں ذی حیات کا واحد آمین زرم بے کار ہے اور جس میں فقط جابر' مکار اور بے رحم کی فتح ہوتی ہے۔ اس آئین کی رو سے ہر جگہ جنگ ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان قبیلے اور قبیلے کے درمیان سلطنت اور سلطنت کے درمیان جنس اور جنس کے درمیان بس جنگ کا آئین کارفرما ہے۔ اور شاید وہ وقت بھی آ جائے جب سیارے اور سیارے کے درمیان بھی جنگ ہونے لگے۔ سیارے ابھی سے ایک دوسرے کے خلاف آمادہ پیکار نظر آتے ہیں جیسے کوئی شیطان تخریب و تباہی سے لذت اندوز ہو رہا ہو۔

ہم جو خدا کے اس منتخب سیارے میں زندگی بسر کر رہے ہیں' جہاں اس کا پیارا بیٹا پیدا ہوا تھا' ہماری ہر ایجاد اور ہر اختراع ہمارے درد و آلام میں اضافہ کرتی ہے۔ اور ہر مشین ہماری غلامی کی زنجیروں کو مستحکم تر کرتی جا رہی ہے۔ ہم نے فضاؤں میں پرواز کرنا محض اس لئے سیکھا ہے کہ اگلی جنگ میں ہم زیادہ آسانی سے کروڑوں شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار سکیں۔ بیتھوون' جسے سب سے زیادہ کانوں کی ضرورت تھی بہرا ہو گیا نیطشے کو آنکھیں چاہئے تھیں وہ اندھا ہو گیا۔ ڈاکٹر جانسن کی عظمت کا راز اس کی طاقت ہی تھی۔ مگر اس

Scanned with CamScanner

کی قوت گویائی اس سے چھین لی گئی۔ مصور عظیم رینلڈز کا بازو بے کار ہو گیا۔ چند دن ہوئے میں نے ایک مفلوج عورت کو دیکھا بیس برس پہلے وہ جوان اور حسین تھی ٹینس کھیلنے کے فوراً بعد تیرنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے مفلوج ہو گئی۔ کوئی نامعلوم زہر اس کے اعضا میں سرایت کر گیا۔ اب وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے بھی معذور ہے۔ اس کا چہرہ سوج کر کپا ہو گیا ہے اور اس کے ذہن کے سوا اس کی تمام شخصیت شکستہ اور افسردہ ہے۔ اس کا ذہن پہلے سے زیادہ بیدار ہے تاکہ وہ اپنے دکھ کو زیادہ شدت سے محسوس کر سکے۔ بقول ہنری ایڈمس، "یہ دنیا، رنج و الم کی آماجگاہ ہے۔ طاعون، وبا اور قحط، سیلاب، خشک سالی اور انجماد، عالم گیر مصائب اور شہروں کے گم نام گوشوں میں ہونے والے حوادث، ظلم و ستم، بداخلاقی، حماقت، تذبذب اور جنون، نیکی کے بدلے بدی، بدی سے نیکی کی پیدائش، شعور کے بغیر مسرت، بے نتیجہ خود غرضی، بے سبب اندوہ اور مبہم خطرات" ——————— اور موت ان تمام کیفیتوں کا صلہ ہے، رحمت ایزدی کا ذکر ہی انسان کے آلام و مصائب کی توہین کے مترادف ہے۔

میتھیو : اینڈریو! آپ بدی کا ذکر اس شدت احساس سے کر رہے ہیں کہ میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ آپ کو کسی نہ کسی دن دولت ایمان افروز حاصل ہو جائے گی۔ کلیسا نے ہمیشہ شر کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ پاپائے انوسنٹ نے "انسان کے دکھ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی، اور ہمارے مذہب کا ہر عقیدہ یہ فرض کرتا ہے کہ یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ اسی لئے ہمیں ایمان کی ضرورت ہے۔ ہم اس زندگی کو کس طرح برداشت کر سکیں اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ ہمیں اس کے عوض دوسری دنیا میں راحت و مسرت حاصل ہو گی۔ آپ نے شاید ابھی تک والٹیر کا سبق نہیں سیکھا کہ اگر خدا کا وجود نہیں ہے تو ہمیں ایک خدا ایجاد کرنا پڑے گا۔

اینڈریو : میتھیو، آپ ایک شریف انسان ہیں۔ آپ اس تحمل اور رواداری سے ہمارے کفر و شرک کو برداشت کرتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کی ہر بات مان لی جائے۔ میں کسی جذبہ خود پسندی کی وجہ سے آپ کی مخالفت نہیں کر رہا۔ شاید آپ ہی صحیح کہہ رہے ہوں، لیکن آپ کی ساری دینیات انسان کے ہبوط، کے عقیدے اور اس یقین پر استوار ہے کہ مسیح نے انسان کو جہنم سے بچا لیا ہے، اور ارتقاء نے ان عقائد کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔ جب تاریخ نے اپنی داستان میں سے حضرت آدم کو خارج کیا تو آپ کی دینیات کی بنیادیں مسمار ہو گئی تھیں۔ تاریخ، دینیات کی اتنی ہی دشمن ہے جتنی کہ

Scanned with CamScanner

حیاتیات- قوموں کے عروج و زوال، جنگ کی وجہ سے استیصال فن، چوروں، دیوانوں اور قاتلوں کی متصل فتح اور کامرانی سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے جو اناطول فرانس نے نکالا تھا کہ "دنیا ایک المیہ ہے جسے کسی عظیم شاعر نے تصنیف کیا ہے" یا "یہ ایک طربیہ ہے جسے جنت کے ارسٹو فینیز نے تصنیف کیا ہے۔"

کلیرنس: مجھے اس تاثر سے دل چسپی ہے، جو میتھیو نے آپ کی تقریر سے حاصل کیا ہے- شر، ایمان اور شک دونوں کی تخلیق کرتا ہے- ہر سپاہی، جب تک کہ اسے ترقی نہ ملے مذہب پر ایمان رکھتا ہے، ہر جرنیل دہریہ ہوتا ہے- دکھ، جو آپ کے لئے خدا کی ہستی کے خلاف ایک بین ثبوت ہے اس پر یہ بات واضح کرتا ہے کہ روح کو کسی نہ کسی طرح تسکین بہم پہنچانی چاہئے- جب تک دنیا میں افلاس یا موت ہے- دیوتا موجود رہیں گے- دولت کا وفور مذہب کے انحطاط کا سب سے بڑا سبب ہے- دولت رہبانیت کو کچل کر ہمارے شہروں کو تعیش اور بداخلاقی کے سامان سے مالا مال کرتی ہے، اور جب مذہب تعیش اور بداخلاقی کی مذمت کرتا ہے تو ہر شخص سوائے اس کے جو شر کی توفیق نہیں رکھتا، مذہب کے خلاف ہو جاتا ہے-

پال: دولت سے کہیں زیادہ مشین بے دینی کا سبب ہے- صنعتی انقلاب نے مشین کی مدد سے معجزے کر کے دکھائے ہیں اور جدید ذہن ان معجزوں سے اس قدر متاثر ہوا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مشین ہی اصل کائنات ہے- زمانہ وسطیٰ کے لوگوں کے نزدیک فطرت میں خدا جلوہ گر تھا، اس لئے وہ فطرت کی پرستش کرتے تھے، اور فن کی تخلیق سے حسن فطرت کے تقابل کی کوشش کرتے تھے- لیکن جدید ذہن فطرت کو مفید اشیا بنانے کے لئے خام مال سمجھتا ہے- جدید انسان درخت کاٹ دیتا ہے تاکہ ان سے کاغذ بنائے- وہ ہوا اور پانی کو کیمیاوی مرکبوں سے مسموم کر دیتا ہے- وہ ایک خاموش گاؤں کو ایک پر خروش صنعتی شہر میں تبدیل کر دیتا ہے- وہ نئے آلات بناتا ہے اور زمین کو قبضہ قدرت میں لانے کی کوشش میں منہمک رہتا ہے- ایمان کے زوال کا ایک سبب یہ ہے کہ انسان کے انا، کی اہمیت بڑھ رہی ہے- وہ اپنے اوزاروں سے سب کچھ کر سکتا ہے، اس لئے اسے خدا کی ضرورت نہیں رہی- جب لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے تو وہ زیادہ منکسر المزاج اور غالباً زیادہ شدید جذبات کے حامل تھے- وہ زمین سے ابھرتی، پھلتی پھولتی زندگی کے مشاہدہ سے طلسم حیات کا اندازہ لگاتے تھے، اور کبھی اپنے بچوں کو مشینیں نہیں سمجھتے تھے-

کلیرنس: اسپنسر کو بھی آپ سے کسی قدر اتفاق تھا- وہ سمجھتا تھا کہ مافوق الفطرت

ہستیوں پر یقین صنعتی عہد سے قبل عسکری گروہوں میں زیادہ مستحکم تھا۔ اس لئے کہ اس وقت عوام میں اطاعت کی صفت بہت ضروری تھی، پھر یہ کہ صنعت نے چونکہ وہ ذہانت کی نشوونما کرتی ہے، اس ایمان کو کمزور کر دیا۔ میرے خیال میں صنعت اس لئے بھی مذہب کے لئے مضر ہے کہ وہ مختلف مذاہب کے پیروؤں کو بڑے بڑے شہروں میں یکجا کرتی ہے اور مختلف مذاہب ایک دوسرے سے مل جل کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور صنعت سے جمہوریت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے آمرانہ ذہنیت کا قدیم خدا کمزور ہو گیا اور اس کی جگہ ایک آئین پسند خدا نے لے لی۔ اور پھر اعداد کی پرستش سے انسانیت کے مذہب نے جنم لیا۔

اینڈریو۔ آپ ہمارے کفرو الحاد کے اسباب کا شمار کرتے کرتے کہیں تعلیم کو نہ بھول جائیے گا۔ آج کا طالب علم کیمیاوی اور طبیعاتی دارالعمل میں دھکیل دیا جاتا ہے اور وہ اپنے سامنے دنیا کو تحلیل ہوتے اور پھر نئے سرے سے بنتے دیکھتا ہے۔ اس تمام عمل کی توجیہہ میں خدا کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ وہ "حیاتیات" پڑھتا ہے، اور اگر وہ کسی ایسی ریاست کا باشندہ نہیں جہاں سائنٹیفک مسائل، استصواب رائے یا آئین سازی سے طے ہوتے ہیں تو وہ یہ سیکھتا ہے کہ "کبریائی مقصد" محض ایک مفید ارتقائی حادثہ ہے۔ وہ علم الانسان اور تقابلی مذہب سے بہرہ اندوز ہوتا ہے، سر جیمز کی تصانیف کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے ایمان اور رسم و رواج کو ایک وسیع تناظر کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ ان کی حیثیت قدیم جہالت کے توہمات سے زیادہ نہیں رہتی۔ اسی لئے پیرانہ سال بزرگ ہمارے کالجوں کو دہریت کے خم کدے سمجھتے ہیں۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں، یہ مجبور ہیں۔

ولیم : آپ سب یہ بھول گئے ہیں کہ لادینی کی ایک وجہ جنگ بھی ہے۔ جنگ سے افلاس زدہ طبقہ مذہب کے اور قریب آگیا، لیکن متمول لوگوں میں تشکک بڑھ گیا۔ جو دنیا خودکشی پر آمادہ ہو وہ ایک فیاض اور اعلیٰ ذہن کی تخلیق کیونکر کر سکتی ہے!

فلپ : اسباب کچھ بھی ہوں یہ حقیقت واضح ہے کہ مذہب مغربی دنیا میں اپنا اثر کھو چکا ہے۔ اور دنیا داری کی ایک رو زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو اپنی زد میں لے رہی ہے جو کبھی مذہب کے زیر اثر تھے۔ یہ کالج، جن کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے۔ کبھی مذہبی فرقوں کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن صنعت کے دور میں یہ محسوس کیا گیا کہ ہمارے کالج، فلسفی، شاعر خطیب اور ماہرین دینیات پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن انجینئر، اکاؤنٹنٹ اور کلرک جن کی صنعت کو ضرورت تھی ناپید تھے۔ صنعت نے شکایت کی، اور جب کالجوں نے دیکھا کہ شکوہ سنج مال دار ہے تو انہوں نے پادریوں کو برطرف کر دیا اور سرمایہ دار کو اپنا سرپرست بنا لیا۔

Scanned with CamScanner

آج کالجوں میں ادب اور فلسفے کی جگہ طبیعات اور کیمیا نے لے لی ہے۔ سائنس نے مذہب سے یونیورسٹیاں چھین لی ہیں۔

یہ ہے سرچشمہ ہماری دنیاداری کا۔ اسی سرچشمہ سے وہ ندیاں پھوٹیں جنہوں نے ہماری زندگی کے ہر پہلو کو شاداب کیا ہے۔ وہ مقدس ہستیاں' جو کبھی ہمارے تہواروں کو پر مسرت اور حزیں بناتی تھیں آج فراموش کر دی گئی ہیں۔ زراعت کبھی دعاؤں اور مذہبی رسوم سے متاثر ہوتی تھی۔ آج وہ کیمیاوی مرکبات کے زیر اثر آ گئی ہے۔ قانون جو کبھی جلوہ ربانی کی حیثیت رکھتا تھا آج کانگرس کے قائدوں کی رضا کا اظہار ہے ریاست جو کبھی مذہب میں مدغم تھی' آج ہر قسم کے اصول سے بے نیاز ہے۔ وہ اب مذہب کو محتسب کی حیثیت دینے پر بھی تیار نہیں۔ ہماری حکومت کسی مقدس تہوار کو مسیحی بن جاتی ہے' لیکن سال کے باقی دن اس ایک دن کی کمزوری کا کفارہ ادا کرنے میں صرف کر دیتی ہے۔ مصطفیٰ کمال نے ریاست کو لادینی قرار دے دیا۔ اور ترکیہ کے صرف چند اخباروں نے اس انقلاب کو قابل ذکر سمجھا۔

یہ حقیقت ہے کہ بہت سے فرقوں میں اور بہت سے روشن خیال ذہنوں کے گمنام اور تاریک گوشوں میں آج بھی بے بنیاد توہمات اور نامعقول عقائد جاگزیں ہیں۔ لیکن عہد ماضی کی خونیں رسوم اور بے ڈھب عقائد کے مقابلے میں وہ معقول اور ناتواں معلوم ہوتے ہیں ہم مغربی یورپ اور مشرق کا مقابلہ کریں تو ہمیں اپنی لامذہبیت کی وسعت کا اندازہ ہو گا۔ گبن کہتا ہے کہ "ابتدائی مسیحی یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ہر طرف سے عفریتوں کے حملوں کی زد میں ہیں۔ تصورات انہیں سکون قلب عطا کرتے تھے' الہا ان کی راہبری کرتا تھا۔ اور کلیسا کی شفقت انہیں بھوک' مرض' حتیٰ کہ موت سے بھی نجات دلواتی تھی۔" آج ان عقائد میں سے کیا باقی رہ گیا ہے؟ تہذیب کی تاریخ دراصل دنیاداری کی تاریخ ہے آج جو وعظ ہم سنتے ہیں وہ تصورات' عفریتوں اور الہاموں کا ذکر نہیں کرتے۔ جہنم' اعراف اور کفارے کا ذکر بھی کہیں سنائی نہیں دیتا۔ ہر چیز عقل کی نذر ہو گئی ہے' اور دینیات' اپنے جذبہ پارینہ سے محروم ہو کر اب فلسفے اور اخلاقیات کا ایک مرکب بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن اخلاق جو کبھی کلیسا کی ملکیت تھا اب کلیسا اور ریاست دونوں سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ اخلاق کی مافوق الفطرت بنیادیں کمزور ہو گئی ہیں اور احساس گناہ زوال پذیر ہے۔ ہمارے نوجوانوں کا اخلاقی نصب العین نیکی نہیں۔ بلکہ احتیاط ہو گیا ہے۔

اینڈریو : مذہبی رسوم کی پابندی کے متعلق جو اعداد و شمار شائع کئے گئے ہیں ان سے

بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی یورپ اور امریکہ میں مذہب کا تسلط اور غلبہ ختم ہو چکا ہے۔

کلیرنس : مذہب کے نام لیواؤں کی فہرست میں فقط مسیحی ہی نہیں بلکہ تھیوسوفسٹ بھی ہیں۔ آج امریکہ میں صرف چار کروڑ انسان گرجے جاتے ہیں۔ باقی لوگ اتوار کے دن آرام سے بستروں میں پڑے رہتے ہیں۔ قرائن یہی بتاتے ہیں کہ مسیحیت اسی انحطاط کے دور سے گزر رہی ہے جو کبھی سوفسطائیوں کے عروج کے باعث قدیم یونانی مذاہب پر آیا تھا۔ والٹیر، پروٹیگورس تھا۔ ڈڈرو۔ ڈیموکریٹس تھا۔ کانٹ افلاطون تھا۔ اسپنسر ارسطو تھا، اور اناطول فرانس، اپی کیورس تھا۔ ہم خداؤں کے عہد زوال میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۳۔ مذہب کا منصب

پال : کلیرنس، آپ کے لہجہ میں اداسی کی جھلک ہے۔ آپ کے احساسات کا انداز بھی مذہبی ہے لیکن آپ کی تجزیہ پسند عقل آپ کو ایمان سے محروم کر رہی ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی منطق آپ کے دل سے زیادہ قابل اعتماد ہے؟ کیا یہ فلکیات، طبیعات حیاتیات جیسے علوم اتنے مستند ہیں کہ آپ ان کے آگے ان تمام امید آفریں عقائد کو پس پشت ڈالنے میں حق بجانب ہو جائیں جو لاکھوں انسانوں کا ملجا و ماویٰ ہوں۔

کلیرنس : مجھے معلوم ہے کہ ایمان سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ میرا ایک بوڑھا چچا پہاڑ پر رہتا ہے۔ وہ ساری عمر کھیتی باڑی کرتا رہا۔ اور جب اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا تو وہ خاموشی سے آگ کے پاس بیٹھ کر زندگی کے دن کاٹنے لگا۔ وہ کہتا ہے :۔ "میں کوئی ایسا برا آدمی نہیں۔ اپنی زندگی میں میں نے دو چار گناہ ضرور کیے ہیں۔ لیکن خدا رحیم و غفور ہے وہ ضرور مجھے معاف کر دے گا" اس کی بیوی اس کے پاس بیٹھ کر انجیل پڑھتی ہے اور مسیح کے ہر لفظ کو اپنے اندر خوشی سے جذب کرتی رہتی ہے۔ میں ان کی امیدوں کو توڑنا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں کو آخر سکون قلب سے کیوں محروم کیا جائے قریب کے گاؤں میں ایک صاف ستھرا سفید اور ہمدرد قسم کا گرجا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کی روحوں کو یہاں سے دولت ایمان حاصل ہوتی ہے۔ اس گرجے کے پیچھے ایک قبرستان ہے۔ ہر قبر پر کسی فرشتہ کا مجسمہ یا صلیب کا نشان بنا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر کنبہ مردے کو مسیح کے سایہ شفقت میں لا کر اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ عوام کس طرح امید کے سہارے جیتے ہیں۔

پال : میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ سادہ لوح لوگ راستی پر ہیں تو دنیا یقیناً زیادہ حسین

Scanned with CamScanner

ہے۔

اینڈریو : آپ بہت جذباتی ہیں، کلیرنس ! آپ نے میتھیو کی پیروی میں ہمیں یہ بتایا ہے کہ جنت کی امید ہماری زندگی کو خوشگوار بنا سکتی ہے۔ لیکن آپ یہ بھول گئے کہ کلیسا نے جہنم کی آتش ابدی کی دھمکی دے کر لاتعداد انسانوں کی زندگی کو جہنم بنا دیا تھا اور مقدس کتاب یہ کہتی ہے کہ اکثر لوگ جہنم ہی میں جائیں گے۔ آپ میتھیو کو یہ بات کیوں یاد نہیں دلاتے کہ مذہب نے لوگوں کی زندگیوں کو تاریک اور المناک بھی بنائے رکھا ہے۔ عقیدہ پرستی اور معمولی مذہبی اختلافات کی بنا پر خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ فرقہ پرستی نے لاکھوں انسانوں کو رزم و پیکار میں مبتلا کیا ہے۔ مرد اور عورتیں محض اس خدشہ کے باعث جان سے مار دیئے گئے کہ ان کا کوئی معمولی مشرکانہ عقیدہ کتاب مقدس یا کلیسا کی حقانیت کو داغدار نہ کر دے۔ آپ کی باتوں سے مجھے سینگز کا ایک قول یاد آ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ دہریت اور صحیح مذہبیت کی آرزو میں کوئی تناقض نہیں۔ ہماری صدی کے اوائل میں اس قسم کے بہت سے دہریے پیدا ہوئے مثلاً اناطول فرانس، جارج مور اور جارج سنیانا، جو ایمان افسردہ کے رومانی ماتم گسار تھے۔ وہ ایک عبوری دور کے نمائندے تھے۔ ان کے بعد کی نسلیں ان کی طرح محسوس نہیں کرتیں۔ اور شاید ہماری اولاد اس مذہبی کیفیت سے بالکل نابلد ہو۔ اگر ہم انسان کو دو تین نسلوں تک بقا کے تصور سے دور رکھیں تو یہ شاعرانہ اداسی بھی ختم ہو جائے۔

ولیم : مجھے آپ سے اتفاق نہیں، اینڈریو ! یقین ایک فطری چیز ہے۔ یہ جبلی اور جذباتی تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اپنی خوش قسمتی کے لئے تشکر اور امتنان کا احساس ہم پر حاوی ہو جاتا ہے اور ہم یہ آرزو کرنے لگتے ہیں کہ "روح کائنات" ہمارے خاموش تشکر سے آگاہ ہو جائے۔ نیطشے کہتا ہے کہ بد نصیبی کا یہ رجحان کہ وہ غیر متوقع طور پر خوش نصیبی بن جاتی ہے مجھے اس بات پر مائل کرتا ہے کہ میں خدا پر یقین لے آؤں۔ ایک صدی کے لئے مذہب کو دبا دو۔ اس کے بعد ڈھکنا کھولو تو مذہب پھر ابھر آئے گا۔ ایمان کی نوعیت تشکک سے زیادہ فطری ہے اس لئے اس کا ابھرنا بھی آسان ہے۔ شک ہماری شخصیت کو سکیڑتا ہے مگر ایمان ہماری شخصیت میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ہاضمے اور دوران خون کو بہتر بناتا ہے۔ ہر متشکک کا ہاضمہ خراب ہوتا ہے اس لئے رجائیت، یاسیت سے زیادہ عام ہے اور مقبول ترین صنف، بقول نپولین، امید کے تاجر ہوتے ہیں۔ شک کرنے والے کو کاوش کرنی پڑتی ہے اور انسان فطرتاً تن آسان ہے۔ عوام ذہنی طور پر خوشہ چین

Scanned with CamScanner

ہیں- چند مستحکم ذہن ہی کاوش کرتے ہیں- صرف مستحکم شخصیتیں ہی شک کر سکتی ہے-
شک کرنا جان جوکھوں کا کام ہے-

میتھو : آپ مذہب کا ایک اور ماخذ بھول گئے اور وہ ہے انسان کی شاعرانہ صلاحیت-
مذہب نے نہ صرف موت کے خوف کو کم کر دیا ہے' بلکہ زندگی کو رسوم' فن تعمیر' صنم
تراشی' مصوری' تمثیل اور موسیقی سے زیادہ حسین بنا دیا ہے- اس نے زندگی کے روزمرہ
واقعات کو' پیدائش سے لے کر شادی اور شادی سے لے کر موت تک کے واقعات کو ایسا
تقدس عطا کیا ہے کہ یہ عام واقعات گہرے جذبات سے وابستہ ہو گئے ہیں اور متعلقہ فنون
سے حسین بن گئے ہیں- اس نے زندگی کے المیہ کو ایک مقدس منزل کی طرف ایک
شاعرانہ سفر میں تبدیل کر دیا ہے- اس کے بغیر زندگی اسی طرح بے کیف ہے جس طرح
روح کے بغیر جسم میں کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں کہ اتوار کی شام کو جب گرجے کی گھنٹیاں
بجتی ہیں' دہریہ کیا محسوس کرتا ہے؟ کیا اس پر احساس تنہائی نہیں چھا جاتا؟ کیا مقدس تہوار
آپ کے لئے دوسرے دنوں سے مختلف نہیں ہوتے؟ میرا خیال ہے آپ کی تمام مجالس
رقص و سرود ان کی جگہ نہیں لے سکتی-

اینڈریو : میتھیو! سچ بتایئے گا کیا آپ گرجے میں جانے سے اکتا نہیں جاتے؟

میتھیو : شاید کبھی کبھی' لیکن جب میرا ذہن روشن ہو جاتا ہے تو میں یہ جانتا ہوں کہ
گرجے میں ایک گھنٹہ گزارنے سے میں پورے ہفتے شاداں اور فرحاں رہتا ہوں- اس کے
برعکس آپ کے لئے کرسمس کتنا بے کیف ہوتا ہو گا! مجھے یاد ہے کرسمس سے ایک دن پہلے
ہم خاندان کے سب افراد مل کر دعا کرتے- کرسمس کے دن بھی عبادت کرتے- ہر شخص
خوش نظر آتا- برف سے تمام فضا شفاف ہوتی' گھنٹیاں بجتیں اور کرسمس کے درخت چمکتے
ہوتے- بچے تحفے لے کر خوش ہوتے' بڑے تحفے دے کر خوش ہوتے- نوروز کو ہم سب
بچے اپنے باپ کے سامنے جھک کر اس کی شفقت طلب کرتے- یہ تھے ان دنوں کے کیف!
آج' جب کہ تقدس ختم ہو گیا ہے' خاندان ٹوٹ رہے ہیں اور جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے-

کلیرنس : میرے ایک دوست نے مجھے شعور مذہب کی چار منزلیں بتائی ہیں- پہلی منزل
جذباتی یقین' دوسری منزل الہیاتی یقین' تیسری منزل مطلق مایوسی اور چوتھی منزل جمالیاتی
شعور- میں اس چوتھی منزل میں آپ کے ساتھ ہوں' میتھیو' لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ
اسے صحیح بھی سمجھتے ہیں؟

میتھیو : اسے صحیح سمجھنا لازمی ہے- بغیر صحیح ہوئے یہ حسین کیونکر ہو سکتی ہے؟

پال : میتھیو! آپ نے مذہب کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کیا ہے آپ نے فرد کے لئے اس کی اہمیت واضح کی ہے' لیکن وہ سماج کے لئے بھی اسی قدر مفید اور اہم ہے۔ شادی سے متعلق مذہبی رسوم محض ایک مرد اور ایک عورت کو یکجا نہیں کر دیتیں۔ وہ اس واقعہ کو وہ جذباتی شدت اور تقدس عطا کرتی ہیں' جس کے بغیر شادی محض تناسل کی اجازت ہوتی۔ اس طرح خاندان اور ریاست مستحکم رشتوں میں بندھ جاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں ہم بسااوقات یہ دیکھتے ہیں کہ انفرادی جبلتیں اجتماعی جبلتوں سے کہیں زیادہ توانا ہوتی ہیں۔ جبلت تناسل ضروری نہیں کہ اجتماعی ہو۔ یہ جبلت انتشار اور تفرقہ پیدا کر سکتی ہے جیسا کہ آج کل کرتی ہے۔ مذہب کا عظیم وظیفہ یہ ہے کہ وہ احساس تقدیس۔ اخلاقی تدریس اور وعدہ جنت سے ....

انڈریو : اور خوف جہنم سے ....

پال : اجتماعی جبلتوں کو مضبوط تر بنائیے۔ جہنم پر میرا ایمان نہیں۔ اس کے تصور نے ہزاروں انسانوں کو گناہ سے باز رکھا ہے۔ جب کوئی یہ سمجھتا ہے کہ جہنم کا وجود نہیں ہے تو وہ شیطان کی تحریص کا شکار ہو جاتا ہے۔ اخلاق کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ جزو کے خلاف کل' اور حال کے خلاف مستقبل کی اہمیت واضح کرے۔ مذہب بھی یہی فرض ادا کرتا ہے۔ بقول ہاف ڈنگ' مذہب اقدار کے تحفظ کا نام ہے۔ مذہبی بنیادوں کے بغیر اخلاق محض حساب کتاب بن جاتا ہے۔ "احساس فرض" مٹ جاتا ہے اور ہر نوجوان اپنی تمام ذہانت اور تعلیم اخلاقی احکام کی خلاف ورزی کرنے پر صرف کر دیتا ہے۔

فلپ : اس بات میں کوئی کلام نہیں۔ کہ مذہب مدرسوں کی ایجاد سے پہلے تاریخ کی سب سے بڑی تہذیبی اور تعمیری قوت تھی۔ بنجمن کڈ کا یہ خیال تھا کہ تمام تہذیب ان الہیاتی بنیادوں پر استوار ہے جو مذہب اخلاق کو دیتا ہے۔ ٹارڈ کا یہ ایمان تھا کہ بعض دہریوں کی مقدس زندگیاں اس وجہ سے مقدس تھیں کہ وہ مذہبی تربیت کے اثرات دور نہیں کر سکے تھے۔ یہی حقیقت تھی' جس کی طرف رینان نے اس قول میں اشارہ کیا تھا۔ "ہم ایک سایہ کے سایہ پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارے بعد لوگ کس چیز پر زندہ رہیں گے؟" جب یہ عقائد نہ رہیں گے تو ان لوگوں کی تخریبی جبلتوں یعنی جھوٹ بولنے' چوری کرنے اور قتل و غارت کی محرکات کو کون سے چیز قابو میں لائے گی؟ رینان کا خیال ہے' کہ "مذہب ایک لازمی التباس فکر ہے" ڈوسٹوسکی نے دنیا کے عظیم ناول لکھے محض یہ دکھانے کے لئے کہ جب لوگ خدا کو ترک کر دیتے ہیں تو شیطان ان کے دماغ پر چھا جاتا ہے۔

انقلاب فرانس اور انقلاب امریکہ سے پہلے ریاست ہمیشہ اپنے آپ کو کسی مذہب سے وابستہ رکھتی تھی، اور اخلاقی حمایت کے بدلے اسے اقتصادی اور فوجی امداد بہم پہنچاتی تھی۔ کلیسا اور ریاست کے درمیان موجودہ عناد کا سبب یہ ہے کہ مسیحیت اب قومی مذہب نہیں بلکہ بین الاقوامی مذہب بن گئی ہے، کلیسا، خادم کی بجائے اب آقا ہے۔ اور ہر جدید ریاست اپنی حکومت قائم کرتے ہوئے کلیسا کی طاقت کے خلاف لڑنے پر مجبور ہو گئی۔ حکومت میں نز اور مادہ کے اصولوں کا اختلاف ایک نادر حادثہ ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس حادثے کی عمر بہت مختصر ہو۔

پلوٹارک کہتا ہے کہ یہ بات زیادہ ممکن ہے، کہ کوئی شہر علاقہ کے بغیر قائم ہو جائے بہ نسبت اس کے کہ کوئی ریاست خدا پر ایمان کے بغیر قائم رہے۔ بیل کا خیال تھا کہ ایک دہریہ ریاست بالکل ممکن ہے لیکن والٹیر کا یہ خیال تھا کہ اگر بیل کو چھ سو کسانوں پر حکومت کرنی پڑے تو وہ بھی انتقام ربانی کی تبلیغ کرنے پر مجبور ہو گا۔ نپولین کا خیال تھا کہ مسیحیت کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ "اس نے مفلسوں کو امیروں کے قتل سے باز رکھا۔" اس نے کہا کہ "اگر پاپائے روم کا وجود نہ ہوتا تو مجھے ایک پاپائے روم ایجاد کرنا پڑتا۔" ایک مذہب جو ایک گروہ کا مشترکہ ایمان ہو اس گروہ کو وہ اتحاد اور جذبہ حیات عطا کرتا ہے جس سے ان میں میدان جنگ میں سردھڑ کی بازی لگانے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثال مسلمان اور جاپانی ہیں۔

اینڈریو: حکومت اور اخلاق کے دوام کے لئے مذہب کی ضرورت کے ضمن میں خاصی بے سروپا باتیں کہی گئی ہیں۔ ڈین سوفٹ جو مذہب سے خوب واقف تھا، کہتا ہے کہ مذہب محبت کرنا نہیں بلکہ نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ مذہب لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا بھی کرتا ہے اور ان کے دلوں کو ملاتا بھی ہے۔ ذرا ۱۹۲۸ء کے انتخابات کو یاد کیجئے۔ ایک آئرستانی نے کہا کہ "ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم مذہب زدہ ہیں۔ ہم میں سے کوئی پروٹسٹنٹ ہے، اور کوئی کیتھولک۔ اگر ہم سب دہریے ہوتے تو ہم اچھے مسیحیوں کی طرح مل جل کر رہ سکتے تھے۔" آپ جس چیز کو اتحاد کہتے ہیں میں اسے جمود کا نام دیتا ہوں۔ وہ اتحاد جو مذہب کسی قوم کو عطا کرتا ہے، روایت اور مطلق فرماں برداری کا اتحاد ہے۔ اس کی بہترین صورت مشرق کی اجداد پرستی کی روایت ہے اب رہا مذہب کی تہذیبی سرگرمیوں کا سوال۔ بتائیے کہ قدیم مذاہب میں انسانی قربانی کی رسم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور پھر جدید کلیسا کی ادارہ غلامی کی حمایت اور حالات کو نہ بدلنے کی تلقین کے متعلق آپ کی کیا رائے

ہے؟ ہیوم نے اس خیال کو، مدت ہوئی مسترد کر دیا تھا کہ مذہب اخلاق کی اساس ہے۔ مذہب نے اخلاق کے بعد جنم لیا ہے، دونوں میں اگر کوئی تعلق ہے تو صرف یہ کہ اخلاق نے تعلیم اور تحفظ کے ذریعے مذہب کو بہتر بنا دیا ہے۔ سمز نے اس حقیقت کو بیباکانہ طور پر بے نقاب کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "کلیسا نے کبھی اپنے زمانے کی بہترین اقدار کی حمایت نہیں کی۔ ہر تحقیق یہی بتاتی ہے کہ کلیسا نے کبھی کسی اچھے خیال کی پشت پناہی نہیں کی۔ بلکہ حقیقت یوں ہے کہ روحانی اقدار کو حق کے ان سپاہیوں نے اپنایا ہے، جو ہمیشہ کلیسا سے منحرف رہے ہیں۔"

میتھیو: لیکن کیا یہ بات واضح نہیں ہے کہ مذہبی عقیدے کے انحطاط نے اخلاق میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ اپنے ذہنی فساد، جنسی تلون، فحش ادب اور نمائش پسند تمثیل کو دیکھئے۔ آپ کو یہ صفات کلیسا کے پیروؤں میں ملتی ہیں یا "آزاد خیال" لوگوں میں؟ ڈارون کے فلسفے نے ہم میں قسمت پرستی، یاسیت اور ایک اداس عشرت پسندی کے اوصاف پیدا کر دیئے ہیں، ٹامنس ہارڈی "اس دائمی حزن" کا ذکر کرتا ہے "جو مہذب لوگوں کے ذہن پر چھا گیا ہے کیونکہ وہ ایک رحیم اور غفور خدا پر ایمان سے محروم ہو گئے ہیں۔" ہماری نسل ایک اداس اور افسردہ نسل ہے۔ اس کی شادمانی اور مسرت اولوں کے خلا کو فراموش کرنے کی ایک کوشش ہے آپ کو وہ قول یاد ہے کہ مذہب ہر قوم کے عروج کی علامت ہے اور فلسفہ اس کی موت کا نشان ہے؟

فلپ: نپولین نے کہا تھا کہ "ایک اچھا فلسفی ایک برا شہری ہوتا ہے۔"

میتھیو: ایک برا شہری ایک اچھا فلسفی نہیں بن سکتا۔ کوئی محب وطن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک سطحی اور ہنگامی سائنس اس مذہب کو ختم کر دے جس نے ہماری تہذیب اور ہمارے اخلاق کی تعمیر کی تھی۔ بے دین یورپ اپنی خود غرض طبقاتی مفاد، اور انفرادی ہوسناکی سے کب تک مشرق کا مقابلہ کر سکتا ہے، جو مذہب اور صنعت دونوں سے آراستہ ہے؟ اگر آپ اپنی تعلیمات میں انسان کو ان امیدوں کی تضحیک کریں گے جو اس کا محبوب ترین سرمایہ ہیں تو الم اور مایوسی کے اس سیلاب کو روکنا ناممکن ہو جائے گا جو آج ہر دل کو بہائے لئے جا رہا ہے۔ ڈی موسے اپنی کتاب۔ "ایک نمائندہ صدی کے اعترافات" کے آغاز میں ایک سوال پوچھتا ہے جس کا آپ جواب نہیں دے سکتے۔

"مسیح کے مخالفین نے مفلسوں سے کہا۔ "تم روز عدل کا صبر سے انتظار کرتے ہو۔ حالانکہ عدل کا وجود نہیں ہے۔ تم اپنے انتقام

کے لئے دائمی زندگی کا انتظار کرتے ہو حالانکہ دائمی زندگی کا وجود
نہیں ہے۔ تم اپنے اور اپنے بال بچوں کے آنسوؤں کو جمع کر رہے
ہو، بچوں کی چیخ و پکار، عورتوں کی آہ و بکا کو اکٹھا کر رہے ہو تاکہ
موت کے وقت اسے خدا کے حضور میں پیش کر سکو، حالانکہ خدا کا
وجود نہیں ہے۔

مفلس انسان نے اپنے آنسو پونچھے اور اس نے اپنی بیوی سے
رونا پیٹنا بند کرنے کو کہا۔ پھر وہ ایک بیل کی سی قوت سے مسلح ہو کر
اپنے بچوں کے ساتھ زمین پر کھڑا ہو گیا، اس نے امیروں سے کہا:
"تم بھی محض انسان ہو، تم مجھ پر ظلم کر رہے ہو۔" اس نے پادری
سے کہا: "تم مجھے جھوٹی تسلیاں دیا کرتے تھے" مسیح کے مخالفین بس
یہی کچھ چاہتے تھے، غالباً وہ یہی سمجھتے تھے کہ انسان کو آزاد ہو کر ہی
راحت حاصل ہو سکتی ہے۔

لیکن اگر مفلس انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ پادری اسے فریب دے رہے ہیں اور امرا اسے لوٹ رہے ہیں، ہر شخص کو یکساں حقوق حاصل ہونے چاہئیں دنیوی فلاح و بہبود ہی اصل نکوئی ہے، اور یہ افلاس سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور اس احساس کے بعد وہ اپنے آپ پر اور اپنے بازوؤں پر اعتماد کر کے یہ کہہ دے کہ "امیروں سے لڑ کر۔ میں اس زندگی میں راحت و مسرت حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ مجھے زمین کی حکومت چاہئے کیونکہ جنت کا وجود نہیں ہے۔ تمام انسان مساوی ہیں اور سب کو زمین کی دولت میں سے برابر کا حصہ ملنا چاہئے تو اعلیٰ استدلال کرنے والا، اچھی طرح سمجھ لے کہ مفلس کو اس مقام پر تم نے پہنچایا ہے۔ اگر وہ جنگ میں شکست کھا گیا تو تم کیا کہہ کر اس کے زخموں کو مندمل کرو گے؟"

آپ نے دیکھا کہ کلیسا کا ایک منصب یہ ہے کہ کمزور کو جسے طاقتور کے مقابلے میں کمزور رہنا ہے، سکون قلب عطا کرے۔" آپ مفلسوں کو بغاوت کی تلقین کرتے ہیں۔ آپ نہیں سمجھتے کہ دولت مند، چالاک، طاقتور اور حیلہ جو کے مقابلے میں کمزور، لازمی طور پر شکست کھائے گا آپ اس سے اس کا خدا چھین لیتے ہیں اور اسے آزادی کی نعمت دیتے ہیں، لیکن آزادی، علم اور طاقت کے بغیر کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر یہ لوگ شکست کھا گئے تو آپ ان سے کیا کہیں گے!

Scanned with CamScanner

فلپ : بہت ممکن ہے کہ ہماری سماج الہیاتی عقائد کے انتشار سے منتشر ہو جائے کیونکہ یہی عقائد ہمارے نظام اخلاق کی اساس تھے۔ غالباً سائنس ان عقائد کا بدل نہیں ہے، ہم صرف توسیع علم پر بھروسہ کرسکتے ہیں۔

میتھیو : لیکن تھوڑا علم خطرناک ہوتا ہے۔ اور لوگ اس زندگی میں تھوڑا ہی علم حاصل کرسکتے ہیں۔ آپ کی تعلیم محض ایک مشین ہے جو مردوں اور عورتوں کو حیلہ جو اور عیار بناتی ہے۔

فلپ : ہاں ! ابھی ہم تھوڑے علم کی منزل میں ہیں، لیکن ہم ترقی کریں گے۔ کسی دن تو علم حکمت بنے گا اور پھر ہم سقراط کی طرح اس حقیقت تک رسائی حاصل کریں گے۔ وہی اخلاق مستقل حیثیت رکھتا ہے جو علم کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اگر ہم تعلیم پر بھروسہ نہیں کرتے تو کسی چیز پر نہیں کرسکتے۔

میتھیو : آپ میں سے چند لوگ روایتوں کے فطری اخلاق کو پسند کریں گے اور اکثر لوگ عیش و عشرت میں کھو جائیں گے۔ غالباً دو ایک نسلوں کے بعد آپ کو یہ پتا لگے گا کہ بے یقینی انسان کو کہاں لے جاتی ہے لیکن اور پھر لوگ گرجوں کا رخ کریں گے۔ جب آپ فنا ہو جائیں گے لیکن کلیسا پھر بھی زندہ رہے گا اور اسی طرح ہزاروں لوگوں کے دلوں کو روشنی اور سکون قلب کی نعمت عطا کرتا رہے گا۔ لوگ آپ کو فراموش کر دیں گے اور بالآخر مسیح کی طرف رجوع کریں۔

کلیرنس۔ غالباً یہی ہو گا۔

۴۔ خدا کا نیا تصور

پال : میتھیو، آپ کی باتیں سن کر میں آپ کے کلیسا کا پیرو بن سکتا ہوں، لیکن غالباً مستقبل آپ کا ساتھ نہیں دے گا۔ جوں جوں تعلیم بڑھے گی لوگ اس ذہنی سطح پر پہنچ جائیں گے کہ حسن اور حق میں تمیز کرنے لگیں۔ اگر مسیحیت محض جہلا کی تسکین کا ایک وسیلہ نہیں رہنا چاہتی تو اسے اپنے آپ کو کوپر نیکس اور ڈارون کی دنیا سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا۔ غالباً مذہب کی بد نصیبی کے یہ دن اس کے لئے رحمت کے دن ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت مذہب کو نئے حقائق سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہمیں اس نئی کائنات کے لئے ایک نیا خدا چاہئے۔ ہمیں خدا کے تصور کو وسعت دینی ہے۔

لارڈ مارلے نے کہا :۔ "سائنس کا بڑا فریضہ یہ ہے کہ انسانیت کے ایک مذہب کی

Scanned with CamScanner

تخلیق کرے۔" مذہب کبھی فنا نہیں ہو گا۔ ہم ہمیشہ اپنے سے بہتر ہستی کی تلاش کرتے رہیں گے اور کائنات کے ایک مربوط نظریہ کے متمنی رہیں گے۔ یہ نظریہ فلسفہ ہے جب اس فلسفہ کو جذبات کی گرمی نصیب ہوتی ہے تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔ اس طرح ہم مذہب اور سائنس کو ایک ہی روح میں بسا سکتے ہیں جیسے وہ لیونارڈو' سپینوزا اور گوئٹے کی روحوں میں مل کر رچ گئے تھے۔

ایریئل: کس طرح رچ گئے تھے؟

پال: میں جس خدا پر یقین رکھتا ہوں' وہ قدیم ترین خدا ہے وحشی انسان کا وہ "انا" وہ سرچشمہ حیات ہے جس سے ہر چیز اخذ ہوتی ہے۔ خدا' زندگی ہے' اس کائنات کی تخلیقی قوت ہے' عمل مجرد ہے۔ ہیریکلٹس سے لے کر ہیولاک ایلس تک ہر عظیم شخصیت نے ساکن ترین چیزوں میں بھی موج حیات محسوس کی ہے۔ ایلس کہتا ہے! "یہ دنیا لامحدود زندگی سے بھرپور ہے۔ یہ انکشاف کس نے کیا؟ سائنس نے۔ وہ سائنس جس کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ اس نے ہمیں حسن و خوبی سے محروم کر دیا ہے۔ یہ انکشاف اسی نے کیا ہے"

"ہاں طبیعات اور حیاتیات ہمیں نیا خدا دیں گی۔ طبیعات نے ہر ذرے میں بے پناہ قوت دریافت کی ہے۔ حیاتیات نے ہمیں نشوونما کے اعجاز سے روشنا کیا ہے مذہب ٹھیک کہتا ہے کہ دنیا کی اہم ترین حقیقت تخلیقی قوت ہے' یعنی وہ زندگی' جس کے بغیر بقول سپینوزا' کوئی چیز وجود نہیں حاصل کر سکتی' سپینوزا ٹھیک کہتا ہے کہ "ہر چیز زندہ ہے" شوپنہار اور نیطشے ٹھیک کہتے تھے کہ "مادے کی تہ میں "عزم" کارفرما ہے" ہیگل ٹھیک کہتا تھا کہ "خدا' وہ ارتقائی عمل ہے' جس کے ذریعہ ہر منزل دو متناقض قوتوں میں بٹ کر نشوونما پاتی ہے" ارسطو ٹھیک کہتا تھا کہ "سب چیزوں میں کمال حاصل کرنے اور اپنی صلاحیتوں کی تکمیل کی آرزو پوشیدہ ہے" برگساں ٹھیک کہتا تھا "زندگی اور انتخاب' یہی دو چیزیں حقیقت کے راز ہیں" لیکن برگساں یہ غلط کہتا تھا کہ "مادہ اور زندگی متناقض حقائق ہیں" مادہ زندگی کی ایک شکل ہے۔ زندگی ایک آرزو ہے جو لیمارک کے حیاتیاتی فلسفہ میں عضو کے بعد عضو پیدا کرتی ہے اور جسم کو تصور عزم کے مطابق ڈھالتی ہے۔

سائنس نے مجھے یہ مذہب عطا کیا ہے' کیونکہ نظریہ ارتقاء میرے خدا کے حق میں ثبوت پیش کرتا ہے۔ مشین کا ارتقاء ممکن ہے۔ ارتقاء کو ڈارون کی نظر سے نہ دیکھئے اس پر لیمارک' شوپنہار اور نیطشے کی نظر ڈالئے۔ ماحول ذی حیات کی تشکیل نہیں کرتا بلکہ ذی حیات ماحول کو تبدیل کرتے ہیں۔ اور ذی حیات کی اصلیت کیا ہے؟ نہ مٹنے والی آرزو!

Scanned with CamScanner

ایک حقیر حیوان کے ارتقا کی منزلیں طے کرتے کرتے آئن سٹائین، ایڈ یسن اور اناطول فرانس بننے کے ارتقا کو ہم صرف کرشمہ یزدانی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم کس قدر عجیب حیوان ہیں! ہم ایک ندی میں بلبلوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ہم دنیا کے اقتصادی میدانوں میں لڑتے ہیں اور قتل و غارت کرتے ہیں۔ ہم جھوٹ بولتے ہیں، چوری کرتے ہیں اور دوسروں پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی حسین صنم کدے اور کلیسا تعمیر کرتے ہیں۔ کبھی ہم موسیقی اور شاعری کے شاہکار تخلیق کرتے ہیں اور کبھی اپنے بچوں اور اپنی نسل کی خاطر جان دے دیتے ہیں لیکن یہ ہمارے صعود کی ابتدا ہے۔ یہ لمحہ ہمارے ارتقاء کے ابتدائے شباب کا لمحہ ہے۔ ہمارے گرد و پیش اور ہمارے دلوں میں نئی زندگی پھوٹ رہی ہے۔ میں جب کسی نئے پودے کو دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں، یہ خدا ہے۔ جب میں ماں کی آغوش میں کسی بچے کو دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں، یہ خدا ہے یہ اس کائنات کی تخلیقی قوت کا ایک نشان ہے۔

اینڈریو : مجھے آپ کے خدا کی جنس کے بارے میں شک ہے۔ خدا کو زندگی کے مترادف بنانا اسے شخصیت سے محروم کرنا ہے، آپ اسے خاص طور پر مامتا میں دیکھتے ہیں۔ شاید برنارڈشا کی تحریک سے متاثر ہو کر آپ اپنے خدا کو مادہ سمجھنے لگیں گے۔

پال : جنس دیر سے پیدا ہوئی اور یہ محض ایک سطحی چیز ہے۔ شخصیت بہت بعد میں آئی اور وہ بھی ایک سطحی چیز ہے۔ خدا ان سے ماورا ہے اور ان کے گرد موجود ہے خدا سے شخصیت کو منسوب کرنا خدا کو انسانی روپ میں ڈھالنے کے برابر ہے۔ شخصیت کا مطلب ہی علیحدگی ہے، لیکن خدا علیحدہ اور محض جزوی شخصیت نہیں ہو سکتا۔ خدا، ہمارے مختلف "اناؤں" کے پیچھے ایک تخلیقی قوت ہے۔ میں خدا کو "نر" ہی کہتا رہا ہوں گا اس کے لئے میں مذکر اسم اشارہ ہی استعمال کروں گا۔

برنارڈشا بھی ٹھیک کہتا ہے، نر تخلیق کا محض ایک حادثہ ہے۔ مادہ نسل کی زندگی کے تسلسل کی براہ راست ذمہ دار ہے۔ وہ جسمانی تخلیق کا مجسمہ ہے۔ جینئس ہی فقط اس کے برابر کا درجہ رکھتا ہے۔ جینئس روحانی تخلیق کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ نئی اقدار اور نئے علم کی تخلیق کرتا ہے۔ گوئٹے کا خیال غلط تھا کہ انسانیت خدا ہے۔ جو انسانیت کو جانتا ہے کبھی اسے قابل پرستش نہیں سمجھ سکتا۔ ہم محض خام مال ہیں، ایک عمارت کی اینٹیں، اس عمارت کے خاکے کو ہم ابھی نہیں دیکھ سکتے۔ صرف تخلیق کے چند لمحات الم میں ہم خدا کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ پارسا دہریہ، نیطشے، کہتا ہے کہ جب میں واگز کے ہمراہ چلتا تھا تو میں

Scanned with CamScanner

خدا کو محسوس کر سکتا تھا، خدا کو ایک خارجی حقیقت بنا دینے سے حریت عزم اور جینئس محض فریب نظر بن جاتے ہیں جینئس اسی صورت میں ممکن ہے کہ خدا ہمارے اندر موجود ہو۔ یعنی وہ مستقل زندگی جو ذرہ سے فیڈیاس کے فن اور مسیح کے الہام کی تخلیق کا باعث بنتی ہے۔ ہر مادی چیز میں زندگی کے احساس کو مذہبی احساس کہتے ہیں۔ وحشی انسان کی طرح ہم ہر درخت، ہر حیوان، ہر محبت اور ہر پیدائش، ذہن اور روح کی ہر عظمت، ہر انحطاط اور موت میں خدا کو دیکھ سکتے ہیں ہم کل، کے نقطہ نظر سے جز کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہم کل میں شرکت کر کے اس کے نشوونما کا ایک سبب بن سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو یہ خدا کی عبادت ہو گی۔

اینڈریو : پال ! یہ اچھی شاعری ہے، لیکن اس بیان میں صداقت کم ہے، آپ اپنے آپ کو فریب نہ دیجئے۔ ہر سائنس دان اس زندگی کو خدا سمجھنے پر ہنسے گا جو ایک گولی کے نشانے، حرارت کے نشیب و فراز، یا ہوا میں آکسیجن کی کمی سے ختم کی جا سکتی ہے۔ اور ہر پارسا روح اس مذہب کا مضحکہ اڑائے گی جو خدا کو آسمان میں نہیں بلکہ پھولوں اور کانٹوں، کتوں اور مکھیوں، فربہ ماؤں اور غلیظ بچوں اور تاریخ موسیقی کے عظیم عطائی ارچرڈ واگز میں موجود پاتا ہے۔

پال : واگز کو بھول جایئے اور مسیح کو یاد رکھئے۔ میرے مذہب میں دو عناصر ہیں زندہ خدا اور انسانی مسیح، کیونکہ مسیح خدا کا سب سے اہم پیکر تھا۔ زندگی کی سب سے عظیم تخلیق فکر نہیں ججت ہے اور انسانی جینئس کا سب سے بڑا کارنامہ، شیکسپئر کے ڈرامے یا پار تھینوں کے صنم کدے نہیں بلکہ مسیح کا اخلاق ہے۔ مامتا کے بعد نکوئی کی یہ بہترین قوت ہے۔ میں جانتا ہوں، فلپ، کہ آپ مسیح کے اخلاق کو ناقابل عمل سمجھتے ہیں، لیکن آپ ہی نے سپنیوزا کا یہ قول دہرایا تھا کہ تمام اچھے کام مشکل اور شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ کسی کام کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ مشکل ہے اس کے خلاف اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی نصب العین کا یہ فرض ہے کہ ہمیں ہماری جبلتوں سے بلند کر کے تہذیب اور تعاون باہمی کو ممکن بنائے۔ مسیح کا نظریہ کیا ہے؟ اعتدال۔ کیا اعتدال مشکل اور ناقابل عمل ہے؟ اس کے برعکس انسانی تعلقات کی حکمت اعتدال میں مضمر ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جہاں میں مدافعت کرتا ہوں، پیکار بڑھتی ہے، جہاں میں رحم و کرم کرتا ہوں مجھے اس کے بدلے ہزاروں نعمتیں میسر آتی ہیں۔ جہاں میں نے محبت سے کام لیا، میں نے فتح پائی۔ میرے نزدیک دہریہ وہ ہے جو زندگی اور نشوونما کا منکر ہے، اور مسیحی وہ ہے جو مسیح کے نظام اخلاق پر سچے دل

سے کاربند ہے۔

فلپ : خوب پال! میں آپ کے کلیسا کا پیرو بننے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ شخصی بقاء کے اصول پر اصرار نہ کریں۔

پال : یہ ضروری نہیں کہ چونکہ ہم بعض باتوں پر اختلاف رائے رکھتے ہیں' اس لئے کسی بات پر اتفاق نہ کریں۔ ہمارا اختلاف محض لفظی اختلاف ہے۔ پچھلی نسل ہم سے مختلف باتیں نہیں کہتی تھی۔ وہ محض مختلف الفاظ و علائم استعمال کرتی تھی۔ میرے کلیسا میں ہر وہ شخص شامل ہو سکتا ہے جو اعتدال کے اصول پر یقین رکھتا ہے اس کے سوا اور کوئی کسوٹی نہیں۔ میرا کلیسا ہر شخص کا خیر مقدم کرے گا' کسی کو نہیں ٹھکرائے گا۔ وہ حسن و حق کا احترام کرے گا۔ وہ ہر فن کی اشاعت کرے گا اور اپنے گرجوں کو تعلیم بالغان' کا مرکز بنائے گا۔ وہ اخوت کے بغیر علم کی مذمت کرے گا۔ وہ ہر شک کیا اجازت دے گا' بشرطیکہ اس کی انتہا محبت ہو۔

ایریئل : یہاں یہ بحث ختم کر دیں۔ اس کتب خانہ میں' جہاں سینکڑوں سرزمینوں کے عظیم اذہان کی حکمت موجود ہے' ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ہم سب بھائی ہیں' اور یہ کہ مذہب اور اخوت ایک حقیقت کے دو نام ہیں۔ کنفوشیئس اور بدھ' عیاہ اور مسیح' سپنیوزا اور وٹمن ایک ہی مذہب کے پیغمبر تھے اگر ہم ان لوگوں کے مشترکہ خیالات پر متفق ہو جائیں تو یہ بہت کافی ہے۔

Scanned with CamScanner

حصہ نہم

باب بستم و چہارم

زندگی اور موت

کیا ہم ایک باب میں انسانی زندگی کا کوئی واضح تصور پیش کر سکتے ہیں؟ یہ ناممکن ہے، کیونکہ زندگی ایک طلسم ہے، ایک ایسا دریا ہے جس کے سرچشمے سے ہم بے خبر ہیں، اور جو اپنے بہاؤ میں اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کے پیچ و خم اور نشیب و فراز کا بیان ناممکن ہے پھر بھی ربط کی آرزو ہمیں آگے لئے جاتی ہے۔ تجربے اور تاریخ کے اس صحرا کا نقشہ کھینچنا، ماضی کی ناہموار اور غیر مربوط روشنی کو مستقبل پر بکھیرنا، احساس اور آرزو کے انتشار میں اہمیت اور مقصدیت پیدا کرنا اور اس طرح اس دریا کے رخ کا اندازہ کر کے اس کے بہاؤ کو قابو میں لانا، یہ مابعد الطبیعاتی طلب ہماری نسل کا ایک حسین پہلو ہے۔ ہم اس باب میں یہ کوشش کریں گے کہ انسان کی زندگی کے آغاز سے لے کر اس کے انجام یعنی موت تک کا ایک مربوط خاکہ کھینچیں۔

ا۔ بچپن

والٹ وٹمن کہتا ہے: ”استدلال کے بعد چھوٹے بچے کا ایک گروہ داخل ہوتا ہے۔ ان کی طفلانہ حرکتیں اور باتیں میرے اعصاب زدہ بدن پر لہراتے ہوئے پانی کا سا سکون پیدا کرتی ہیں۔“

ہم بچوں کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ہماری شخصیتوں کے تسلسل کو قائم رکھتے ہیں۔ ہم انہیں پسند کرتے ہیں کیونکہ ان میں وہ اوصاف ہوتے ہیں جو ہمیں محبوب ہیں لیکن ہم ان اوصاف سے عاری ہیں۔ ان کی فطری سادگی اور ربط عمل، ایسے خصائل ہیں جنہیں فلسفی سعی و کاوش سے دوبارہ حاصل کرتا ہے، ہم ان کی غیر منافقانہ صاف گوئی کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ہمیں سخت ناپسند کرتے ہوئے بھی ہماری طرف دیکھ کر مسکراتے نہیں۔

Scanned with CamScanner

"بچے اور احمق سچ بولتے ہیں- اور وہ اپنے خلوص میں سکون و راحت حاصل کرتے ہیں-"

ذرا نوزائیدہ بچے کو دیکھو' غلیظ مگر حیرت انگیز' مضحکہ خیز مگر ان گنت ممکنات سے لبریز' اور اس طلسم ازلی یعنی نشوونما کی صلاحیتوں کا حامل- کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ آواز اور درد کا یہ مرکب کبھی محبت' تفکر' دعا' الم' تخلیق' مابعدالطبیعات اور موت کے رموز سے آشنا ہو گا- وہ چیختا ہے- وہ اتنے عرصے اپنی ماں کے پیٹ میں آرام سے پڑا سوتا رہا- اب اسے سانس لینے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور تنفس اسے دکھ دیتا ہے- وہ روشنی کو دیکھتا ہے اور وہ اسے دکھ پہنچاتی ہے- وہ اب شور و غوغا سننے پر مجبور ہے اور یہ چیز اسے دکھ دیتی ہے- اس کا جسم سردی محسوس کرتا ہے اور یہ چیز اسے تکلیف پہنچاتی ہے لیکن فطرت اسے دنیا کے ان ابتدائی حملوں سے محفوظ کرنے کے لئے اسے کم حساس بناتی ہے اسے روشنی کم نظر آتی ہے اور وہ آوازوں کو اس طرح سنتا ہے- جیسے وہ دور سے آ رہی ہوں- اس کا زیادہ وقت سوتے کٹتا ہے-

اس کی ماں اسے ننھا بندر کہتی ہے- چلنا سیکھنے سے پہلے وہ بندر کی طرح ہوتا ہے- اس کے بعد انسان بنتا ہے- غور کیجئے کہ وہ کس طرح آہستہ آہستہ چیزوں کو چھیڑ کر' ہاتھوں میں پکڑ کر اس دنیا سے علم اور واقفیت حاصل کرتا ہے- دنیا اس کے لئے ایک معما ہے- اس معمے کو حل کرنے کے لئے فطرت اسے ہوس علم سے لبریز رکھتی ہے- وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور چکھتا ہے-

یہ بچہ ہمارے فلسفہ کی ابتدا اور انتہا ہو سکتا ہے- اس کی طالب علم ہماری مابعدالطبیعات کا سرچشمہ ہے وہ بہتی ہوئی رواں دواں زندگی ہے جو تمام میکانکی تصورات کو باطل ٹھہراتی ہے- یہ عزم توسیع' یہ سعی پیہم یہ بے بسی سے طاقت' بچپن سے بلوغت اور حیرت سے حکمت تک کا صعود ہی اکثر فلسفیوں کی حقیقت مطلق ہے- زندگی نشوونما کی اس بیتابی کا نام ہے جو تحقیق اور طلب سے معمور ہو کر آخری دم تک جہالت اور تاریکی سے برسرپیکار رہتی ہے- کوئی میکانکی فلسفہ کسی شجر کی نشوونما یا بچوں کی آرزو اور لطافت احساس کی کماحقہ' توجیہہ نہیں کر سکتا-

۲- شباب

بچپن کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ کھیل کھیلنے کا عہد ہے' اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض بچوں میں بچپن نہیں ہوتا اور بعض جوان ہمیشہ بچے رہتے ہیں- شباب

Scanned with CamScanner

کھیل سے کام کی طرف اور کنبہ کا محتاج ہونے سے خود اعتمادی کی طرف انتقال کا نام ہے۔ یہ انتقال انسان کی زندگی میں خاصا انتشار پیدا کرتا ہے' کیونکہ دنیا میں ہر آرزو کی تسکین نہیں ہوتی۔ دنیا میں داخل ہوتے ہی جوان آزادی کے سرور سے سرشار ہو کر' دنیا کی تسخیر اور تشکیل کے لئے میدان میں اترتا ہے۔

ڈیمو سھینز نے کہا تھا کہ اچھی خطابت کے تین راز ہیں' عمل' عمل اور عمل۔ اس بات کا اطلاق شباب پر بھی ہوتا ہے۔ جوان آدمی میں خدا کی سی خود اعتمادی ہوتی ہے۔ وہ کھانے سے زیادہ معرکہ آرائی کو پسند کرتا ہے۔ وہ مبالغہ آمیز تصورات اور غیر محدود فضاؤں کا دلدادہ ہوتا ہے' اور اپنی بے پناہ توانائی کے اظہار کے لئے نت نئے وسیلے ڈھونڈتا ہے۔ خطرات اسے زندگی کی ہر چیز کے مقابلے میں زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔

جوان ضبط و نظم کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پیتا ہے۔ شور و غلغلہ اس کی زندگی ہے' لیکن اسے خاموش رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے' وہ عمل کا آرزو مند ہے اور اسے ساکن رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس کے خون کی روانی اس سے سرمستی و سرشاری کا تقاضا کرتی ہے اور لوگ اسے متانت اور اعتدال کا سبق دیتے ہیں۔ یہ سپردگی کا عہد ہے اور اس کا اصول ہے کہ "بے اعتدالی سے زیادہ کوئی چیز کامیاب نہیں ہو سکتی۔" جوان کبھی نہیں تھکتا' وہ حال میں رہتا ہے' ماضی پر افسوس نہیں کرتا اور مستقبل سے خوف نہیں کھاتا۔ یہ حواس اور آرزو کی پیہم تحریک کا عہد ہے۔ اس عمر میں ہر لحہ محبوب ہوتا ہے۔ دنیا کا ایک جمالیاتی منظر ہے' جس سے شدید لذت حاصل کی جا سکتی ہے' جس کے متعلق انسان شعر کہہ سکتا ہے اور اپنی قسمت پر ناز کر سکتا ہے۔ خوشی شباب کی طرح جبلتوں کے آزاد کھیل کا نام ہے۔ ہم میں سے اکثر و بیشتر لوگ محض اسی عہد میں زندہ رہتے ہیں اور چالیس برس کی عمر میں اس عہد کی ایک افسردہ یادگار رہ جاتے ہیں۔ زندگی کا المیہ یہ ہے کہ زندگی ہمیں حکمت اس وقت عطا کرتی ہے جب وہ ہم سے شباب چھین لیتی ہے۔

صحت عمل سے حاصل ہوتی ہے اور شباب کو آراستہ کرتی ہے۔ مصروفیت اطمینان قلب کا راز ہے۔ ہمیں خدا سے ملکیت کی توسیع کی دعا نہ مانگنی چاہئے بلکہ کام کرنے کی اہلیت کی طلب کرنی چاہئے۔ تھورو نے کہا ہے کہ جنت الارض میں ہر شخص اپنا مکان خود بنائے گا' دلوں میں ایک بار پھر نغمہ پیدا ہو گا' جس طرح اس طائر کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو اپنا گھونسلا خود بناتا ہے۔ اگر ہم اپنے گھر خود تعمیر نہیں کر سکتے تو کم سے کم ہم چل پھر سکتے ہیں' چیزیں پھینک سکتے ہیں' دوڑ سکتے ہیں۔ ہمیں کبھی اتنا بوڑھا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم

Scanned with CamScanner

یل کھیلنے کی بجائے کھیل دیکھنے لگیں، کھیل دعا کی طرح لازمی ہے۔

اس لئے جب جوان کھیل کو علم و فلسفہ پر ترجیح دیتا ہے تو وہ اچھا کرتا ہے۔ جب ایک چینی کرم کتابی نے امریکی یونیورسٹیوں کے متعلق یہ کہا "یہ ورزشی ادارے ہیں، جہاں کمزور جسم والوں کو پڑھنے کے بھی چند مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں۔" اس چینی طالب علم کا یہ قول ہماری یونیورسٹیوں کے خلاف نہیں جاتا۔ ہر مفکر کو کھلاڑی ہونا چاہئے۔

ہمارے جوان پڑھنے بھی لگے ہیں۔ پڑھنے لکھنے سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اگر انسان اسے زندگی میں استعمال نہ کر سکے۔ زندگی تعلیم دیتی ہے، اور زندگی میں محبت سب سے زیادہ جامع اور مکمل ذریعہ تعلیم ہے۔

عنفوان شباب کے عہد میں لڑکا اور لڑکی دونوں کے لاابالی طرز عمل پر تفکر کا بادل چھا جاتا ہے۔ وہ دونوں اپنے جسموں کی آرائش و ترصیع پر اپنا وقت اور اپنی دولت صرف کرتے ہیں۔ لڑکی شرمانا سیکھتی ہے اور لڑکا اپنی ہر حرکت اور ہر عمل میں ایک حجاب آمیز تذبذب محسوس کرتا ہے۔

جنس کے بڑھتے ہوئے شعور کے ساتھ ذہن بھی ترقی کرتا ہے۔ جبلت کی جگہ فکر اور عمل کی جگہ پریشانی لے لیتی ہے۔ جوان ہر چیز کا معائنہ کرتا ہے اور اس دنیا کے ماخذ اور مقاصد پر غور کرتا ہے۔ جنسی آرزو جمالیاتی احساس پر تازیانہ کا کام کرتی ہے۔ اور نغمہ، فن اور رقص ظہور میں آتے ہیں۔

دنیا کو دریافت کر کے جوان "شر" کے وجود سے آگاہ ہوتا ہے۔ اس کا خاندان تعاون باہمی اور محبت کی اساس پر استوار تھا، مگر اس دنیا میں لاٹھی بھینس کو ہانکتی ہے۔ وہ پریشان ہو کر بغاوت کرتا ہے، چیختا ہے چلاتا ہے کہ آؤ اس دنیا کو ایک خاندان کے رشتوں میں منسلک کر دیں، لیکن تھوڑی مدت کے بعد تقابل کا نشہ اس کے خون میں رچ جاتا ہے اور وہ بھی زر و دولت کی ہوس میں ہاتھ پھیلانے لگتا ہے۔ بغاوت ختم ہو جاتی ہے اور تقابل کا کھیل جاری رہتا ہے۔

آخر میں جوان محبت دریافت کرتا ہے۔ یہ محبت بچپن میں بھی معصومیت اور شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے، لیکن اب اس محبت میں جسم اور روح دونوں کی طلب گہری ہو جاتی ہے۔ لڑکی میں جب زندگی موجزن ہوتی ہے تو وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ لڑکا سراپا اضطراب و بیتابی ہے لیکن صبر و تحمل کے ساتھ لڑکی کا دل موہتا ہے۔ زندگی کا یہ حسن دنیا کی تمام خرابیوں پر حاوی ہے یہی انسان کی تہذیب کی معراج ہے۔

Scanned with CamScanner

اگر جوان عقلمند ہے تو وہ محبت کو سب سے زیادہ اہمیت دے گا۔ لڑکی کا دل موہنے میں صبر اور احتیاط سے کام لے گا اور شادی' مذہبی رسوم کی دل آویز جھنکار کے ساتھ رچائے گا۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو محبت کے تابع کرے گا۔ حکمت اگر جوان ہو تو وہ محبت کو سپردگی سے پروان چڑھائے گی' ایثار سے اس میں شدت پیدا کرے گی' تولید سے اسے مستحکم کرے گی اور دو عالم کے ہنگاموں کو اس کا فرمانبردار بنائے گی۔ محبت کا مقام اور درجہ سب سے پہلا ہے۔ چاہے وہ المناک نتائج سے ہمیں تباہ کر دے۔ یا فراق کی آگ میں بھسم کر دے!

۳۔ کہولت

جوان شادی کر لیتا ہے اور شباب ختم ہو جاتا ہے۔

مرد اور عورت شادی کے دوسرے ہی دن اپنی عمر میں پانچ سال کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ حیاتیاتی نقطہ نظر سے کہولت شادی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ بے پروائی ختم ہو جاتی ہے اور کام اور ذمہ داری کا دور شروع ہوتا ہے۔ کہولت مختلف ممالک میں مختلف عمروں میں آتی ہے۔ سٹینلے ہال کہتا ہے :۔ "وہ نوجوان اہل مشرق جو تیرہ برس کی عمر میں شادی کرتے ہیں اکثر تیس برس کی عمر میں بڈھے ہو جاتے ہیں اور پھر کشتے اور طاقت کی دوائیں کھاتے ہیں ...... گرم ممالک کی عورتیں تیس سال کی عمر میں معمر ہو جاتی ہیں۔ یہ اصول عمومی طور پر صحیح ہے کہ جو لوگ دیر سے بلوغت حاصل کرتے ہیں وہ دیر سے بڈھے ہوتے ہیں۔" اگر ہم جنسی بلوغت کو اقتصادی خود اختیاری کے زمانے تک ملتوی رکھیں تو ہم عنفوان شباب اور عہد تعلیم کو طوالت دے کر ماضی سے کہیں بہتر تہذیب پیدا کر سکتے ہیں۔

زندگی کے ہر دور کے اپنے محاسن و مصائب' فرائض و دلذائذ ہوتے ہیں۔ جس طرح ارسطو نے اعتدال کو کمال اور حکمت کا راز ٹھہرایا تھا' اسی طرح ہم شباب' بلوغت اور پیرانہ سالی کے مخصوص خصائل کی فہرست بنا سکتے ہیں۔ مثلاً

شباب	کہولت	پیری
جبلت	قیاس	استخراج
جدت	عادت	رسم
ایجاد	عمل	رکاوٹ
کھیل	کام	آرام
فن	سائنس	مذہب

Scanned with CamScanner

تخیل	ذہن	حافظہ
مفروضہ	علم	حکمت
رجائیت	امید آفرینی	یاسیت
انقلاب پسندی	حریت پرستی	رجعت پسندی
مستقبل سے شغف	حال سے شغف	ماضی سے شغف
جرأت	شعور	احتیاط
آزادی	تنظیم	جبر

یہ فہرست لامتناہی طور پر طویل ہو سکتی ہے۔ اس سے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے لئے تشفی کا یہ پہلو نکلتا ہے، کہ یہ عمر کارہائے نمایاں کہ گزرنے کی عمر ہے۔ پینتیس سال کی عمر میں ایک مرد اپنے کمال پر ہوتا ہے۔ وہ وسیع تجربہ اور شعور سے اپنی جذباتی تندی کو تخلیقی کاموں کے لئے وقف کر سکتا ہے۔ غالباً ذہنی کمال جنسی پختگی کے ساتھ آتا ہے جو عموماً بتیس سال کی عمر میں حاصل ہوتی ہے۔ ایلس کہتا ہے کہ برطانیہ کی اکثر عظیم شخصیتیں اس وقت پیدا ہوئیں جب ان کے والدین کی عمریں بتیس اور چونتیس سال کے درمیان تھیں۔

جب ہم اقتصادی دنیا میں اپنے لئے کوئی جگہ بنا لیتے ہیں تو جوانی کے باغیانہ جذبات دب جاتے ہیں۔ جب ہمارے پاؤں زمین پر جمے ہوں تو ہم زلزلوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ ہم اپنی انقلاب پسندی کو ایک نرم رو آزاد خیالی میں ڈھال لیتے ہیں۔ انقلاب پسندی دولت کے حصول سے دھیمی پڑ جاتی ہے۔ جوں ہی ہم ماحول کو اپنے لئے سازگار بنالیں ہم کسی بنیادی تبدیلی سے خوف زدہ رہنے لگتے ہیں، چالیس برس کی عمر کے بعد ہم یہ چاہتے ہیں کہ دنیا ساکن ہو جائے اور زندگی کا بہاؤ رک جائے۔

کہولت میں قدامت پسندی کی ایک اور وجہ ذہانت ہے۔ ہم اس عمر میں اداروں کی پیچیدگی اور آرزو کی خامیوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ تھکا ماندہ انسان اخلاقی نقطہ نظر سے بے داغ حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہم پہلے تو گھٹتی ہوئی قوت کو محسوس نہیں کرتے پھر مایوس ہو کر اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ ہم پہلے موت کا خیال ہی نہیں کرتے تھے اور کرتے بھی تھے تو محض علمی نقطہ نظر سے، لیکن اب موت قریب اور اٹل نظر آتی ہے۔ ہم کام، مسلسل کام اور جوانوں کی صحبت میں کچھ وقت کے لئے اس المناک حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔

کہولت کام اور تولید میں تسکین حاصل کرتی ہے۔ جوانی کی آرزوئیں جب زندگی کے مرکزی ایام کے تحمل اور احتیاط کے زیر اثر آتی ہیں تو وہ کئے ہوئے کاموں کی طرف متوجہ

Scanned with CamScanner

ہوتی ہیں اور تسخیر عالم کے خوابوں سے گریز کرتی ہیں۔

شباب کا کام یہ ہے کہ وہ مزید تسخیر کائنات کے لئے نئے نئے خیالات پیدا کرے۔ پیری کا یہ کام ہے کہ وہ اس خیال کی قوت کو آزمانے کے لئے اس کی مخالفت کرے، اور کہولت کا یہ وظیفہ ہے کہ اس خیال کو قابل عمل بنانے کے لئے اس میں قطع برید کرے۔ جوانی تجویز کرتی ہے۔ بڑھاپا مخالفت کرتا ہے اور کہولت ان دونوں کے بین بین فیصلہ کرتی ہے۔ شباب دور انقلاب پر حاوی ہوتا ہے، پیری رسم و رواج کے در میں اور کہولت تعمیری دور پر مسلط ہوتی ہے۔ نطشے نے کہا تھا کہ انسان جنگل کی آگ کی مانند ہیں۔ جب وہ بھسم ہو جاتے ہیں تو مفید بن جاتے ہیں لیکن جب وہ بھڑکتے اور دھواں دھار حرکتیں کرتے ہیں تو دلچسپ تو ہوتے ہیں لیکن تکلیف دہ اور بے سود ثابت ہوتے ہیں۔

شباب رومانی ہوتا ہے۔ اس پر تخیل اور جذبات حاوی ہوتے ہیں۔ پیری، کلاسیکی ذوق رکھتی ہے اور ضبط و نظم کو پسند کرتی ہے۔ کہولت ان دونوں کے درمیان رہ کر رومانی اور کلاسیکی اقدار کو ملا کر انہیں مرئی وجود عطا کرتی ہے۔ ڈے کارٹ کہتا ہے، علم کا اصول واضح فکر ہے۔ جو چیز وضاحت سے سمجھی جائے وہی حقیقت ہے، کردار کا بنیادی اصول ہے۔ وضاحت سے آرزو کرنا۔ اسی طرح آرزوئیں شخصیت اور عزم کے قالب میں ڈھلتی ہیں۔ کہولت ہمیں مربوط آرزو عطا کرتی ہے۔

کہولت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیں اعتدال بخشتی ہے۔ اس میں خطرہ یہ ہے کہ ہم اوسط، انسان نہ بن جائیں۔ سعی و کاوش سے پہلو بچا کر تواتر اور یکسانیت کی زندگی بسر کرنا کس قدر آسان ہے! یہ خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے اور ہم میں سے اکثر اس کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ تیلولہ اس کی ابتدا اور علامت ہے، لیکن ضروری نہیں کہ اعتدال سے اوسط درجہ کا انسان پیدا ہو۔ اعتدال ذہن کی طاقت اور عمق کی علامت بھی ہو سکتا ہے۔ نیطشے جیسا غیر معتدل انسان بھی لکھتا ہے کہ "توازن اور اعتدال اعلیٰ صفات ہیں جن کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہئے، فقط چند لوگ ہی ان کی طاقت اور اہمیت سے واقف ہیں۔"

ان مفکروں سے قطع نظر اکثر لوگ کہولت کی ایک اور ہی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ایک عام ادھیڑ عمر کا آدمی صبح کو ناشتہ پر اخبار پڑھ کر بیوی اور بچوں کو جلدی سے پیار کر کے دفتر چلا جاتا ہے۔ دفتر میں کیا کرایا کام اسے مل جاتا ہے۔ اور وہ گھر پہنچنے کے انتظار میں وقت گزار دیتا ہے۔ شام کو وہ گھر پہنچ جاتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ اسے واپس لوٹنے کی جلدی

Scanned with CamScanner

کیوں تھی؟

بیوی سے اس کی محبت سرد پڑ جاتی ہے- وہ بازار کی حسین و جمیل عورتوں سے متاثر ہوتا ہے- وہ دو ایک مرتبہ بیوی سے بے وفائی کے گناہ کا بھی مرتکب ہوتا ہے' لیکن گناہ کی بے کیفی سے بیزار ہو کر پھر گھر کا رخ کرتا ہے اور بیوی سے محبت کرنے کی کوشش کرتا ہے- باقی وقت وہ گھر کے باغیچہ کی قطع و برید اور آرائش و ترصیع میں مصروف رہتا ہے- تاش اور گولف کھیلتا ہے- اور شہر کی سیاسیات میں سرسری دلچسپی لیتا ہے- یہ دیکھ کر کہ سیاسیات میں کوئی دیانتدار شخص دلچسپی نہیں لے سکتا' وہ خاموشی سے گھر آ بیٹھتا ہے اور سکارنیاڈو کے ان الفاظ کی صحت محسوس کرتا ہے :- "میں نے دنیا کے سفر میں ہر حسین اور نادر شے دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سوائے اپنے گھر کے اب کوئی اور جگہ نہیں دیکھوں گا' میں نے شادی کر لی اور جلدی ہی میں نے محسوس کیا کہ میری بیوی مجھ سے بے وفائی کرتی ہے- اس شک کے باوجود میں نے یہ دیکھا کہ زندگی کی تمام کیفیات میں یہی بہترین کیفیت ہے-"

اس عرصے میں اس کی بیوی نے بھی زندگی سے کچھ سیکھ لیا تھا- اس نے دیکھا کہ رومان کی گرمی ختم ہو چکی ہے اور وہ محض گھر کا کام کاج کرنے والی بیوی بن گئی ہے- وہ سوچتی ہے کہ وہ اس شخص کے لئے اپنے آپ کو حسین و جمیل کیوں بنائے جو اسے محض ایک مفید خادمہ سمجھتا ہے- بالاخر وہ گھر کے کام کاج کو ترک کر کے اجتماعی بہبود' کے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہے-

اور پھر وہ ماں بن جاتی ہے- وہ اس حادثہ سے خوش بھی ہے اور خوفزدہ بھی- وہ محسوس کرتی ہے کہ اب وہ عورت بن گئی ہے- محض نمائش کا سامان نہیں رہی- وہ دعا کرتی ہے کہ لڑکا پیدا ہو' لیکن جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو کچھ عرصہ رونے کے بعد وہ اپنی بیٹی کا حسن دیکھ کر ششدر رہ جاتی ہے- وہ اس کے لئے دن رات محنت کرتی ہے اور "خوشی" کی تلاش نہیں کرتی اور اپنے اندر ایک خاص قسم کا سکون اور روشنی محسوس کرتی ہے- وہ اپنے شوہر کو بھی مطمئن دیکھتی ہے اس طرح فطرت ہماری بڑی قربانیوں کے عوض ہمیں بہترین خوشیاں عطا کرتی ہے-

۴- موت

میرے ایک سنگدل دوست نے کہا ہے : "لوگوں کو اپنے عروج پر پہنچ کر مر جانا چاہئے

لیکن وہ مرتے نہیں اس لئے بازار میں چلتے پھرتے اکثر شباب اور موت کی مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے۔

بڑھاپا کیا ہے؟ بنیادی طور پر یہ جسم کی ایک کیفیت ہے۔ جسم کی موج حیات اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔ بڑھاپا جسمانی اور ذہنی انحطاط کا دور ہے یہ رگوں' فکری پیمانوں خون اور تدبر کے سکڑنے کی حالت ہے۔ ایک انسان اتنا ہی زندہ ہے جتنی کہ اس کی رگیں اور اتنا ہی جوان ہے جتنے اس کے خیالات۔

بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ سیکھنے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے' دماغ اپنے لئے ایسے ڈھرے بنا لیتا ہے' جو نئے اور نادر واقعات کو قبول نہیں کرتے اور حافظہ ناتواں ہو جاتا ہے۔ جس طرح بچہ بہت جلدی پھلتا پھولتا ہے اسی طرح بوڑھا ہر روز زیادہ مرجھاتا رہتا ہے' اور جس طرح بچے میں حس کم ہوتی ہے اسی طرح بوڑھا بھی کم حساس ہو جاتا ہے' حتیٰ کہ اس میں آگہی اور شعور بالکل ختم ہو جاتے ہیں تاکہ موت اپنا عمل اچھی طرح کر سکے۔ جوں جوں حواس مدھم پڑتے ہیں توانائی بھی گھٹتی رہتی ہے۔ موت کے خوف کے ساتھ آرام اور سکون کی خواہش مل جاتی ہے اور اگر انسان نے یہ زندگی بھرپور طریقے سے گزاری ہو تو پھر وہ اطمینان سے جان دے دیتا ہے کہ شاید اس زندگی کے ہنگامہ میں مجھ سے بہتر لوگ میری جگہ لے لیں۔

لیکن اگر یہ ہنگامہ کبھی بہتر نہ ہوا' اگر یہ زندگی اندوہ اور مرگ کے محور کے گرد گھومتی رہی' اگر نئے سوار پیدا ہوتے رہے' نئی نئی راہوں کی تعمیر کے بعد پھر ایک ہی المناک انجام کا شکار ہوتے رہے' اگر میرے بعد بھی دنیا میں زناکاری' قتل و غارت' اندیشے' فریب اور وبائیں بھی بدستور جاری رہیں تو موت میں کوئی تسکین کا پہلو نہیں رہتا۔ اگر میرے بعد بھی لوگوں نے وہی غلطیاں کیں' انہی سرابوں سے لوگ متاثر ہوئے اور اسی طرح دکھ جھیل کر مر گئے تو موت فنائے مطلق ہے اور اس لئے مہیب اور خطرناک خلا۔

یہ ہے بڑھاپے کا المیہ کہ وہ ماضی کو رومانی نظروں سے دیکھ کر کبھی کبھی اس میں اندوہ و الم کے علاوہ اور کچھ نہیں پاتا۔ زندگی جب ساتھ چھوڑ رہی ہو تو اس کی مدح و ستائش کیونکر ہو سکتی ہے۔ مدح و ستائش اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمیں یہ امید ہو کہ ہم اس موت کے حادثہ کے بعد بھی کسی بہتر حالت میں زندہ رہیں گے۔

یہ عظیم الشان کلیسا جو دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہیں' مایوسی کو نظر انداز کر کے دلوں کو امید کی دعوت دیتے ہیں۔ کیا موت کا مطلب فنا ہے؟ ہمیں معلوم نہیں لیکن جب تک

Scanned with CamScanner

لوگ غمزدہ ہیں، یہ کلیسا قائم رہیں گے۔

لیکن کیا ہم زندگی کی خاطر ہی نہیں مرتے؟ ہم محض علیحدہ فرد نہیں، ہم زندگی کے سمندر کی موجیں ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو زندگی کی رو سے الگ سمجھتے ہیں تو موت ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ ہم اس لئے مرتے ہیں کہ زندگی جوان اور توانا رہے۔ اگر ہم ہمیشہ زندہ رہتے تو نشوونما ختم ہو جاتی اور نوجوانوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہ رہتی۔ جذبہ محبت کی بدولت ہم اپنی زندگی دوسرے جسموں کو عطا کرتے ہیں۔ موت سے پہلے زندگی اپنے آپ کو تازگی اور بقا بخشتی رہتی ہے۔

بڑھاپے میں یہ حکمت پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم ہر چیز کا دوسری چیز سے تعلق دیکھیں اور کل کے نقطہ نظر سے اجزا کا مشاہدہ کریں۔ یہ شعور موت کو قابل برداشت بناتا ہے۔ اچھا فلسفہ وہی ہے جو زندگی کی اہمیت واضح کر کے موت کو شکست دیتا ہے۔ حکمت یہی بتاتی ہے کہ موت جزو کو آتی ہے لیکن زندگی قائم و دائم ہے۔

تین ہزار سال گزرے ایک شخص نے سوچا کہ انسان شاید فضاؤں میں پرواز کر سکے۔ اس نے اپنے لئے پر و بال بنائے۔ اس کے بیٹے' آئیکیرئیس نے ان پر وبال کی مدد سے اڑنا چاہا تو سمندر میں گر پڑا، لیکن زندگی نے اس خواب کو قائم رکھا۔ لیونارڈو نے پرواز کی ایک کل ایجاد کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا، لیکن کئی نسلوں کے بعد انسان فضاؤں میں پرواز کرنے کے قابل ہو گیا۔ زندگی تین ہزار برس تک ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کی سعی پیہم کا نام ہے۔ وہ کبھی ہتھیار نہیں ڈالتی۔ فرد ناکام ہو سکتا ہے لیکن زندگی کی جیت ہوتی ہے۔ فرد مر جاتا ہے لیکن زندگی طلب اور تجسّس، حیرت اور آرزو میں منہمک رہتی ہے۔ ایک بڈھا آدمی بستر مرگ پر پڑا ہے۔ بے بس دوست اور غمزدہ اقارب، اس کے پاس ہیں۔ کتنا خوفناک منظر ہے یہ! یہ گلے سڑے گوشت کا ناتواں جسم، پچکے ہوئے گالوں میں یہ بے وندان دہن، یہ قوت گویائی سے محروم زبان، یہ بصارت سے محروم آنکھیں! جوانی اپنی امیدوں اور آزمائشوں کے بعد، کہولت اپنی محنت شاقہ اور غم و درد کے بعد اس مقام پر پہنچی ہے۔ صحت طاقت اور خوش آئند تقابل کا یہ انجام ہونا تھا۔ یہ بازو جو کبھی مردانہ کھیلوں میں پرزور ضربیں لگایا کرتے تھے، اب ناکارہ ہیں! یہ ہے علم، سائنس اور حکمت کی انتہا۔ ستر برس تک اس انسان نے جاں فشانی اور عرق ریزی سے علم و فضل حاصل کیا۔ اس کا ذہن ہزاروں تجربات اور ہزاروں افکار و اعمال کی آماجگاہ تھا۔ حزن و غم کی بدولت اس کے دل نے رحم و کرم اور اس کے ذہن نے شعور سیکھا۔ ستر برس میں وہ حیوان سے انسان بنا۔

Scanned with CamScanner

اور حق کی جستجو اور حسن کی تخلیق کرتا رہا' لیکن اب موت آئی ہے۔ موت نے اس کے خون کو سرد' دل کو بند' دماغ کو پاش پاش اور حلق کو جامد کر دیا ہے۔ بالاخر جیت موت ہی کی ہوتی ہے۔

باہر کھلی ہوا میں طیور چہک رہے ہیں' اور مغنی آفتاب کی بارگاہ میں گیت گا رہا ہے۔ روشنی میدانوں پر پھیل رہی ہے' غنچے پھوٹ رہے ہیں پودے آسمان کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اشجار میں قوت نمو کارفرما ہے۔ یہ بچے ہیں۔ ذرا دیکھئے یہ کتنے خوش ہیں۔ شبنم آلود گھاس پر دوڑ رہے ہیں' ہنستے ہیں' شور مچاتے ہیں اور ان تھک کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ بھی علم حاصل کریں گے' تجسس سے بہرہ اندوز ہوں گے' محبت کریں گے' تخلیق کریں گے۔ اور غالباً مرنے سے پہلے زندگی کو کچھ اور زیادہ بہتر بنا دیں گے۔ مرنے سے پہلے وہ اور بچے پیدا کر کے موت کو فریب دیں گے اور اچھے والدین کی طرح ان بچوں کو اپنے آپ سے زیادہ بہتر انسان بنائیں گے۔ شام کو باغ میں عاشق و محبوب اکٹھے بیٹھے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ ان کی خاموش بات چیت میں ان کیڑوں کی آوازیں گھل مل رہی ہیں جو اپنے محبوبوں کو بلا رہے ہیں۔ یہ قدیم طلب' آرزومند مگر پر حجاب آنکھوں کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے اور ایک پاکیزہ جنون ہاتھوں اور ہونٹوں میں موجزن ہوتا ہے۔ بالاخر جیت زندگی ہی کی ہوتی ہے۔